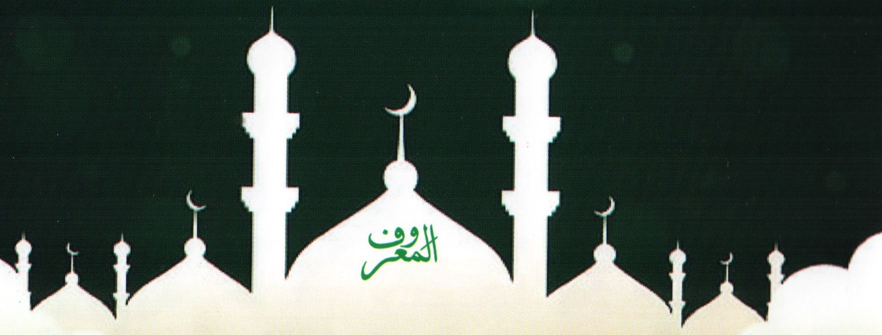
مطبوعہ وغیر مطبوعہ رسالہ جات کا مجموعہ

فَتَاوٰی عَینُ الفُقہ



المعروف

فتاویٰ شوق

حضرت علامہ

مولانا مُفتی مُحمد حسین شوق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَتاویٰ عَینُ الفِقہ المعروف فتاویٰ شوق

(مطبوعہ وغیر مطبوعہ رسالہ جات کا مجموعہ)

ISBN : 978 969 7730 38 3

مَنۡ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیۡرًا یُفَقِّھۡہُ فِی الدِّیۡنِ (بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے

فَتاوٰی عَینُ الفِقہ المعروف فتاوٰی شوؔق

(مطبوعہ وغیر مطبوعہ رسالہ جات کا مجموعہ)

تالیفِ لطیف:

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد حسین شوؔق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (پپلاں ضلع میانوالی)

نظرثانی:

پروفیسر (ر) علامہ ریاض محمود

(مہتمم دارالعلوم محمودیہ رضویہ، پپلاں)

اشاعت باہتمام:

شعبہ نشرواشاعت

دارالعلوم محمودیہ رضویہ جیلانیہ

فتح پور، تحصیل کروڑ (ضلع لیہ) پنجاب۔ پاکستان

ناشر: اردوسخن ڈاٹ کام، پاکستان

نمود اول: دسمبر 2023ء

عنوان: فَتَاویٰ عَینُ الفِقَّہ المعروف فتاوٰی شوؔق

مصنف: علامہ مولانا مفتی محمد حسین شوؔق

نظر ثانی: پروفیسر (ر) علامہ ریاض محمود

اہتمام: ڈاکٹر ممتاز محمود ملک

کمپوزنگ: حافظ محمد عاطف نواز (0304-9318429)

سرورق: شہر یار ناصر

ناشر: شعبہ نشر واشاعت، دارالعلوم محمودیہ رضویہ جیلانیہ
فتح پور، تحصیل کروڑ (ضلع لیہ) پنجاب۔ پاکستان

طباعت: شیرِ ربانی پرنٹرز، ملتان

قیمت: 1000 روپے

فہرست

مضامین:

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

فَتَاویٰ عَین الفِقه

---رسائل---

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حامداً و مصلیاً اما بعد فقیر نا چیز محمد حسین شوقؔ نے یہ چند الفاظ ضبطِ تحریر میں لائے ہیں جو وقتاً فوقتاً اس ہیچ مدان سے دریافت کیے گئے ہیں تا کہ ناظرین کے لیے وقتِ ضرورت امداد کا ذریعہ بن سکیں اور دوبارہ کتبِ فقہ کی ورق گردانی سے نجات حاصل ہو جاوے۔ اللہ جل شانہ اس فقیر کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ناظرین کے لیے نفع کا باعث ہو۔

آمین اللهم کَثِّرْ فائدته و عَظِّم عائدته، و ان تریٰ فیه خطاءً فاسحب علیه ذیل العفو واذکرنی بالدعاء وصححه عفی اللّٰه عنک و عنا بحرمة النون و الصاد و آله الامجاد۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

حرَّرہ محمد حسین شوقؔ کان اللہ لہٗ

۱۵ ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ بمطابق ۱۳ نومبر ۱۹۴۳ء بوقت عصر

حضرت علامہ مفتی محمد حسین شوق رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم حضرت علامہ محمد حسین شوق رحمۃ اللہ علیہ 1910ء کو فرید العصر حضرت علامہ غلام محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ پپلا نوی کے گھر میں پیدا ہوئے۔حضرت علامہ غلام محمود صاحب کا تعارف یہ ہے کہ علمائے عصر نے اُن کو سیبو یہ زمان اور امام لنحاۃ کا لقب عطا فرمایا۔اُن کی علمی قابلیت کے لیے یہی حوالہ کافی ہے کہ ان کے ہزاروں شاگروں میں سے سرفہرست قبلہ ضیائے اُمت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہزاروں شاگرد اندرونِ پاکستان اور پاکستان سے باہر ملکوں میں خدمت دین انجام دے رہے ہیں جن کا دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف اب ایک یونیورسٹی بن گیا ہے اور اس دارالعلوم کی سیکڑوں شاخیں پاکستان اور پاکستان سے باہر موجود ہیں دوسرے شاگرد رشید حضرت علامہ رئیس المدرسین مولانا عطا محمد بندیالوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہزاروں شاگرد خدمت دین متین میں شب و روز مصروف ہیں یہ فیضان علمی حضرت علامہ غلام محمود رحمۃ اللہ علیہ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔حضرت علامہ مفتی محمد حسین شوق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی کے زیر سایہ درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔پھر ان کے قائم کردہ ادارہ دارالعلوم محمودیہ رضویہ میں مسند تدریس پر پچاس سال تک جلوہ افروز رہے۔آپ کی ذات گرامی سے بھی ہزاروں شاگردوں اور تشنگان علم نے اکتساب علم کیا۔اس چشمہ علم و عرفان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔چند شاگردوں کے اسماء گرامی یہ ہیں

1۔مفتی غلام یٰسین قریشی صاحب۔

آستانہ عالیہ ڈِنگ شریف (خانقاہ سراجیہ)

2۔شیخ الحدیث مولانا محمد شریف رضوی رحمۃ اللہ علیہ۔بھکر

3۔شیخ الحدیث مولانا محمد اشرف سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

4۔شیخ القران مولانا محمد منظور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔جنڈانوالہ

5۔شیخ الحدیث مولانا مشتاق احمد صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔

سابق خطیب گولڑہ شریف۔

6۔صاحبزادہ محمد عارف الحسن صاحب۔

(نورانی دارالعلوم ڈیرہ اسماعیل خان)

7۔پیر طریقت حضرت علامہ حافظ محمد مظہر قیوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ پپلاں

8۔پیر طریقت علامہ جمال الدین کاظمی۔

(آستانہ عالیہ خواجہ آباد شریف)

9۔صاحبزادہ پیر محمد لطیف صاحب۔(آستانہ عالیہ بھور شریف)

10۔حضرت علامہ مفتی محمد اکبر صاحب۔(پیر محل)

11۔حضرت مولانا غلام حسین سرمد۔(چوک اعظم،لیہ)

12۔حضرت مولانا محمد اشرف صاحب۔(منڈی جہانیاں)

13۔استاذ العلماء فقیہ العصر مولانا مفتی محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(ڈیرہ اسماعیل خان)

14۔شیخ الحدیث مفتی محمد کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بہل۔بھکر)

15۔حضرت علامہ مفتی میاں محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ شمس صدیقیہ۔(میانوالی)

16۔مولانا محمد اکبر صاحب رضوی رحمۃ اللہ علیہ

(سابق مدرس دارالعلوم محمودیہ رضویہ پپلاں)

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد حسین شوق صاحب اعلیٰ پایہ کے مفتی تھے۔اپنے ضلع میانوالی کے مشہور مفتی تھے آپ کا فتوی مضبوط دلائل سے مزین ہوتا کہ عدالت عالیہ بھی قبول کر لیتی۔دور ونزدیک سے لوگ بذریعہ خط فقہی مسائل پوچھتے۔اپنے تنازعات میں آپ کو بحیثیت ثالث قبول کر لیتے بذریعہ ڈاک جو استفتاء آتے اس کا جواب قبلہ مفتی صاحب رقم فرماتے۔تو استفتاء اور فتوی دونوں کو آپ محفوظ کر لیتے جس کا نام انہوں نے،،**فتاویٰ عین الفقہ**،، رکھا ہوا تھا جو کہ بعد میں علماء کرام کی مشاورت سے"،،**فتاویٰ شوق**"،، رکھا گیا میں شکر گزار ہوں۔حضرت علامہ مفتی محمد اسلم رضوی صاحب مدرس جامعہ زین المدارس مکھڈ شریف،اٹک اور حضرت مولانا حافظ محمد الیاس صاحب چشتی مدرس دارالعلوم محمودیہ رضویہ پپلاں کا ان دونوں عزیزوں نے اپنا قیمتی وقت عنایت کیا بہت محنت سے فتاوی جات کی عربی عبارات کا ترجمہ آسان اردو زبان میں کیا۔اور عربی حوالہ جات کی تخریج کی۔اب فتاوی شوق کو اصحاب علم اور عام قاری کے لیے مفید بنادیا۔

بندہ دُعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام علماء کرام کے علم،عمل،عمر اور رزق میں برکتیں عطا فرمائے،یہ علمی کام ان کے لیے صدقہ جاریہ اور سرمایہ آخرت ہے۔

بندہ مفتی اعظم حضرت علامہ مولانا محمد حسین شوؔق کے بھتیجے ڈاکٹر ملک ممتاز محمود صاحب ساکن فتح پور تحصیل کروڑ ضلع لیہ کے لیے دُعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ صحت وسلامتی کے ساتھ ان کی زندگی دراز فرمائے جنہوں نے فتاویٰ شوق کی طباعت کی ذمہ داری قبول کی فتح پور میں دارالعلوم محمودیہ رضویہ گیلانیہ کے مہتمم اور منتظم ہیں۔انہوں نے دارالعلم محمودیہ رضویہ

کی صد سالہ تاریخ کو بہت اچھے اور نفیس انداز میں چھپوایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو دُنیا آخرت میں جزاءعطا فرمائے

آمین

راقم الحروف:

ریاض محمود غفرلہ

29 ربیع الاول 1445ھ

مطابق 16 اکتوبر 2023ء

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہِ الکریم۔ اما بعد فاعوذُ باللہ من الشیطٰنِ الرجیم ○بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ قال النبیؐ ﷺ من یُرید اللّٰہ بہٖ خیر یفقھہ فی الدین ۔ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کسی کے لیے خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین میں سمجھ بوجھ اور فقاہت عطا فرما دیتا ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری الاشباہ والنظائر فی اصول الفقہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا کسی کو علم نہیں ہوتا البتہ جس شخص کو تفقہ فی الدین حاصل ہو، اس سے سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا ہے۔ تاہم وہ لوگ سعادت مند ہیں جو علم دین میں حصولِ فقاہت کے بعد دین اسلام کی قوانین شرعیہ کے ذریعے خدمت کرتے ہیں۔ فتویٰ درحقیقت بذریعہ قوانینِ شرعی قرآن وحدیث کے احکام کو بروئے کار لانے کا نام ہے۔ لہٰذا **لِکلّ فَنِ رجال** کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر دور میں فقہی میدان میں کچھ ایسے شاہسوار پیدا فرماتا ہے جو اپنی فقہی صلاحیتوں کی بدولت قرآن کریم اور احادیث شریف کی روشنی میں اہلِ ایمان کو مسائل فقہ سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیات میں سے ایک شخصیت حضرت فقیہِ اعظم مفتی محمد حسین شوقؒ رحمۃ اللہ کی بھی ہے جو ایک بلند پایہ مدرس ہونے کے علاوہ بہت بڑے فقیہہ بھی تھے۔ آپ کی فکاہت کا یہ عالم تھا کہ حضور محدثِ اعظمؒ حضرت علامہ سردار احمد رحمہ اللہ نے ایک موقع پر آپ کے متعلق فرمایا کہ مولانا شوقؒ صاحب ایسے فقیہہ ہیں جو فقہ سے فقہ نکالتے ہیں (بحوالہ صد سالہ

دارالعلوم محمودیہ رضویہ)۔نفس الامر میں بھی علامہ شوق صاحبؒ فقہ میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔فتاویٰ ہذا کے مطالعہ سے علامہ شوق علیہ الرحمہ کا تبحرِ علمی واضح ہوتا ہے۔نیز فتاویٰ ہذا کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کسی مقام پر سائل نے اجنال سے کام لیا ہے تو حضرت سوال کی تمام شقوں پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور فتاویٰ ہذا میں جدید مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ خاص کر مسئلہ خلع کے متعلق آپ بہت احسن انداز میں فقہی جزئیات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ راقم ایں سطور نے فتاویٰ عین الفقہ المعروف فتاویٰ شوق کا اس وقت نام سنا جب میرے پاس برادرِ مکرم فخر المدرسین علامہ محمد الیاس صاحب مدرس جامعہ محمودیہ پپلاں تشریف لائے اور مجھے فتاویٰ ہذا کی ایک کاپی تصحیح کے لیے عنایت کر گئے۔تدریسی مصروفیات کی وجہ سے بالاستحاب اس کا مطالعہ نہیں کر سکا البتہ تین حصے تقریباً ضرور پڑھا ہوگا۔الغرض یہ فتاویٰ علماء حاضر خصوصاً مدرسین کے لیے ایک رہنما اور فقہی جزئیات کا خزانہ ثابت ہوگا۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس فتاویٰ کی اشاعت و اہتمام کرنے والوں کو دارین کی برکتیں عطا فرمائے خصوصاً صاحبزادہ علامہ ریاض محمود صاحب اور صاحبزادہ ڈاکٹر ممتاز محمود ملک کی تمام کاوشوں کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور علامہ پپلانویؒ کے جملہ خاندان کی ہمیں ادب واحترام کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام مع الاحترام

العارض

حافظ محمد اسلم

مدرس آستانہ عالیہ، ضلع اٹک۔مکھڈ شریف

بتاریخ: ۱۷ دسمبر ۲۰۲۳ء

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ ربِ العٰلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیک علیٰ رسولِ الکریم وَعلیٰ آلِہٖ واصحٰبہٖ اجمعین۔ اللہ تعالیٰ جن کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، ان کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ الحمدللہ فتاویٰ عین الفقہ المعروف فتاویٰ شوقؔ زیرِ مطالعہ رہا اور اسے انتہائی جامع، مفید اور نافع پایا۔

قبلہ شیخ الفقہ والحدیث علامہ مفتی محمد حسین شوقؔ کا عظیم اور منفرد کارنامہ ہے۔ مسائل کو واضح کر کے مدلل، ٹھوس اور مختصر و جامع جوابات دیے گئے اور انہیں تمام ابہام اور شکوک و شبہات سے بالاتر رکھا گیا ہے۔ اس سے ان کی محنت اور اعلیٰ ظرف نگاہی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن و حدیث سے استنباط و استشہاد اور فقہی مسائل و جزئیات کا مدلل بیان کیا ہے۔ مشکل، پیچیدہ مسائل کا جواب سادہ، سہل، عام فہم زبان میں دیا گیا ہے اور یہ فتاویٰ کی منفرد خصوصیت ہے۔

معاملاتِ مناکحات، طلاق وغیرہ دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ بدمذہبوں کے عقائدِ مذمومہ کا رد کیا ہے اور تسلی بخش جوابات دیے ہیں۔

گیارہویں شریف، اذان سے قبل صلوٰۃ وسلام، علم غیب، عقیدۂ حاضر و ناظر پر شاندار مدلل حوالہ جات دے کر اپنے بزرگوں کے علمی ورثہ کی منتقلی کا حق ادا کر دیا ہے اور

اپنی وسعتِ قلبی، تبحرِ علمی اور ذوق وشوق کی حسین عکاسی فتاویٰ کے حسین گلدستہ کی صورت میں فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی بیکراں وسعتوں سے نوازے۔

میں خصوصاً جناب محترم ممتاز محمود ملک صاحب کو اپنے بزرگوں کے قیمتی علمی ورث کی حفاظت واشاعت پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب اکرم ﷺ کے نعلین پاک کا صدقہ اس علمی فیضان سے جادۂ حق کے مسافروں، طلباء، علماء وفقہا، عوام وخاص کو مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔

ڈاکٹر صاحب کے صدقہ ء جاریہ کی بدولت انہیں دین ودنیا میں آباد وشاد رکھے۔

آمین۔ **بجاہِ النبی الکریم ﷺ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔**

فقیر

عطاالرسول قادری رضوی

خادم؛ دارالعلوم جامعہ حسنیہ رضویہ، فتح پور (لیہ)

الحمد لله ربِ العٰلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ أشرف المرسلین سیدنا محمد والہٖ وأصحابہٖ اجمعین وبعد۔

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور درود وسلام ہو تمام رسولوں سے معزز ترین ہستی ہمارے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی تمام آل واصحاب پر اور ہر اس شخص پر جس نے آپ کی سنت کی اقتداء کی اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت سے ہدایت پکڑی۔

شکر ہے اس رب کریم کا جس نے ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت عطا کی اور بہترین امت کا فرد بنایا۔ اس امت کو علماء عاملین سے مزیب اور اولیاء مخلصین سے مزین کیا تاکہ اس کی مخلوق پر اس کی حجتِ استمرار پوری ہوتی رہے۔

وہ رب ذوالجلال جس سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا فرما دیتا ہے۔ پھر ان کے ذریعے اللہ رب العزت لاکھوں لوگوں کو علم کے نور سے فیض یاب فرماتا ہے۔ علم اللہ کی عطا کردہ ایسی نعمت ہے جو انسان کو صحیح اور غلط میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ علم ہی کے ذریعے حلال اور حرام کے نشانات واضح ہوتے ہیں۔ پھر اسی علم کے ذریعے وہ حلال کو اپناتا ہے اور حرام سے اجتناب کرتا ہے اور نہ صرف خود بلکہ اپنے ساتھ منسلک لوگوں کو بھی حرام سے بچاتا ہے اور حلال کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ نے امتِ مسلمہ کو قرآن و

سنت (حدیث) کی صورت میں علم کا ایک بحرِ بے کراں عطا فرمایا ہے۔

قاضی ابوبکر بن عربیؒ اپنی کتاب قانون التاویل میں بیان فرماتے ہیں:

"علوم الحدیث کی تعداد ۶۰ ہے جبکہ قرآن مجید کے علوم کثیر ہیں۔"

اسی طرح علماء نے قرآن مجید میں مذکور علوم کی تعداد ۷۷۴۵۰ بیان فرمائی ہے اور خود قرآن مجید میں جا بجا حصول علم و حکمت اور تفکر و تدبر کا حکم بھی فرمایا گیا ہے۔ قاضی ایازؒ کی مشہورِ زمانہ کتاب "الشفاء" میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی یارسول اللہؐ آپ کی سنت کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "معرفت میرا راس الحال ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے اور غم میرا رفیق، علم میرا ہتھیار ہے۔"

اس حدیث مبارکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت بیان فرمائی اور علم کو اپنا ہتھیار قرار دیا ہے۔ علم کی بطور ہتھیار وضاحت ایک حدیث میں اس طرح ملتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "علم حاصل کرو، یہ حلال و حرام کے نشانات کا تعین کرنے والا ہے اور اہلِ جنت کے راستوں کا مینار ہے (جسے دیکھ کر وہ نشان پکڑتے ہیں) یہ وحشت میں مونس ہے اور غربت میں ساتھی ہے، خلوت میں اپنے صاحب کے ساتھ گفتگو کرنے والا ہے۔ یہ دشمنوں کے خلاف ہتھیار اور دوستوں کے درمیان حسن و زیور ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے قوموں کو بلندی عطا فرماتا ہے اور انہیں بھلائی میں قائم و دائم ایسے رہنما بناتا ہے جن کے آثار بیان کیے جاتے ہیں جن کے کارناموں کی پیروی کی جاتی ہے اور جن کی آراء کو حتمی سمجھا جاتا ہے۔"

علم کی اہمیت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات سے واضح ہے۔ امتِ مسلمہ کو یہی پیغام دیا گیا ہے کہ وہ حصولِ علم میں سرگرداں رہیں اور علم کے باب میں دنیا میں اپنی حکمرانی

قائم کریں۔مگر افسوس کہ دورِ حاضر میں ہم حصولِ علم کی دوڑ میں انتہائی پیچھے رہ گئے۔ جب انسان اس پستی کو دیکھتا ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے مگر جب نگاہ ایسے اسلاف کی طرف جاتی ہے اور ان کے فیض یافتگان شاگردوں کی طرف جاتی ہے، تو ان کے کارناموں اور خدمتِ دین کو دیکھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔ان میں ایک نام مفتی محمد حسین شوقؒ کا بھی ہے جو علامہ مفتی محمد محمود پپلانویؒ کے جانشین بھی تھے، ان کے علمی فیض کے وارث بھی ہوئے اور نصف صدی کے قریب طالبانِ حق کے سینوں میں عشق و علمِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغ جلاتے رہے۔آپ کے حضور سینکڑوں طالبانِ علم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے آئے اور فیض پانے کے بعد ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اس نورِ علم کو آج بھی پھیلا رہے ہیں۔اور یہ سلسلہ سینہ بہ سینہ اللہ کے حکم سے قیامت تک چلتا رہے گا۔

آپؒ جب حضرت اعلیٰ سید پیر مہر علی شاہ گیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ کیا پڑھتے ہو؟ عرض کی حضور گلستان۔فرمایا کہ دس مرتبہ درود شریف، دس مرتبہ کلمہ شریف اور دس مرتبہ یہ شعر پڑھا کرو۔

بلغ العلیٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلو علیہ وآلہٖ

فرماتے ہیں کہ ایک بار پھر حاضری ہوئی تو پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ عرض کی کہ سکندر نامہ پڑھتا ہوں۔فرمایا کہ یہ شعر پڑھا کرو۔

خدایا جہاں پادشاہی تو راست
زما خدمت آید خدائی تو راست

پناہ بلندی و پستی توئی
ہما نیستند آنچہ ہستی توئی

پھر فرماتے ہیں جب آخری دفعہ آپؒ کی خدمت میں ان کے وصال سے ۴۰ روز قبل پہنچا تو فرمایا کہ اب کیا کرتے ہو؟

عرض کیا کہ حضور! پڑھاتا ہوں۔

توحضرت پیرمہرعلیؒ نے مفتی شوقؒ کی بات سن کرخوشی اظہار فرمایا اور کہا:

"پڑھاتے رہنا۔" اس کے بعد دعا فرمائی۔

پیرمہر علی شاہؒ اور مفتی محمد حسین شوقؒ کی ان ملاقاتوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے اکابرین کی مجالس بھی علم سے آراستہ ہوتی تھیں اور ہر وقت حصولِ علمِ معرفت میں اپنا وقت صرف فرماتی تھیں۔ آج ان جیسی بلند مرتبہ ہستیاں تو ہم میں موجود نہیں مگر ان کی صحبت آج بھی بشکلِ کتاب ہمارے درمیان موجود ہے جو اللہ کے حکم سے قیامت تک طالبانِ علم کی رہنمائی فراہم کرے گی۔ اسی طرح اس فتاویٰ کے ذریعے مفتی محمد حسین شوقؒ کی صحبت بھی میسر آتی ہے اور یہ کتاب ان کے لیے صدقہ جاریہ بھی ہے اور ان کے درجات کی بلندی کا ذریعہ بھی ہے۔ خود تو وہ اس دنیا سے چلے گئے مگر جو میراثِ علم انہوں نے چھوڑی ہے، یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ آج وہ خود تو ہم میں موجود نہیں مگر اس علمی کارنامے کے سبب وہ آج بھی ہم میں موجود ہیں۔

حضرت علیؑ شیرِ خدا کا ارشادِ گرامی نہج البلاغۃ میں ہے "مال وہ ہے جس کی حفاظت تجھے کرنی پڑتی ہے، اور علم ایسی چیز ہے جو خود تیری حفاظت کرتا ہے۔"

مفتی صاحب ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھنے والے تھے اور ہمارے لیے یہ باعثِ فخر ہے کہ ہمارے خاندان کا تعلق خاندانِ محمودیہ سے بہت پرانا ہے۔ مولانا حافظ

غلام محمود پپلا نویؒ قبلہ پیر سید نور عالم شاہ گیلانیؒ پیر آف چھتر شریف کی دعوت پر فتح پور تشریف لاتے اور خاندان پیر چھتر شریف کے صاحبزادگان کو علومِ دینیہ سکھاتے اور شریعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قوانین اور ضابطے بھی سکھاتے۔ گویا آپ کا یہ فیض سینہ بہ سینہ ہمارے بزرگوں سے ہوتا ہوا ہم تک بھی پہنچا ہے۔ خانوادۂ پیر چھتر شریف اور خانوادۂ محمودیہ آج بھی ایک دوسرے کی بے حد عزت وتکریم کرتے ہیں۔ سادگی اور عاجزی اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے اور ان پر اللہ کا کرم ہے۔ اللہ یہ محبتیں قیامت تک قائم رکھے۔ آمین۔

اس فتاویٰ میں آپ کا اسلوب انتہائی خوبصورت ہے۔ ہر جگہ سائلین کے سوالوں کا جواب تسلی بخش دیا گیا ہے۔ ہر جگہ آپ کی علمی مہارت کا ثبوت نظر آتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور اکابرین کا ادب ومحبت بھی واضح نظر آتا ہے۔

مفتی محمد حسین شوقؔ کا مقام ومرتبہ انتہائی بلند ہے اور اس میدان میں نہ ہمارا کوئی نام ہے اور نہ کوئی مقام ہے۔ یہ سعادتِ عظیم بندۂ ناچیز کو میسر آئی ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ چند الفاظ جو اپنے سے بڑی ہستیوں کی شان میں لکھے، اللہ ان کو قبول فرمائے اور قبلہ مفتی محمد حسین شوقؔ کے درجات اللہ بلند فرمائے۔

یہاں مجھے علامہ اقبال کی نظم "حضور رسالت مآبؐ" کے دو اشعار یاد آرہے ہیں جو قارئین کی نذر کرتا ہوں:

حضور ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

آج مفتی صاحبؒ جیسی ہستیاں ہم سے رخصت ہوگئیں۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن سے وفا کی بو آتی تھی۔ مگر آج تلاشِ بسیار سے بھی ایسی ہستیاں ملنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ہستیوں کا فیض قیامت تک جاری رکھے اور امتِ مسلمہ کو اس علمی مقام کا حصول نصیب فرمائے جس کا تقاضا قرآن وسنت میں کیا گیا ہے۔

اللہ رب العزت مفتی محمد حسین شوقؒ کے اس علمی کارنامے کو قبول فرمائے اور اسے قبولِ عام عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمارے محسن و بزرگ ڈاکٹر ممتاز محمود ملک صاحب کی اس کاوش کو اللہ قبول فرمائے اور ان کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔ آمین

علامہ پیر سید محمد اسد اللہ گیلانی

خادم؛ آستانہ عالیہ

پیر چھتر شریف، فتح پور (لیہ)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للّٰہِ رب العٰلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

اللہ تعالیٰ جس شخص سے خوب بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین میں تفقہ عطا فرماتا ہے۔ علامہ مفتی محمد حسین شوقؔ کی مبارک ہستی ان چیدہ چنیدہ شخصیات میں سے ایک ہیں جنہیں مالک الملک نے اپنے کلام اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا خاص عرفان عطا کیا ہے۔ ان کا خانوادہ خاص علمی وروحانی مقام کا حامل ہے۔

اس خانوادہ سے جن لوگوں نے فیض حاصل کیا ہے، بالواسطہ اور بلاواسطہ آج عالمِ اسلام میں ان کا فیض پھیل رہا ہے۔

فتاویٰ عین الفقہ کو اکثر مقامات سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ خوشگوار حیرت ہوئی کہ یہ فتاویٰ مروجہ طرزِ تحقیق سے بہت بلند اور موجود طرزِ افتاء کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں۔

آج کل ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ براہِ راست کتبِ فتاویٰ میں سے کسی فتویٰ کو نقل کر کے جواب دینا کافی سمجھا جاتا ہے جبکہ عصرِ حاضر میں موجود شخصیات کی نفی اور پڑھنے والے کے اطمینان کے لیے بنیادی دلائل کی ضرورت ہے۔ مفتی علیہ الرحمۃ کے تحریر کردہ فتاویٰ میں آیاتِ قرآنی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احادیثِ طیبہ آثار صحابہ واہلِ بیت اور فقہاء اسلام کی

تصریحات نیز کتبِ فقہ کتبِ فتاویٰ سے دلائل لائے گئے ہیں۔ ایک حظِ وافر ہے جو متلاشیانِ علم کے لیے موجود ہے۔

موضوع کوئی ہو، حوالہ کوئی ہو اور محبت رسول کے جذبات دکھائی دیں، یہ وصف عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پائی جاتی ہے۔ اس مجموعہ فتاویٰ کے مایہ الامتیاز پہلوؤں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جذبہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دلوں کو حرارت فراہم کرتی ہے۔

بعض مخصوص تقلیدی اثرات کے پیشِ نظر جو جمود و تعطل علمی حلقوں کے لیے پریشان کن ہے، جمعہ کے سلسلہ میں لکھے گئے جامع فتاویٰ میں تیز نشترِ تحقیق قبلہ کے مبلغِ علم کا بین ثبوت ہے۔

نہایت ادب سے ہمارے بعض اہلِ علم و دانش کے فتاویٰ میں سخت الفاظ اور بعض تحریروں میں اردو زبان کی غلطیوں نے انہیں پڑھنے والوں کے لیے بوجھل کر دیا ہے۔ بعض نامانوس الفاظ جگ ہنسائی کا باعث ہیں۔ جبکہ فتاویٰ عین الفقہ کی زبان شائستہ اور ربطِ کلام دلچسپ ہے۔

محترم جناب ڈاکٹر ممتاز محمود ملک میرے محسن اور مخلص ہیں۔ ہمارے والدِ گرامی علامہ عطا محمد بندیالوی علیہ الرحمۃ کے شاگرد ہیں اور قبلہ بندیالوی صاحب اس خانوادہ کے شاگرد ہیں اور استاذ بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی عنایت ہے کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح احسان فرمایا اور دعاؤں سے اور محبت سے نوازا اور چند سطور لکھنے کا موقع عطا فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب علم دوست، بلند اخلاق، شگفتہ مزاج اور حلیم الطبع شخصیت ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے انہوں نے ملت کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

مفتی احمد رضا اعظمی (لیہ)

باب اول

فَتَاویٰ عَین الُفِقه

المعروف

فتاویٰ شوقؔ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سوال ۱

زید کہتا ہے کہ ذکر بالجہر مسجد میں ناجائز ہے۔کیا یہ صحیح ہے یا نہ؟ بینوا وتوجرو رحمکم اللہ۔(سائل از گوجرخان)

جواب

ذکر بالجہر جائز ہے بلاشک بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے۔

تفسیر روح البیان: تحت آیة یذکرون اللّٰہ قیاماً و قعوداً ورد فی الاحادیث مایدل علی استحباب الاخفاء فی ذکر اللّٰہ و ذکر شارح الکشاف ان ھذا بحسب المقام و موافقه ماذکرفی المظهر حیث قال الذکر رفع الصوت جائز بل مستحب، اذا لم یکن عن ریاءٍ لیغتنم الناس باظهار الدین ووصول برکة الذکر اِلٰی السامعین فی الدور و البیوت والحوانیت لیوافق الذکر من سمع صوته ویشهد له یوم القیٰمة کل رطب و یابس سمع صوته و بعض المشائخ اختار الاخفاء لانه ابعد عن الریاء وهذا یتعلق بالنیة فمن کانت نیته صادقة فرفع صوته بقرءة القرآن والذکر اولی۔و من خاف فی نفسه الریاء فالاولی له اخفاء الذکر قیل اذاکان وحده فان کان من الخواص فالاخفاء فی حقه اولی وان کان من العوام فالجهر فی حقه اولی واذا کانوا مجتمعین علی الذکر فالاولی حقهم رفع الصوت بالذکر و القوة فانه اکثر تاثیرا فی رفع الحجب و من حیث الثواب فلکل واحد ثواب ذکر نفسهٖ و سماع ذکر رفقائِه . . .

ترجمہ: **یذکرون اللّٰہ قیاماً وقعودًا** کے تحت احادیث میں وارد ہے جو ذکر سری کے مستحب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور شارح کشاف نے ذکر کیا ہے کہ یہ مقام اور محل کی مناسبت کے اعتبار سے ہے مظہر کے اندر جو مذکور ہے کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر جائز ہی نہیں بلکہ مستحب تو یہ اس وقت ہے کہ جب ذکر ریا کاری کے طور پر نہ ہو اور تا کہ لوگ دین کے اظہار کو غنیمت سمجھیں اور ذکر کی برکت سامعین کے گھروں اور دکانوں تک پہنچ جائے اور تا کہ جو ان کی آواز کو سنے اس کی ذکر میں موافقت کرے۔ ہر خشک وتر چیز جس نے اس کی آواز کو سنا اس کے لیے گواہی دے اور بعض مشائخ نے سری ذکر کو پسند کیا کیونکہ یہ ریا کاری سے دور ہے اور اس کا تعلق نیت سے ہے جس شخص کی نیت اچھی ہو تو اس کا قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر بلند آواز سے کرنا اولیٰ (افضل) ہے۔ اور جو شخص اپنے آپ پر ریا کاری کا خوف رکھتا ہو تو اس کے لیے آہستہ آواز میں ذکر کرنا افضل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اکیلا ہو اور خواص (نیک) لوگوں سے ہے تو اس کے لیے آہستہ ذکر کرنا افضل ہے اور اگر ذکر کرنے والوں کا تعلق عام لوگوں سے ہے تو اُن کا بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ہے اور اگر اجتماع کی صورت میں ذکر کرتے ہوں تو پھر جہراً (بلند آواز) میں ذکر اولیٰ ہے۔ کیونکہ یہ حجابات (پردوں) کو دور کرنے میں زیادہ اثر رکھتا ہے اور اس صورت میں ہر ایک اپنا ذکر کرنے کے ساتھ دوسرے کا ذکر سنتا بھی ہے ۔ اور جو باقی حدیث میں آتا ہے کہ آہستہ ذکر کرنا بہتر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ریا کاری کا خوف ہو یا نمازیوں کو تکلیف ہو تو اس وقت بھی آہستہ ذکر افضل ہے اور اس سے بلند آواز والے ذکر کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔[1]

و فی الدر المختار فی باب مایفسد الصلوٰۃ وما یکرہ عند ذکر احکام

---

[1] (تفسیر روح البیان۔ ج2 ص180، 181 سورۃ آل عمران 192، 194)

المسجد و يحرم فيه السوال و يكره الاعطاء وانشاد ضالة اوشعر الا مافيه ذكر و رفع الصوت بذكر اللّٰه للمتفقة اھ

ترجمہ: اور مسجد میں سوال کرنا حرام ہے اور سائل (مانگنے والے) کو دینا مکروہ ہے اور گم شدہ چیز کا اعلان اور شعر جو کہ ذکر کے بغیر ہوں اور اسی طرح ذکر کے لیے فقیہ (عالم) کے علاوہ کے لیے آواز کو بلند کرنا بھی مکروہ ہے۔[1]

وہ جہر فاحش کے متعلق ہے اور آیت **وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَخِيفَةً** (ترجمہ: اور اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کرو گڑگڑاتے ہوئے) مکی ہے اور اس موقعہ پر نازل ہوئی ہے جبکہ نماز پوشیدہ پڑھی جاتی تھی اور کفار قرآن سن کر گالیاں بکتے تھے تو حکم ہوا کہ قرآن آہستہ پڑھو اور اب وہ بات نہیں رہی۔ بقول امام رازی ''دون الجہر'' کا معنی جہد المفرط ہے اور اس کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے: **وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا** ۔(ترجمہ: اور اپنی نماز میں نہ آواز زیادہ بلند کرو اور نہ بلکل آہستہ اور ان دونوں کے بیچ میں راستہ چاہو) علاوہ ازیں افضلیت سر کی علّہ تفرع اور خیفہ سے بیان کی گئی ہے جو خواص کو مناسب ہے۔ دوسرا ''واذکر'' امر ارشادی ہے وجوب وفرض کے لیے نہیں۔ ثالثاً یہ خطاب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہے، سب کے لیے نہیں جیسا کہ احادیث سے ظاہر ہے۔ باقی وہ احادیث جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غازیوں کو سفر میں جب انہوں نے ہر بلندی اور پستی پر بلند آواز کے ساتھ تکبیر کہتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ارْبعوا على أنفسكم انكم ليس ما تدعون اصم ولا غائب۔

---

[1] (درمختار صفحہ 90 باب مایفسد الصّلاۃ وما یکرہ عند ذکر احکام المسجد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: اے لوگو! اپنی جانو پر رحم کھاؤ کیونکہ تم کسی غائب یا بہرے کو نہیں پکار رہے۔

ا

اس میں خاص مصلحت تھی۔ کفار کا علاقہ تھا اور اخفاء مقصود تھا تاکہ دشمن کو ہماری اطلاع نہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں ''اربعو'' کا لفظ صراحتہً دال ہے جہر مفرط کو روکنے کے لیے اور وہ بھی صحابہؓ کو تکلیفِ نفس سے باز رکھنے کے لیے فرمایا، نفس جہر کو منع نہیں فرمایا۔

ا۔ حدیث شریف میں ہے: **رواه المسلم والبخاری والبیهقی فی الاسماء والصفات عن ابی هریرة قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان للّٰه ملائِکةً یطوفون فی الطرق یلتمسون اهل الذکر فَاِذَا وجدوا قوما یذکرون اللّٰه تنادو هلموا الی حاجتکم** ...... الخ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں ذکر اللہ والوں کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں پھر جب کسی قوم کو اللہ کا ذکر کرتے پاتے ہیں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کہ اپنے مقصد کی طرف آؤ۔ [۲]

۲۔ **رواه ابن ابی شیبه واحمد و مسلم والترمذی والنسائی عن معاویة رضی اللّٰه عنه ان رسول اللّٰه ﷺ خرج علی حلقة من اصحابهٖ فقال ما اجلسکم الا هٰذا قالوا واللّٰه ما اجلسنا الا ذلک فقال اما انی ماستحلفکم تهمة لکم ولکن اتانی جبرائیل فاخبرنی ان اللّٰه عزو جل یباهی بکم الملائکته۔**

ا۔ (مسلم شریف: باب استحباب خفض الصوت، ج2 حدیث 6862، ص350)

۲۔ (مشکوٰۃ شریف، باب ذکر اللہ عزوجل اللہ: ج1 ص199، ح2157، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

ترجمہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے حلقہ میں تشریف لائے تو پوچھا تمھیں یہاں کس چیز نے بٹھایا ہے وہ بولے ہم اللہ کا ذکر کرنے بیٹھے ہیں اُس کا شکر کر رہے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت دی ہم پر بڑا احسان کیا۔ فرمایا کیا خدا کی قسم تم کو صرف اس چیز نے بٹھایا ہے وہ بولے اللہ کی قسم ہم کو اِس کے علاوہ کسی چیز نے نہیں بٹھایا فرمایا میں نے تم سے تہمت کی وجہ سے قسم نہ لی میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے انہوں نے بتایا کہا اللہ تم سے فرشتوں پر فخر کر رہا ہے۔[1]

۳۔ رواه الطبرانی عن ابن حنظلة قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم مَاجَلَس قوم مجلسا یذکرون الله فیه فیقومون حتی یقال لهم قوموا قد غفر الله لهٔ

ترجمہ: کوئی بھی قوم جس وقت کسی مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی ہے اور پھر اس مجلس سے کھڑی ہوتی ہے تو ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بخشش فرما دی ہے۔

۴۔ رواه الترمذی عن انس قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا قالوا یارسول الله صلی الله علیه وآله وسلم ماریاض الجنة قال حلق الذکر

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم جنت کی کیاریوں سے گزرو تو کچھ چرلیا کرو۔ لوگوں نے پوچھا جنت کی کیاریاں کیا ہیں فرمایا ذکر کے حلقے (ترمذی)

۵۔ عن ابن عباس قال کنت اعرف انقضاء صلوٰة رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم بالتکبیر

۱۔ (مشکوٰۃ شریف: باب ذکر اللہ عزوجل: ج1، ص201، ح2168، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نماز سے فارغ ہونے کو تکبیر (اللہ اکبر) سے پہچانتا تھا۔[1]

۶۔ عن ابی هريرة وابی سعيد قالا قال رسول الله ﷺ لا يقعد قوم يذكرون الله الا حفتهم الملائكة وغشِيَتمُ الرحمة ......الخ

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی کوئی جماعت نہیں جو اللہ کے ذکر کے لیے بیٹھے مگر انہیں فرشتے گھیر لیتے ہیں اور رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔[2]

۷۔ عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ اَنَا عَند ظَنِّ عبدی بی وانا معه اذا ذكرنی فان ذكرنی فی نفسهٖ ذكرتُه فی نفسی وان ذكرنی فی ملاء ذكرته فی ملاء خير منهم ......الخ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں اور جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں۔[3]

مندرجہ بالا احادیث سے جو خوفِ طوالت سے مختصر اور مشت نمونہ از خروارپیش کی گئی ہیں، بالکل واضح ہو گیا ہے کہ انفرادی ذکر سے اجتماعی صورت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ باعث ثواب و برکت ہے اور اجتماعی صورت میں بغیر جہر ذکر ناممکن ہے۔ جیسا کہ احادیث

۱۔(مشکوٰۃ ص89۔باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

۲۔(مشکوٰۃ ص198۔باب ذکر اللہ عزوجل)

۳۔(صحیح بخاری کتاب التوحید۔باب قول اللہ تعالیٰ)(**ويحذركم الله نفسه**)

کے الفاظ سے ظاہر ہے۔لہٰذا ذکر جہر جائز بلا شبہ ہے، بلکہ مستحب ہے۔

ھذا ما عندی و العلم عند اللّٰہ الکبیر۔

رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ (گولڑہ شریف)

سوال ۲

ہمارے مدرسہ میں ایک قاری ہے، وہ تراویح میں ختم قرآن شریف پڑھتا ہے اور ہر سورۃ کے ابتداء میں تسمیہ جہراً پڑھتا ہے، منع کرنے کے باوجود بھی باز نہیں آتا اور کہتا ہے کہ ختمِ قرآن میں نقص لازم آتا ہے۔ مدلل جواب سے ممنون فرمائیں۔ (سائل از عیسیٰ خیل)

جواب

جزیۃً تسمیہ کے مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف نو قسم پر منقول ہے۔ کما صرّح بہم مولانا عبدالحئی صاحب حاشیہ شرح الوقایہ ص ۱۳۶ باب صفۃ الصلوٰۃ متاخرین حنفیہ کے نزدیک مختار مذہب یہ ہے کہ یہ قرآن کی آیت ہے لیکن نہ فاتحہ کی جز ہے اور نہ کسی دوسری سورۃ کی اور یہی اصح ہے۔ عندھم لہٰذا متون و اکثر شروح فقہ متفق ہیں کہ سورۃ اور فاتحہ کے درمیان نہ پڑھی جاوے۔ مختصروقایہ میں ہے **ویسمی لا بین الفاتحۃ والسورۃ واما عندراس کل سورۃ فی الصلوٰۃ فلا یاتی بالتسمیۃ عند ابی حنیفۃ و ابی یوسف علیہ الرحمۃ وقال محمد یاتی بھا احتیاطاً کما فی اول الفاتحۃ والصحیح قولھما لان الاحتمال کونھا من السورۃ منقطع باجماع السلف علے مامرو فی انھا لیست من الفاتحۃ لا اجماع فبقی الاحتمال فوجب العمل بہ فی حق القراۃ احتیاطا ولکن لایعتبر ھذا لاحتمال فی حق الجھر لان المخافتۃ اصلا فی الاذکار**

والجهر بها بدعة فی الاصل فاذا احتمل انها ذکر فی هذه الحالة واحتمل انها من الفاتحة کانت المخافتة ابعد عن البدعة فکانت احق وروی عن محمد انه اذا کان یخفی بالقرأة یاتی بالتسمیة بین الفاتحة والسورة لانه اقرب الی متَابَعَةِ المصحف واذا کان بجهر بها لایاتی لانه لوفعل لاخفی بها فیکون سکتة فی وسط القرأة وذلک غیر مشروع

ترجمہ: فاتحہ اور سورت کے درمیان بسم اللہ نہ پڑھی جائے (بلکہ صرف سورۃ الفاتحہ کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھی جائے) بہرحال ہر سورت کے شروع میں نماز میں شیخین کے نزدیک بسم اللہ نہ پڑھے اور امام محمد صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک احتیاطاً بسم اللہ پڑھے جس طرح کہ فاتحہ کے شروع میں اور صحیح شیخین کا قول ہے کیونکہ اس کے سورۃ سے ہونے کا احتمال تمام سلف وصالحین کے نزدیک منقطع ہے اگرچہ سورۃ فاتحہ کے جزء ہونے پر اجماع نہیں ہے لیکن جہر کے حق میں اس احتمال کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اصل اذکار میں آہستگی ہے ان میں جہر بدعت ہے اور جب اس حالت میں ذکر ہونے کا بھی احتمال ہے اور سورۃ الفاتحہ کا جزء ہونے کا احتمال ہے تو آہستہ آواز میں پڑھنا یہ بدعت سے زیادہ دُور ہے اور زیادہ حق دار ہے اور امام محمد صاحب سے مروی ہے کہ جب آپ سِرًّا اقراءت فرماتے تو فاتحہ اور سورت کے درمیان بسم اللہ پڑھتے اور جس وقت بلند آواز سے قراءت کرتے تو بسم اللہ نہ پڑھتے کیونکہ اگر آہستہ بھی پڑھتے ہوتے تو یہ قراءت کے درمیان ٹھہرنا ہے اور یہ غیر مشروع ہے

بدائع الصنائع فالجہر مکروہ کما فی المحیط وغیرہ والخلاف قد مرواعلم ان الترمذی قال الجہر بالتسمیة غیر مسنون عند اکثر الصحابة والتابعین وحدیث الاخفاء صحیح بلا خلاف وبلغنا ان الدارقطنی قال لم

يصح فی الجهر حديث كذا في شرح المغنی فی مذهب احمد ابن حنبل

ترجمہ: بدائع الصنائع میں ہے بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھنا مکروہ ہے جس طرح کے محیط اوراس کے علاوہ میں ہے۔ جامع رموز میں ہے جان تو کہ امام ترمذی نے فرمایا کہ بسم اللہ شریف جہراً پڑھنا اکثر صحابہ اور تابعین کے نزدیک غیر مسنون ہے اور آہستہ پڑھنے کی حدیث بغیر اختلاف کے صحیح ہے اور ہمیں معلوم ہوا کہ دارقطنی نے کہا کہ جہراً (بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے) میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اسی طرح امام احمد بن حنبل کے مذہب میں کتاب شرح مغنی میں ہے۔[1]

مندرجہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ جہر بالتسمیہ مکروہ ہے۔ فاتحہ کی ابتدا میں اور اول السورۃ میں بھی اور اخفاء اولیٰ ہے۔ ہاں ایک دفعہ بالجہر پڑھ لینے سے کوئی حرج نہیں تاکہ نقص فی الختم بھی لازم نہ آوے۔

ولكن قال المولوى عبدالحئى على حاشية شرح الوقاية كما قاله المحقق ابن همام مجموعه هدايه جلداول

اور عاصم کوفی کی قرأۃ بھی یہی ہے اور فقہا کے نزدیک نماز میں جو قرأۃ پڑھ لی جاوے نماز مخدوش نہیں ہوتی۔ ہاں اس پر مداومت اور اصرار یہ مذہب حنفیہ اور تحقیق فقہاء کے خلاف ہے۔[2]

سوال ۳

کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے حلف اٹھائی ہے کہ اگر میں چلم پیوں تو جَدَن، جس وقت میں شادی کرو، مجھ پر عورت طلاق ہے۔ اب وہ سگریٹ وغیرہ پی لیتا ہے اور

---

[1]۔ (جامع الرموز، ج1 ص28۔ باب فی فرض الصلوٰۃ)

[2]۔ (حاشیہ شرح وقایہ۔ ج3 ص136، محقق ابن ہمام۔ ص25)

بعض کہتے ہیں کہ چلم بھی پی لی ہے۔حلف دلوانے والوں کی نیت قطعی تمباکو کی تھی۔کیا طلاق واقع ہو جائے گی؟ اور کوئی طریقہ ہے کہ اس کی شادی ہو سکے؟ بینوا وتوجروا رحمکم اللہ۔

(سائل از گولڑہ شریف)

جواب

زید نے اگر چلم پی تو سگریٹ سے طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ جس پر حلف اٹھائی گئی ہے، وہ حقیقتاً مستعمل ہے لہٰذا حلف اس کے استعمال سے واقع ہوگی اور حلف دینے والوں کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ حالف کے الفاظ کا اعتبار ہے۔ کما صرح فی کتب الفقہ، درالمختار باب الایمان، اگر چلم پی لے تو ابدی طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ ''جَدَن'' کا لفظ ''اذا'' اور ''متی'' کا ترجمہ ہے، ''کلما'' کا ترجمہ نہیں ہے اور ''اذا'' اور ''متی'' وغیرہ عموم اوقات کے مقتضی ہیں بخلاف ''کلما'' کے کہ وہ عموم افعال کا مقتضی ہے۔

اذا وجد الشرط مرة الا فی کلما فانه ینحل بعد الثلاث لاقتضا ئِها عموم الافعال کاقتضاء کل عموم الاسماء۔

ترجمہ:

کلما کے علاوہ میں جب شرط ایک مرتبہ پائی جائے تو تین طلاقوں کے بعد یمین ختم ہو جاتی ہے لیکن کلما کا معاملہ الگ ہے۔ کیونکہ یہ لفظ کلما عموماً افعال کا تقاضا کرتا ہے جس طرح کہ لفظ کل اسماء کے عموم کا تقاضا کرتا ہے۔[1]

لہٰذا نکاح خوان حسب عادت جس طرح الفاظ نکاح کو تین دفعہ دہراتا ہے تو پہلی دفعہ سے یمین منحل ہو جائے گی، دوسری دفعہ نکاح صحیح ہو جائے گا۔

---

[1]۔(درمختار، باب التعلیق، ص 221، مطبوعہ دار العلمیہ لبنان)

سوال ۴

چہ فرمایند (کیا فرماتے ہیں) علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص نے قسم اٹھائی ہے کہ عورت مجھ پر چھبیس ۲۶ طلاق کے ساتھ حرام ہے، عورت مغلظہ ہو جائے گی یا نہیں؟

(سائل من مضافات)

جواب

حالف مذکور پر تین طلاق واقع ہوں گی۔ وما صرّح بہ فی الدر المختار فی باب الایلاء۔

انت علی حرام الف مرۃ یقع واحدۃ۔

ترجمہ: تو مجھ پر ہزار مرتبہ حرام ہے تو ایک طلاق واقع ہو گی۔[1]

فقط حرمت کا ذکر ہے اور حرمت شیئے واحد ہے تعدد کو نہیں چاہتی اور طلاق تعدد کو چاہتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ **اے مادرت شش طلاقہ یقع ثلاث۔**

ترجمہ: اے تیری ماں چھ طلاق والی ہے تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔[2]

اس کو کنائی کے اقسام میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

کما فھم بعض العلماء واللہ ولی التوفیق

سوال ۵

زید نے اپنے بھائی عمر سے کہا کہ کل فلاں پٹھان سے تخم ریزی کے لیے بیج مانگیں

---

[1]۔(درمختار، باب الایلاء، ص 233، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، لبنان)

[2]۔(فتاویٰ عالمگیری، ج 1 ص 421، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان)

گے۔عمر نے کہا وہ نہیں دے گا۔اسی تنازعہ میں عمر نے کہا اگر فلاں شخص نے بیج دیا تو مجھ پر زن طلاق ہے۔خیر اس پٹھان سے جب بیج مانگا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا لیکن بعد میں دے دیا۔کیا عمر کی بیوی مطلقہ ہو جائے گی یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

(سائل از ڈھلی نامدار)

جواب

عمر کی بیوی مطلقہ نہیں ہو گی بلکہ اس فلاں کے انکار سے یمین ختم ہو جائے گی۔ بعد میں اگرچہ دے دے لیکن وہ مضر نہیں۔**هذا مصرح فی کتب الفقه**۔

عبده محمد حسین کان الله له

سوال ٦

عید کا چاند اگر کسی جگہ ہو گیا اور اس شہر والوں نے تار کے ذریعہ سے دوسرے شہر والوں کو خبر دے دی تو کیا ان پر اس تار کے مطابق عید کرنی جائز ہے یا نہیں؟ اگر معتبر ہے تو کیا شرائط ہیں؟ بینوا وتوجروا رحمکم اللہ۔

جواب

اصولیین کے نزدیک خبر تین قسم ہے۔متواتر، مشہور اور خبرِ واحد۔خبرِ واحد پھر دو قسم ہے۔محتف بالقرائن وغیر محتف بالقرائن۔خبر محتف بالقرائن مفید یقین ہے اور اس کے ساتھ عمل واجب ہے مگر غیر محتلف میں اگر مخبر عادل ہو تو مخبر کی عدالت صدق کا قرینہ ہوتی ہے۔ لہٰذا **غلبة الظن بصدق المخبر** کی وجہ سے عمل واجب ہوگا۔ اگر عادل نہیں تو عمل کرنا درست نہیں ہے۔

لہٰذا تار کا مضمون یہ ہے کہ چاند ہوا ہے یا فلاں نے دیکھا ہے یا بہت آدمیوں نے دیکھا ہے اور اکثر تاروں کا مضمون اسی قسم کا ہوتا ہے تو معتبر نہیں۔ اگر یہ مضمون ہے کہ میں نے دیکھا ہے یا فلاں شخص نے میرے سامنے شہادت دی ہے اور یہاں کے مفتی یا قاضی شرعی نے اس کی شہادت قبول کر لی ہے یا یہاں عید ہے تو اگر ایک تار ہے تو عمل جائز نہیں کیونکہ کلام ہلالِ عید میں ہے۔ اگر دو تین ہیں اور بادل وغیرہ ہے تب بھی جائز ہے بشرطیکہ تار بھیجنے والے معتبر آدمی ہیں۔ یا بادل کوئی نہیں۔ آٹھ دس تار موصول ہوئے اور تار کا مضمون موخر الذکر ہے اور دل گواہی دیتا ہے کہ اس میں کذب اور خطا نہیں تو عمل کرنا جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔ جہاں کوئی محقق عالم دین موجود نہیں، وہاں عوام کے دل کی تسلی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ ایک عادل آدمی نے یہ خبر دی ہے کہ ہمارے ہاں چاند ہو گیا ہے اور تسلیم کر لیا گیا ہے تو یہ شہادت معتبر ہے۔ ھکذا قال قاضی خان ......

اختلاف مطالع اور اتحاد مطالع کو احناف کے نزدیک ظاہر روایۃ کے طور پر کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں زیلعی کہتے ہیں کہ اشبہ یہ ہے کہ معتبر ہے۔ درالمختار ص ۸۷ لیکن رویت ہلال کی جہاں سے اطلاع آئی ہے، اگر شرعی طور پر بطریق موجب ہوئی ہے تب تو اعتبار ہو گا۔ لما قال صاحب الدر...... لیکن اختلاف اقلیم کی صورت میں خبر رویت کا تسلیم خلافِ عقل ہے مثلاً ہم نے چاند دیکھ لیا ہے اور تار کے ذریعے اس وقت امریکہ والوں کو اطلاع دے سکتے ہیں لیکن وہاں ممکن ہے اس وقت طلوعِ فجر کا وقت ہو یا سورج نکل رہا ہو جیسا کہ ظاہر و باہر ہو چکا ہے تو قابلِ تسلیم نہیں ہو گا۔ جامع الرموز میں ہے۔ **وقیل یعتبر کما فی المضمرات وحدہ علی مافی الجواھر مسیرۃ شھر فصاعدا اعتبار لقصۃ سلیمان علیہ السلام فانہ قد انتقل کل غدو رواح من اقلیم الی اقلیم و بین کل منھما میسرۃ شھر**

باقی کریب مولی ابن عباس کی روایت کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک شہادت ہونے اور خبر واحد ہونے کی وجہ سے رد کر دیا تھا کیونکہ ہلالِ شوال کے لیے دو آدمیوں کی شہادت ضروری تھی۔ (1) کما صرح بہ ہذا عندنا واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۷

کیا فرماتے ہیں علماء ے دین اندرین مسئلہ کہ ایسی لنگڑی گائے جس کا ایک پاؤں ٹوٹ کر پھر لگ گیا ہے اور وہ چلتی پھرتی ہے، کیا اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتو جروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔(سائل خان محمد از پپلاں)

جواب

اگر وہ چل پھر سکتی ہے تو جائز ہے اور لنگڑی ٹانگ زمین پر ٹیک کر چلتی ہے۔ اگر وہ ٹانگ زمین پر سے اٹھی ہوئی ہے اور تین ٹانگوں پر چلتی ہے تو ناجائز ہے۔

والعرجاء ان کانت یمشی بثلاث قوائم و ویجاف الرابعة من الارض لایجوز وان کانت تضع الرابعة علیٰ الارض و تَستَعِیْنُ بھا اِلاَّ اَنَّھا یتمایَلُ مع ذٰلِکَ و تضعھا وضعاً خفیفاً یجوزا......[۱] ھ

ترجمہ: لنگڑا جانور اگر تین پاؤں کے ساتھ چلتا ہے اور چوتھے کو زمین پر رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مدد طلب کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مائل ہوتا ہے اور اُس کو تھوڑا سا زمین پر رکھتا ہے تو اس کی قربانی جائز ہے۔[۲]

۱۔(جامع الرموز۔ج1ص154)

۲۔(خلاصۃ الفتاویٰ، ج4،ص321)

سوال ۸

چہ فرمایند (کیا فرماتے ہیں) علماء کرام کہ حاملہ قریب الولادۃ (جننے کے قریب) گائے کی قربانی کرنی جائز ہے یا نہیں؟ (سائل غلام نبی)

جواب

قریب الولادۃ (جننے کے قریب) گائے کا ذبح کرنا مکروہ ہے۔

رجل له شاة حاملة اراد ذبحها ان تقاربت الولادة يكره الذبح وهذا عند ابى حنيفة علیہ الرحمۃ بناء على اَن الجنين لايتذكى بذكوة الام عندهٗ......اھ

ترجمہ: ایک مرد کے پاس حاملہ بکری ہے جس کے ذبح کرنے کا ارادہ کرتا ہے اگر وہ بچہ جننے کے قریب ہے تو ذبح کرنا مکروہ ہے اور یہ امام صاحب کے نزدیک ہے۔ اس بنا پر کہ بچہ ماں کے ذبح کے ساتھ ذبح نہیں ہوگا۔[۱]

......**و فى الكبرىٰ ايضا اذا تقاربت الولادة شاة حاملة يكره ذبحها لانها تضييع مافى بطنها من غير فائدة زائدة۔**

ترجمہ: فتاویٰ الکبری میں بھی ہے کہ بکری جب بچہ جننے کے قریب ہو تو اس کا ذبح کرنا مکروہ ہے کیونکہ یہ بغیر فائدہ کے بچہ کو ضائع کرنا ہے۔

سوال ۹

میں نے گائے فروخت کرنی ہے اور میں کہتا ہوں کہ میرا حصہ قربانی بھی مقرر کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ناجائز ہے۔ کس طرح مسئلہ ہے؟ بینوا رحمکم اللہ (سائل سمندر خان)

۱۔ (خلاصۃ الفتاویٰ، ج4، ص307)

جواب

یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ یہ بیع اور شرط ہے اور آنحضرت ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے اور یہ شرط صلب عقد کے خلاف ہے، اس لیے ناجائز ہے...... **لنهيه رسول الله ﷺ عن بيع و شرط۔**

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا۔[1]

سوال ۱۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ قربانی چھ ماہ سے زائد کی فقط دنبہ کی جائز ہے یا مینڈھا چھترا کی بھی جس پر اکثر سال گزر چکا ہے۔ بینوا وتو جروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔ (سائل امام صاحب گل والا)

جواب

''مولوی عبدالحئ صاحب لکھنوی نے مجموعۃ الفتاویٰ میں منح الغفار شرح تنویر الابصار اور شرعۃ الاسلام کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ناجائز ہے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: **لا تذبحوا الا مسنة الا ان يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضان۔**

ترجمہ: کہ سال سے کم عمر والا جانور ذبح نہ کرو مگر جبکہ دشوار ہو تو بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ ذبح کرو۔[2]

۱۔ (راواہ الطبرانی فی الاوسط)

۲۔ (ابوداؤد شریف۔ ج 2، ص 38 مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

ضان کی تفسیر ''مالہ الیۃ''یعنی جس کی چکی ہو، کی ہے،لہٰذا چھترا کی ناجائز ہوگی۔''

لیکن یہی مولوی عبدالحئ صاحب شرح وقایہ کے حاشیہ میں زکوٰۃ سوائم کے باب میں لفظ ''ضان'' کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

الضان والمعز الغنم جنس وھذان لوغان فالضان بالفارسیۃ میش ومنہ مالہ الیۃ ......اھ۔

اس عبارت سے یہ تو معلوم ہوا کہ ضان دراصل تو بھیڑ کو کہتے ہیں لیکن مالہ الیۃ بھی میش کا ایک قسم ہے اور اس کی تائید لغت کی کتاب غیاث منتخب صراح تینوں نے کی ہے۔ کہ ضان بفتح الضاد وسکون الھمزۃ بالفارسیۃ میش۔ چونکہ حدیث شریف میں ضان کی اجازت مصرح ہے،اور لغت کی کتب متفق ہیں کہ یہ میش کو کہتے ہیں جس کے دو قسم ہیں۔ مالہ الیۃ اور بغیر الالیۃ اور فقہ کی دیگر کتب میں بھی ضان کی تفسیر مالہ صوف اور معز کی تفسیر مالہ شعر سے کی گئی ہے۔تو معلوم ہوا کہ چھترا مالہ صوف میں داخل ہے اور اس کی قربانی ضرورت کے وقت جیسا کہ حدیث کے لفظ الا ان یعسر سے واضح ہے کہ جائز ہے مگر بغیر ضرورت اور احتیاط اس میں ہے کہ سال کا پورا ہو۔شرعۃ الاسلام کی عبارت میں بھی ضان چونکہ معز کے مقابلہ میں مذکور ہے اس لیے اس کی تفسیر مالہ الیۃ معز سے متمایز کرنے کے لیے کی گئی ہے۔علاوہ ازیں قرین قیاس ہے کہ منح الغفار والے نے بھی یہ تفسیر اس لیے کر دی ہے کہ عرب وخراسان و دیگر مغربی ممالک میں عموماً دنبہ ہی ہوتا ہے، چھترا یعنی بغیر الالیۃ کم ہوتا ہے ورنہ بصورتِ دیگر یہ لغت کا وظیفہ ہے اور لغت میں اس کی تفسیر میش سے کی گئی ہے جو عام ہے لہٰذا اس کو ترجیح ہو گی۔ تعجب ہے کہ خلاصۃ الفتاویٰ اور فتاویٰ عالمگیری میں تو **والعتو و من المعز** (بکرا جب اکثر سال کا گزر گیا ہو) کی قربانی بھی اصل کی روایت سے جائز بتائی ہے گو یہ منطوق حدیث اور صاحب الدر وغیرہ کی تصریح لا من غیرھا،شامی کی عبارۃ باب الاضحیۃ یمن لامن

غیرہ سے مراد من المعز والبقر ہے۔بعض بے سمجھ غیرہ کی ضمیر مخ والی عبارۃ مالہ الیۃ کی طرف راجع کر کے **جذع من غیر ذات الالیۃ** پر عدم جواز کا حکم لگا دیتے ہیں جو عقل ونقل کے خلاف ہے کیونکہ ظواہر متون فقہ حدیث اور قرآن میں صرف ضان اور معز مذکور ہے۔اگر غیر ذات الالیۃ علیحدہ حکم رکھتا تھا تو پھر ذکر کہاں گیا اس کا ؟حکم کہاں سے معلوم ہوگا ؟ادائے واجب میں بھی پھر ذات الالیۃ میں فرق ہونا چاہیے جس طرح معز اور ضان میں ہے۔[1]

سوال ۱۱

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک بالغ لڑکے نے بھیڑ کے ساتھ بدفعلی کی ہے اور لوگوں کے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے لہٰذا اس لڑکے کو تعزیر آتی ہے یا نہیں؟ اور اس بھیڑ کو کیا کیا جائے ؟ (سائل از چاہ سلطان والا)

جواب

اس لڑکے کو چالیس جوتے لوگوں کے سامنے تعزیراً لگائے جائیں اور بھیڑ اگر اس کی اپنی ہے تو ذبح کر کے دفن کر دی جائے اور اگر کھائے تو وہ نہیں کھا سکتا اور آدمی کھا سکتے ہیں اگر ان کی طبیعت نفرت نہ کرے اور اگر وہ بھیڑ کسی اور کی ہے تو وہ ذبح کرنا چاہے تو ذبح کر دے ورنہ وہ اس فاعل سے قیمت لے لے اور وہ فاعل ذبح کر کے دفن کر دے یا ذبح نہ کرے اور رکھے اپنے پاس۔ذبح کرنا یا جلانا واجب نہیں۔

ہدایۃ میں ہے : **والذی یُروی انہ تذبح البھیمۃ وتحرق فذلک لقطع التحدث بہ ولیس بواجب اھ عینی**

۱۔(شامی، باب الزکوٰۃ)

ترجمہ: اور جو مروی ہے کہ جانور کو ذبح کیا جائے اور جلایا جائے تو یہ اس لیے کہ اس چیز کا چرچا ختم ہو جائے اور یہ واجب نہیں۔[1]

خلاصۃ الفتاوی میں ہے: **وفی فتاوی القاضی الامام رجل وطی بهیمة قال رحمه الله ان کانت البهیمة للواطی یقال له اِذبحها واحرقها وان لم یکن له یقال للواطی کان لصاحبها ان یدفعها الواطی بالقیمة ثم یذبحها الواطی ویحرق ان لم یکن ماکولة وان کان ممایوکل یذبح ولا حرق۔**

ترجمہ: کسی مرد نے جانور کے ساتھ بدفعلی کی اگر جانور بدفعلی کرنے والے کا ہے تو اس کو کہا جائے گا کہ اس جانور کو تو ذبح کر اور جلا دے اور اگر جانور بدفعلی کرنے والے کا نہیں ہے تو اس کو کہا جائے گا کہ جانور کی قیمت اس کے مالک کو دے اور وہ اس جانور کو ذبح کر کے جلا دے گا اگر حرام گوشت والا جانور ہے اگر حلال جانور ہے تو اس کو ذبح کیا جائے گا لیکن اس کا جلانا ممنوع ہے۔[2]

ہاں (اگر وہ دولت مند ہے) تو ذبح کر کے دفن کر دینا مستحب ہے۔ کما فی الدرغایۃ الاوطار والبحر وغیرہم ......لیکن اس میں اضاعت مال ضرور ہے۔ **اَلْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ**

سوال ۱۲

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ مسمی اللہ بخش سکنہ دو آبہ نے بوجہ ناراضی اپنی زوجہ عائشہ کو تین پتھر لے کر ایک پتھر پھینکا اور کہا ''جا ایہ طلاق ھیا'' پھر نادم ہوا اور دیر بعد دو پتھر بغیر کچھ کہے زمین پر پھینک دیے۔ روٹی کھائی، پھر میں نے عورت کو کہا ''جا

[1]۔(ہدایہ، جلد 2۔ صفحہ 508۔ مطبوعہ اسلامی کتب خانہ)

[2]۔(خلاصۃ الفتاویٰ، ج 4، صفحہ 446۔ کتاب الحدود)

اب تو میرے کام کی نہیں رہی'' ......کیا ان الفاظ سے طلاق ہوجاتی ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

مندرجہ بالا بیان اور شہادتِ زوجہ مذکور سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسماۃ عائشہ پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے۔ باقی اس کا اخیری لفظ اول تو طلاق نہیں بنتا

کما قال صاحب الخلاصۃ قال تو مرا بیگانہ او لا حاجۃ لی فیک لا یقع

ترجمہ: تو میرے لیے بیگانہ ہے یا مجھے تیری ضرورت نہیں تو اس سے طلاق واقع نہیں ہو گی۔[1]

لاوہ ازیں اس کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی طلاق جو اس کے نزدیک واقع ہوچکی ہے، اس کی خبر دے رہا ہے۔ لہٰذا اگر طلاق کے الفاظ ہوتے تب بھی علیحدہ طلاق واقع نہ ہوتی۔

کما قال صاحب الدر اذا لکن جعلہ اخبارا عن الاول کانت بائن بائن او ابنتک بتطلیقۃ فلا یقع انہ اخبار فلا ضرورۃ فی جعلہ انشاء بخلاف ابنتک باخریٰ ......الخ......

ترجمہ: ایک طلاق بائن دوسری طلاق بائن کو اس وقت تک نہیں ملتی جب تک اس دوسری کو پہلی سے خبر بنانا ممکن ہو۔ جیسا کسی نے کہا ،،اَنتِ بائن،، پھر اس کے بعد،، بائن،، کہا یا **ابنتک بتطلیقۃ** (یعنی میں نے تجھ کو ایک طلاق دے کر جدا کیا) طلاق تو یہ دوسری طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ یہ پہلی طلاق کی خبر ہے لہٰذا اس کو دوسری طلاق بنانے میں کوئی

---

[1]۔(خلاصۃ الفتاویٰ ج2 ص98)

ضرورت نہیں ہاں اگر ابنتک باخریٰ کہا یعنی کہ میں نے تجھے دوسری طلاق دے کر جدا کیا تو تب دوسری طلاق واقع ہو جائی گی۔[1]

لہٰذا ایک طلاق کے بعد مسمی اللہ بخش اپنی زوجہ کو رجوع کر سکتا ہے۔ ھذا ما عندی، و العلم عند اللہ (بروز دوشنبہ ۲۴ ماہ ذوالحجہ ۱۳۶۲ھ)

سوال ۱۳

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اندریں مسئلہ (۱) کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ جہر کرنا بدعت ہے یا نہیں؟ اور (۲) جنازہ کی نماز کے بعد دعا مانگنا اور (۳) موجودہ صفِ ماتم اور (۴) موجودہ حیلہء اسقاط وغیرہ کیا بدعت نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ **کل محدث بدعة وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔**

مفصل جواب عنایت کیا جائے۔ رحمکم اللہ تعالیٰ۔ (سائل سید علی از گوجرانوالہ)

جواب

الحمدلله والصلوٰة علی النبی اما بعد فاقول و بالله التوفیق……

بدعت دو قسم کی ہوتی ہے ایک لغوی اور ایک شرعی۔ جس فعل کی ابتدا بغیر مثال سابق کے ہو، وہ بدعت لغوی ہے اور جس فعل پر دلیل شرعی نہ ہو یا وہ دین میں سے نہ ہو اور دین کا کام سمجھ کر کیا جائے، وہ بدعتِ شرعی ہے۔ لہٰذا جس فعل کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستحب یا واجب فرمایا ہے، لیکن اس پر عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ظاہر ہوا ہے، وہ بدعتِ لغوی ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی تراویح، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کتاب ''الصدقہ''

---

[1]۔(درمختار، ص215، ج1 باب الکنایات مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان)

وغیرہ۔ **قال الشافعی** علیہ الرحمۃ **ماأحدث مما یخالف الکتاب والسنۃ والاثر والاجماع فھو ضلالۃ وما احدث من الخیر مالا یخالف شئیاً من ذلک فلیس بمذموم**......ترجمہ: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جس نے ایسا طریقہ ایجاد کیا جو کتاب وسنت اور اجماع کے مخالف ہو تو وہ گمراہی ہے اور جو ان میں سے کسی کے مخالف نہ ہو وہ مذموم نہیں ہے۔[1]

......**و ایدہ ماورد فی الحدیث من ابتدع بدعۃً ضلالۃً لا یرضاھا اللہ و رسولہ کان علیہ الاثم**......الخ......

ترجمہ: اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں اللہ کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو گمراہی کی بدعت ایجاد کرے جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی نہ ہوتو اس پر ان سب کے برابر گناہ ہوگا جو اس پر عمل کریں گے۔(2)[2]

بدعت کئی قسم ہے۔ واجب، حرام، مکروہ، مستحب، مباح وغیرہ۔ کما ھو مصرح فی الکتب موجودہ۔ دورِ حوادث وفتن میں ہماری علمی درس گاہیں ہر سال جن لوگوں کو سینکڑوں کی تعداد میں فراغت وتکمیل کا پروانہ دے کر اپنی حدود سے باہر نکال دیتی ہیں، درحقیقت ان صاحبان کے علم کا ہر ایک جزو ہر ایک ریشہ تشنۂ تکمیل ہوتا ہے۔

یہ لوگ واپس گھر پہنچ کر عوام پر اپنی مزعوم علمیت کا رعب ڈالنے اور اپنی حیات نو میں زندگی کی حرارت کا احساس کرانے کے لیے بغیر تحقیق و تدقیق کے چھوٹے چھوٹے اختلافی مسائل کو سامنے رکھ کر عوام میں افتراق پھیلانے کا مشغلہ شروع کر دیتے ہیں ورنہ ایسے مختلف فیہ مسائل میں جن کی انتہائی شدت کراہت کے درجہ تک پہنچی ہے، میدان جدال

۱۔(مرقاۃ شرح المشکوٰۃ۔ج1 صفحہ 216، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)

۲۔(مشکوٰۃ شریف۔ باب الاعتصام بالسنۃ والکتاب، صفحہ 30، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

گرم کر کے تضیع اوقات کرنے کے علاوہ کوئی ٹھوس اور تعمیری کام ان کے پیشِ نظر کیوں نہیں ہوتا۔

دیکھا مناظروں کا بہت اس نے رنگ ڈھنگ
اکبر کے دل میں اب نہ رہی بحث کی امنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرت مذاق میں
ایماں برائے طاعت اور مذہب برائے جنگ

ہیچوں قسم کے علماء کرام کو دنیا کی ہر ایک چیز بدعت نظر آتی ہے۔ کیا وہ ایک لمحہ کے لیے دل پر ہاتھ رکھ کر اور حضرت عمرؓ کے الفاظ ''**نعمت البدعة هی**''

ترجمہ: یہ کتنی اچھی بدعت ہے۔

اور فرمان مصطفوی ﷺ ''**من سَنَّ فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر مَن عمل بها**

ترجمہ: جس نے اسلام میں اچھے کام کی ابتداء کی تو اس کے لیے اس کا اجر بھی ہے اور اس پر عمل کرے گا اس (ابتداء کرنے والے) کو اجر ملتا رہے گا۔[1]

وعليكم بسنتي وسنة خلفاء الراشدين المهديين

ترجمہ: میری اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔[2]

ولا يجتمع امتي على الضلالة

۱۔ (ریاض الصالحین صفحہ 88 باب فی مَن سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً اوسِیَۃً)

۲۔ (مشکوٰۃ شریف۔ ج1 صفحہ 30، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

ترجمہ: اور میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔[1]

ماراه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن ''

ترجمہ: جس کام کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

پاکیزہ کلمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ''**کل محدث بدعة وکل ضلالة فی النار**'' کے معنی سمجھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

بہرکیف یہ فتنہ وفساد کی خلیج کو وسیع تر کرنے کی سعیِ لاحاصل کوئی عمدہ پروگرام نہیں۔

ایسے احباب کی نظر شاید حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ''**کیف انت اذا کانت علیک امراء یمیتون الصلوٰة اویوخرون عن وقتها**'' پر نہ پڑتی ہوگی۔

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

میکواں رفتند و سنتہا بماند

وزلیخاں ظلم و لعنتہا بماند

جواب دوم:

جہر بالجنازہ کو اکثر کتب فقہ مثلاً درالمختار، شامی، غایہ، ھندیہ، قاضیخاں، بحرالرائق وغیرہ نے مکروہ لکھا ہے اور خاموشی کے ساتھ چلنے کو مستحب لکھا ہے۔ **فی المفاتیح المسائل یستحب السکوت خلف الجنازه لانه وقت الاعتبار والاذکار وان کان فی ذکر و دعاء یخافت وفی الشرعة لایتکلم بشئ من الدنیا ولا یضحک فان ذلک یقسی القلب ...اه وفی الطحاوی یکره رفع الصوت بالذکر وقرأة القرآن لانه تشبه باهل الکتاب ووافقه ا لشلبی** علیہ الرحمۃ **وعن البدائع**

---

[1] ۔(مشکوٰۃ شریف۔ج1 صفحہ 31، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

لماروی عن قیس بن عبادہ انه قال کان اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ یکرھون رفع الصوت عند ثلاثة عند القتال و عند الجنازة والذکر ولانه تشبه ماجعل الکتاب وکان مکروھا اھ......[1]

مندرجہ بالا حوالہ جات سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ سکوت مستحب امر ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ جہاں بھی ''یکرہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد کراہیتِ تنزیہی ہو جس کی تائید یستحب اور بیہقی کے نرم الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ **وفی البحر ینبغی لمن تبع الجنازة ان یطیل الصمت ویکرہ رفع الصوت بالذکر اھ وفیه ایضا الکراھة فیھا کراھة تحریم فی فتاویٰ العصر و عند مجدالائمه و قال علاء الدین ناصر ترک الاولیٰ** اھ......[2]

لیجئے، فقہ کے انبار سے صرف دو شخص ہیں جو کراہتِ تحریمی کا قول کر رہے ہیں، دوسرے کسی نے بھی نہیں لکھا۔ چلو مان لیا کہ یہ فعل مکروہ ہے یا خلافِ اولیٰ ہے لیکن کیا اس قابل ہے کہ اس کو محلِ نزاع بنا کر فتنہ وفساد کی آگ مشتعل کی جائے۔ **وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ**

دعا بعد الجنازۃ کے متعلق صرف ''سراجیہ کبریٰ'' اور ''خلاصۃ'' نے لکھا ہے۔ **لا یقوم بالدعا بعد صلاۃ الجنازۃ** اھ......

ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد دعا کے لیے نہ کھڑا ہو۔ **لا یقوم بالدعاء فی قرأء القرآن لاجل المیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ و لاقبلھا واللّٰہ اعلم**۔ ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد نہ میت کے لیے قرآن مجید پڑھنے میں نہ نماز جنازہ پڑھنے سے پہلے کھڑا ہو اور نہ

---

[1]۔(البدائع۔ج1ص 31)

[2](بحر۔ج1ص 192)

ہی بعد میں۔[1]

لیکن دلیل کسی نے ذکر نہیں کی۔ ممکن ہے ''اسرعوا'' کے الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنا لکھ دیا گیا ہو لیکن ''اسرعوا'' کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ جائز ضرور کے لیے جو عقلاً اور شرعاً درست ہے، چند منٹ کی دیر ناجائز ہو ورنہ فقہا کا ایک شہر سے دوسرے شہر تک جن کے درمیان میل یا دو میل کا فاصلہ ہو، نقلِ میت کی اجازت بخشنا، اقارب و جیران کو وفات کی اطلاع دینی تا کہ وہ اپنے حقوق سے فراغت حاصل کریں، والی کے لیے اعادہ وغیرہ کی اجازت بھی لفظ ''اسراع'' کے خلاف ہو گی تو معلوم ہوا کہ ''اسرعوا'' کا مطلب یہ ہے کہ بلاوجہ میت کو اقارب کی ظاہری و عارضی محبت کے مظاہرے کے لیے یا برادری اور رشتہ داروں کی ناجائز رسوم کی ادائیگی وغیرہ کے لیے گھر میں روک رکھنا ناجائز ہے ورنہ دعا کے لیے نماز جنازہ کے بعد چند منٹ کی دیر جس کا مقصد یہ ہوتا ہے۔

جو لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے قبرستان جنازہ کے ساتھ نہیں جا سکتے، وہ یہیں تعزیت اور ایصالِ ثواب کر لیں۔ اس کے بعد انہیں ورثائے میت کی طرف سے عملاً اجازت ہوتی ہے کہ جو شخص واپس گھر جانا چاہے جا سکتا ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر یہ قیام عقلاً جائز ہوا اور شرعاً اس لیے کہ امام احمدؒ نے مسند شریف میں ایک حدیث روایت فرمائی ہے۔

جس کا معنی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نمازِ جنازہ سے فارغ ہو کر وہیں کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھائے اور میت کے لیے دعا فرمائی۔ **ان شئت فانظر فیه۔**

صاحب البدائع نے ایک حدیث نقل کی ہے:

ماروی عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی علی الجنازة فلمّا فرغ جاء عمر و معه

---

[1]۔(خلاصۃ الفتاویٰ۔ج1ص225)

قوم فاراد ان یصلی ثانیا فقال النبی ﷺ الصلاۃ علی الجنازۃ لاتعاد و لکن اُدع للمیت واستغفرلہٗ وھذا نص فی الباب

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے نماز جنازہ ادا فرمائی جس وقت فارغ ہوئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور آپ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے آپ نے نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نماز جنازہ دوبارہ نہ پڑھی جائے لیکن میت کے لیے دعا کرو اور استغفار کرو۔

وروی ان ابن عباس و ابن عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما فاتتہما صلاۃ الجنازۃ فلما حضرا مازادا علیٰ الاستغفار لہٗ وھذا عن عبداللّٰہ ابن سلام رضی اللّٰہ عنہ واِنْ سَبَقْتُمُونی بالصلوٰۃ فلا تَسْبِقُونی بالدعاء لہٗ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نماز جنازہ فوت ہوگئی تو جس وقت وہ حاضر ہوئے تو انہوں نے میت پر استغفار کے علاوہ اور کوئی چیز زیادہ نہ فرمائی اور یہی بات حضرت عبداللہ ابن سلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تم نے نماز جنازہ میں مجھ سے سبقت کر لی ہے تو میت کے لیے دعا کے اندر سبقت نہ کرنا۔[1]

بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ جب جنازہ خود دعا ہے تو پھر دوبارہ دعا مانگنا تحصیل حاصل ہے۔ اول تو یہ شبہ منطقی نص مذکور کے خلاف ہے اور ثانیاً ابوداؤد میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب مردہ دفن ہو چکتا تو اس کی قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اس کے لیے ثبات مانگو، اب اس سے سوال ہوگا۔ غایۃ ج ۱ ص ۴۲۱۔ دعا تو جنازہ میں ہو چکی پھر اس دعا کی کیا ضرورت؟ تعزیت کے جو

۱۔(بدائع الصنائع۔ج 1 ص 311،دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان)

الفاظ فقہا نے نقل فرمائے ہیں، وہ بھی دعا پر مشتمل ہیں۔ کما سیاتی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

جواب سوم:

معلوم نہیں سائل کے علاقہ میں تعزیت کا کیا طریقہ ہے۔ ہمارے ہاں تو ورثائے میت کے مکان پر آدمی جمع ہوتے ہیں کچھ پڑھ کر بخشتے ہیں اور کہتے ہیں ”خداوند تعالیٰ میت کو بخشے، اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آئندہ مصائب سے محفوظ فرمائے اور خداوند تعالیٰ لواحقین کو صبر عطا فرمائے۔“ اور یہ الفاظ تقریباً ہر فقہ کی کتب سے ثابت ہیں۔ ایک مکان میں جمع ہو کر تعزیت کرنی تین دن تک خواہ وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو، لیکن اپنا مکان بہتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو حضرت جعفرؓ کی شہادت کے وقت مسجد میں بیٹھے تھے اور لوگ آآ کر تعزیت کرتے تھے۔

نقله فقيه ابو الليث الثمرقندی فی بستان الفقيه

ترجمہ: اس کو فقیہ ابولیث ثمرقندی نے بستان الفقیہ میں نقل کیا

هكذا فی الدر و الشامی والغاية والقاضی خان و المضمرات و فی البحر والتعزية المصائب سنة للحديث من عزی مصابا فلهٗ مثل اجره قال البقالی لا باس بالجلوس للعزاء ثلاثة ايام فی بيت واو مسجد اه... فی التبيين ان يقول اعظم الله اجرک و احسن عزاک وغفر لميتک ولا باس بالجلوس اليها ثلاثا اه...

ترجمہ: مصیبت والے شخص کی تعزیت سنت ہے کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس شخص نے مصیبت زدہ شخص کی تعزیت کی تو اس کے لیے بھی اسی طرح اجر ہوگا۔ بقالی نے کہا کہ تعزیت کے لیے گھر کے اندر یا مسجد کے اندر تین دن تک بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور تبیین میں ہے کہ وہ کہے اللہ تعالیٰ تجھے اجر عطا کرے اور آپ کے میت کی بخشش

فرمائے اور اس کے لیے تین دن تک بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔[1]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے **ویستحب ان یقال لصاحب لتعزیة غفر اللّٰہ لمیتک وتجاوز عنه و تغمده برحمته ورزقک الصبر علی مصیبته واجرک علی موثهِ کذا فی المضمرات ناقلا عن الحجة اھ۔۔۔**

ترجمہ: اور مستحب ہے کہ جس کو تعزیت کرے اس کو یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے میت کی بخشش فرمائے اور اس کو اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ دے اور آپ کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور اس کی موت پر آپ کو اجر عطا کرے۔[2]

و فی الکبریٰ اذا اجتمع الناس للتعزیة اولغیرها و یقرئون القرآن ینبغی ان یکونوا متوجهین الی القبلة حالة القرأة فانظر ماذا تری هداک اللّٰہ تعالیٰ۔

ترجمہ: فتاویٰ کبریٰ میں ہے کہ جب لوگ تعزیت کے لیے یا اس کے علاوہ جمع ہوں اور قرآن مجید پڑھیں تو بہتر ہے کہ ان کا منہ قبلہ کی طرف ہو۔

جواب چہارم:

اسقاط نماز روزہ و دیگر حقوق اللہ کے لیے بلاشبہ جائز ہے۔ حدیث میں ہے ''ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میری ماں فوت ہو چکی ہے اور اس نے ماہِ رمضان کے روزے نہیں رکھے۔ کیا میں اس کی طرف سے قضا کر سکتا ہوں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو تُو ادا کرتا؟...... اس نے کہا ہاں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حقدار ہے کہ ادا کیا جائے۔''

---

[1]۔ (بحر الرائق۔ ص192)

[2]۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ص183 ج1، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت)

اب بالاتفاق اہلِ مذہب چونکہ ایک شخص دوسرے کی جگہ محض بدنی عبادت نہیں کر سکتا بدیں وجہ اس حدیث شریف کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ کہ اس کی طرف سے فدیہ ادا کرے اور اس کو قضا سے تعبیر کیا گیا ہے یا یہ حدیث منسوخ ہے۔ **و الاول احسن قال الطحاوی اعلم انه ورد النص فی الصوم باسقاطه بالفدیة و اتفقت المشائخ علی ان الصلاة کالصوم استحسانا لکونها اهم و انما الخلاف بینهم فی عن الصلاة یومِ کصومه اوکل فریضة کصوم یوم وهوا المعتمد** اھ ک......

ترجمہ: اور طحاوی نے فرمایا کہ نص میں آیا ہے کہ فدیہ کے ساتھ روزہ ساقط ہوتا ہے اور مشائخ نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ نماز روزہ کی طرح ہے کیونکہ یہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ پورے دن کی نمازوں کا فدیہ ایک روزے کے برابر ہوگا یا ہر نماز کا فدیہ ایک روزے کے برابر ہوگا اس آخری بات پر اعتماد کیا گیا ہے۔

منۃ الجلیل میں علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں کہ یہ منصوص علیہ فی المذہب ہے اور اس پر عمل ہے کہ وارث دس آدمیوں کو جمع کرے جن میں غنی غلام لڑکا اور مجنون نہ ہو، میت کی عمر کا حساب کر کے سنِ بلوغ کی مدت بارہ سال مرد کے لیے اور نو سال عورت کے لیے علیحدہ کر دے، اگر مدتِ عمر معلوم نہ ہو تو غالب ظن سے تخمین لگالیں، پھر اس سے مدت مذکورہ خارج کر کے بقایا عمر کا حساب کر کے فدیہ ادا کر دے۔ اگر وہ شخص پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو ، پھر بھی احتیاط کر لینی چاہیے۔ شاید اس کی عبادت میں خلل واقع ہوتا رہا ہو اور اسے علم نہ ہو۔[1]

و مما تعارفة الناس و نص علیه اهل المذهب ۔ وہ اس طرح ہے کہ جب واجبات کثیر ہو جائیں تو ہمیانی میں نقدی یا کوئی اور چیز ڈال کر مثلاً جواہر یا زیورات اور اس

---

[1]۔(منۃ الجلیل۔ص 211)

کے پھرنے کے مختلف طریقے ہیں اور احسن طریقہ یہ ہے کہ وارث و وصی، اس ہمیانی کو فقیر کے حوالہ کرے اور کہے کہ یہ فدیہ ہے فلاں شخص کی نمازوں کا، اس کو لے لو فلاں کی طرف سے یا میں نے تمہیں اس نقدی کا مالک بنایا ہے فلاں شخص کی اتنی مدت کی نمازوں کے فدیہ میں۔ فقیر اس کو قبول کرلے اور قبضے میں کر کے پھر فقیر وہ نقد اسی وصی کو ھبہ کر دے اور وصی پھر اسی طریقہ پر دوسرے فقیر کے حوالہ کرے اور اسے پھراتے رہیں۔ حتیٰ کہ وہ مدت پوری ہو جائے۔ اھ...... مفصل تحقیق اس مسئلہ کی علامہ شامی کے والد ماجد نے شفاء العلیل میں فرمائی ہے اور تمام کتبِ فقہ میں نفسِ اسقاط باد ائے فدیہ جائز اور ثابت ہے۔ اگر میت نے وصیت کی ہو، اگر نہ کی ہو تو وارث تبرعا کرے اپنے پاس پیسے نہ ہوں تو قرض لے لے۔ ہکذا فی الدراب اسقاط واجب کے طریقے مختلف زمانوں میں یا ملکوں میں مختلف ہیں اور یہ کوئی جرح کی بات نہیں۔ غایۃ الاذکار میں ہے: اہلِ ہند کا طریقۂ اسقاط بھی مذکور ہے جو عام مروج ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا مختصر معروضات کو سامنے رکھتے ہوئے اسے مطلقاً ناجائز کہنا علمی تہی دستی کی انتہا ہے۔[1]

شامیؒ لکھتے ہیں:

ولا ینبغی ان یتساھل فی ھذا الامر فان بہ نجاۃ الانسان من عذاب اللہ تعالیٰ و غضبہ۔ اھ......

سرِ نیاز جھکا کر تو دیکھ اے ظالم!
بہانہ چاہیے یاں تو بس اس کی بخشش کو
بہانہ چاہیے بہرِ کرم ، کرم کے لیے

[1]۔(غایۃ الاذکار۔ص336)

سوال ۱۴

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندرین مسئلہ کہ ہمارے علاقہ میں فساق لوگ اتفاق کر لیتے ہیں کہ عید الفطر کا چاند امسال ہمارے ذمہ ہے اور جھوٹی حلف اٹھا دیتے ہیں۔ کیا اس کا اعتبار جائز ہے؟ اور اس پر عید کر لینی درست ہے؟ بینوا وتو جروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از نورنگ سرائے ضلع بنوں)

جواب

بحرالرائق میں فتح سے نقل کیا ہے کہ حق وہ ہے جو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ اعتبار خبر متواتر آنے کا ہے، ہر طرف سے اور نہر میں ہے کہ تصحیح سراج کے موافق ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے...... **وان لم یکن بالسماء عِلّة لم تقبل الاشهادة جمع كثير يقع العلم بخبر هم وهو مفوض الى رائى الامام**

ترجمہ: اگر آسمان پر بادل نہ ہوں تو جماعت کثیرہ کی گواہی قبول ہوگی۔ جن کے خبر دینے سے یقین حاصل ہو جائے اور جماعت کثیرہ کی مقدار امام کی رائے پر موقوف ہے۔[1]

فتاویٰ قاضی خان میں ہے۔

على هامش الهندية عن محمد رحمة الله تعالىٰ حتى يتواتر الخبر من كل جانب و هكذا روى عن ابى يوسف رحمة الله تعالىٰ

ترجمہ: امام محمد صاحب سے مروی ہے کہ ہر جانب سے خبر متواتر ہو اور یہی رائے امام ابو یوسف صاحب کی ہے۔[2]

۱۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 1 ص 218، باب رویۃ ہلال)

۲۔ (قاضی خان۔ ص 166)

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: **ولوكانت السماء مضحية لايقبل الاقول الجماعة كمافى هلال رمضان**

ترجمہ: اگر مطلع صاف ہوتو جماعت کی بات ہی قبول کی جائے گی جس طرح رمضان کے چاند کا مسئلہ ہے۔[1]

مندرجہ بالا حوالہ جات سے صاف اور واضح ہے کہ اگر مطلع صاف ہوتو عید کا چاند ایسے آدمیوں کی خبر سے ثابت ہوسکتا ہے جن کی خبر سے غلبۃ الظن حاصل ہوجائے اوران کا اتفاق جھوٹ پر محتمل نہ ہو۔ لہٰذا جہاں قاضی کو یقین ہوکہ یہ لوگ جھوٹ پر اتفاق کررہے ہیں اورعادل بھی نہیں تو محض ان کی تعداد کو دیکھ کر یا کسی لالچ وخوف سے ان کی گواہی ہرگز قبول نہ کرے۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ العلیم۔

سوال ۱۵

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنی عورت کو مارا اور کہا کہ ''لوگ تو چھوڑتے ہیں ایک بار، میں نے چھوڑی ہے سو بار''......ان الفاظ سے مغلظہ ہوگی یا بائن یا رجعی؟

جواب

مغلظہ نہیں ہوگی بلکہ ایک طلاق سے بائن ہوگی کیونکہ لفظ ''چھوڑی'' بائن کنائی ہے۔ بائن ہے معناً وقوعاً صریح ہے بوجہ عرف، کما ہو مصرح فی الشامی۔ ھکذا قال مولوی رشید احمد گنگوہی فی فتاویٰ۔ علاوہ ازیں یہ لفظ ہندی ہے، لہٰذا انواع بارک اللہ والے فرماتے ہیں۔

1۔(خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج1 ص248)

جے مونہوں صریح طلاق نہ آکھے نیت کرے طلاق

ایہ لفظ ''حرام'' یا چھوڑن بولے بائن ھے اتفاق

ثالثاً **تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ** (الآیۃ) اور **وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا** آیاتِ الٰہی کا اردو ترجمہ کسی مترجمِ قرآن میں دیکھ لیجئے۔ وہ بلفظ ''چھوڑن'' ملے گا۔

بخاری نے کنائیات کا علیحدہ باب باندھا ہے اور انہیں مندرجہ بالا آیات سے کنائی طلاق ثابت کی ہے۔ لہٰذا البائین لایلحق البائن کا متفق علیہ قانون فقیہہ مقتضی ہے کہ ایک طلاق واقع ہوا اور زید کے کلام کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ''میں نے تجھے چھوڑا ہے، میں نے تجھے چھوڑا ہے''......ھکذا تا صد بار پہلے لفظ چھوڑی سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی اور باقی بوائن اخبار عن الاول ہو کر لغو ہو جائیں گے کیونکہ کنایات بائنہ کے تمام الفاظ انقطاع عن النکاح سے کنایہ ہوتے ہیں۔ کما ورد فی ہدایہ و شامی وغیرھما اور درالمختار و شامی و غایۃ وطحطاوی و فتح القدیر کی یہ عبارت **انت علی حرام الف مرۃ تقع واحدۃ:**

ترجمہ:

تو مجھ پر ہزار مرتبہ حرام ہے تو ایک طلاق واقع ہوگی۔[1]

نص صریح ہے ہمارے مدعا پر کیونکہ الف مرۃ اور بائنہ مرۃ میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں لفظ حرام اور باقی کنایات بائنہ میں یہ فرق ضرور ہے کہ لفظ حرام بوجہ صریح بائن ہونے کے عند المتاخرین علی المفتی بہ نیت کی ضرورت نہیں۔

بخلاف باقی الکنایات ھذا ماقال سیدی و والدی مدظله العالی فی الصورة المسئولة وھذا ھو الحق۔

---

[1]۔(درمختار۔باب الایلاء صفحہ 233 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ لبنان)

سوال ١٦

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اندریں مسئلہ کہ ہمارے شہر میں مسجد کے متعلقہ اراضی جہاں پہلے غسل خانے تھے، پرامام مسجد نے اپنے رہنے کا گھر تعمیر کر لیا ہے۔ مسجد کے غسل خانے اس جگہ سے ہٹا کر اپنے مکان کی پشت کے ساتھ بنائے ہیں۔ اس اراضی غصب شدہ اراضی کا کیا حکم ہے اور غسل خانے گرا کر جو مکان میں شامل کیے گئے ہیں، اس مکان کا کیا حکم ہے؟ بینوا وتو جروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

سورۃ مسئولہ میں وہ اراضی جو شاملاتِ دہ ہے، اور اہلِ محلہ کے اتفاق سے ضروریاتِ مسجد کے لیے اس پر قبضہ کرلیا گیا ہے، وہ شرعاً تو وقف نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وقف کے لیے شرائط اور ارکان ہیں۔

کما قال صاحب الدرج کتاب الوقف و محله المال المتقوم ورکنه الالفاظ الخاصة کارضی هذه صدقة موقوفة موبدة علی المساکین و نحوه من الالفاظ۔ الخ......

ترجمہ: درمختار میں ہے کہ اس کا محل قیمت والا مال ہے۔ اور اس کا رُکن خاص الفاظ ہیں جس طرح کہ کوئی شخص کہے میری یہ زمین ہمیشہ مسکینوں پر صدقہ اور وقف ہے اور اس قسم کے اور الفاظ۔[۱]

لیکن چونکہ وہ اراضی ضروریاتِ مسجد کے لیے مسجد کی حویلی کے اندر تھی اور اس پر یہ تصرف ناجائز اور غصب ہے۔ لہٰذا اس جگہ کی قیمت یا اس کے بدلہ اس سے بہتر قطع اراضی

۱۔(درمختار، کتاب الوقف صفحہ 369، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ لبنان)

جو مسجد کے مصالح میں کام آئے، تبدیل کر کے مسجد کے مصالح میں صرف کی جائے۔

درمختار میں ہے: **ویفتی بالضمان فی غصب عقار الوقف و منافعه۔**

ترجمہ: وقف کی زمین اور منافع کو غصب کرنے پر ضمان کا فتویٰ دیا جائے گا۔ یعنی وقف کی زمین غصب کرنے والے شخص پر تاوان لازم ہوگا۔[1]

... و هکذا فی الهندیة قال غصب ارض الوقف غاصب و اجریٰ علیها الماء حتی صاء بحراً یضمن قیمته و یشتری بالقیمة ارض اخریٰ ویکون وقف مکانها۔ الخ......

ترجمہ: ہندیہ میں ہے کہ کسی شخص نے وقف والی زمین پر غصب کی اور اس پر پانی جاری کر دیا یہاں تک کہ سمندر بن گیا تو یہ (غاصب) اس کی قیمت کا ضامن ہوگا اور اس قیمت کے بدلے دوسری زمین خریدی جائے گی اور یہ پہلی زمین کی جگہ وقف ہوگی۔[2]

باقی اس مکان کو گرا کر اور غسل خانے پھر پہلی جگہ بنانے میں مسجد کے لیے کوئی مصلحت نہیں، اس لیے یہ درست نہیں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالحقیقۃ

سوال ۱۷

ما قولکم رحمکم اللہ اندریں مسئلہ کہ زید نے کہا اگر میں اپنی عورت سے جماع کروں تو تین طلاق واقع ہوں، پھر اس کے بعد پورے نو ماہ گزرنے پر اس عورت سے جماع کر لیا۔ اب وہ عورت مطلقہ بائنہ ہو گیا یا مغلظہ ہوگی؟ بینوا و توجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از شاہ پور)

---

[1]۔ (درمختار، کتاب الوقف، ص 276 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ لبنان)

[2]۔ (فتاویٰ ہندیہ (عالمگیری) ج 2، ص 256)

جواب

صورتِ مسئولہ میں زید کا یہ قول ایلاء ہے۔

ہندیہ میں ہے: **الایلاء منع النفس عن قربان المنکوحة منها موکداً بالیمین بالله او غیره من طلاق و عتاق ۔** الخ......

ترجمہ: کسی شخص کا اپنے آپ کو قسم یا اس کے علاوہ طلاق اور عتاق وغیرہ کے ذریعے منکوحہ روکے رکھنا ایلاء کہلاتا ہے۔[1]

چار ماہ کی مدت بغیر وطی گزرنے کے ایک طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی۔

الدر المختار: **ان لم یقربها بانت بواحدة بمضیها۔**

ترجمہ: درمختار میں ہے کہ اگر اس کے قریب نہ گیا تو ایلاء کی مدت گزرنے کے بعد عورت پر ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی۔[2]

ولو قال لها ان قربتک ابدا فانت طالق ثلاثا فلا حیلة له فی هذا لانه ان قربها تطلق ثلاثا و ان لم یقربها یقع علیها بمضی اربعة اشهر تطلیقة ۔

ترجمہ: اگر عورت کو کہا کہ اگر میں تیرے قریب آؤں تو تجھے تین طلاق ہیں تو اب اس کے لیے کوئی حیلہ نہیں کیونکہ اگر عورت کے قریب جائے گا تو اس پر تین طلاقیں واقع ہو جائینگی اگر اس کے قریب نہ گیا تو چار ماہ گزرنے کے بعد طلاق واقع ہو جائیگی۔

پھر پورے نو ماہ کے بعد جو وطی ہوئی ہے، وہ بائنہ طلاق کی عدت گزر جانے کے بعد ہوئی ہے اور ملک کا بطلان یمین کو باطل نہیں کرتا۔

کنزالدقائق میں ہے: **زوال الملک لا یبطل الیمین فاذا وجد الشرط فی**

---

[1] ۔(الفتاویٰ الھندیہ، ج 1، ص 509 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان)

[2] ۔(درمختار باب الایلاء ص 232، مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

الملک طلقت وانحلت۔الخ......

ترجمہ: ملک کا زائل ہونا یمین کو باطل نہیں کرتا جس وقت ملک میں شرط پائی جائے تو عورت طلاق والی بھی ہوجائے گی اور یمین ختم ہوجائے گی۔[1]

لہٰذا تین طلاقیں لغو ہوجائیں گی اور فقط تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ العلی العظیم۔

سوال ۱۸

یہ وہ سوالات ہیں جو فیصلہ ثالثی نکاح سکنہ شہباز والا میں درپیش آئے جن کے جوابات یہاں تحریر کردینے مفید معلوم ہوتے ہیں۔(شوقؔ)

۱۔ گواہ اگر فاسق ہوں تو نکاح ان کے حضور کے وقت منعقد تو ہوجاتا ہے لیکن قاضی کے نزدیک ان کی شہادت سے اثبات نکاح بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۲۔ گواہ اگر ایک قبل ادائے شہادت مرچکا ہے اور دوسرا زندہ ہے تو ایک کی شہادت سے بھی اثبات نکاح ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۳۔ گواہ مدعی اور مدعی علیہ کی عدم موجودگی میں کسی عالمِ دین کے پاس ادائے شہادت کر کے ثبوت نکاح کا حکم لے سکتا ہے یا نہیں؟

۴۔ اقرار بالنکاح سے نکاح ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اقرار خواہ صادق ہو یا کاذب، مقر خاوند ہو یا باپ؟

۵۔ گواہی یاد نہ رکھتے ہوئے صرف اپنے خط کو دیکھ کر بھی کوئی شخص گواہی دے سکتا

۱۔(کنزالدقائق صفحہ 151، مطبوعہ مکتبۃ الحسن لاہور)

ہے یا نہیں؟

۶۔ تحمیلِ شہادت کے شرائط مفقود ہوں تو پھر شہادت علی الشہادت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

۷۔ فضولی کا قبول نکاح صغیر کے لیے جو اس کا بھائی ہے اور نابالغ ہے اور باپ زندہ ہے، صحیح ہوگا یا نہیں؟

۸۔ اب ماجن معروف بسوء اختیار جو صغیرہ کا نکاح محض طمع کیلئے کردے، صحیح ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۹۔ صغیرہ اب ماجن کے کئے ہوئے نکاح کو بعد البلوغ رد کرسکتی ہے یا نہیں؟

۱۰۔ صغیرہ کی پرورش کا خرچہ کتنی مدت تک پرورش کنندہ صغیرہ کے باپ یا وارثان سے لے سکتا ہے؟

بینوا وتوجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

۱۔ فاسق کی گواہی سے اثباتِ نکاح عند القاضی نہیں ہوسکتا۔ بحر الرائق میں ہے

واذا انعقد بحضور الفاسقين وان لم يقبل اداءهم عند القاضی،

ترجمہ: فاسق گواہوں کی موجودگی میں نکاح منعقد ہوجائے گا اگرچہ قاضی کے پاس اس کی ادائیگی قابل قبول نہ ہوگی۔[1]

والعدالة لوجوبه لا لصحته۔ ترجمہ: عدالت اس (نکاح کے) وجوب کے لیے ضروری ہے صحت کے لیے ضروری نہیں۔[2]

---

[1]۔ (بحر الرائق، کتاب النکاح، ج3 ص158، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان)

[2]۔ (درمختار، کتاب الشھادہ، ج3 ص484۔ مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

وھکذافی الخلاصة

ترجمہ:اسی طرح خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے۔[1]

۲۔ ایک آدمی کی گواہی سے قطعاً اثباتِ نکاح نہیں ہوسکتا خواہ وہ عادل ہی کیوں نہ ہو، حلف بھی کیوں نہ اٹھاوے۔

درمختار میں ہے۔**ونصابھار جلان اورجل وامرتان۔**

ترجمہ: گواہی کا نصاب دومرد یا ایک مرداور دوعورتیں ہیں۔[2]

۳۔ اگرکوئی آدمی کسی عالمِ دین کے پاس فتویٰ لینے کے لیے یا اظہارِواقعہ کے طور پر اپنی شہادت پیش کرے تو وہ مولوی صاحب دوسری جگہ اظہاراورالزام کے لیے گواہی نہیں دے سکتے کیونکہ تحمیل کے لیے خاص شرائط ہیں۔

درالمختار میں ہےاورنہ ان کی اس شہادت سے اثبات اورالزام ہوسکتا ہے۔[3]

۴۔ اقرارِنکاح سے نکاح ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اقرار کے وقت نئے ایجاب کا ارادہ اوردوسرا اس وقت ''قبول'' کہہ دے تو نکاح ثابت ہوجائے گا۔فقط اقرار کچھ حقیقت نہیں۔ ہاں اگر گواہ یا عورت تصدیق کرے پھر بھی اقرار منظور ہوگا۔

قاضی خان میں ہے۔ **ولی الصغیرا و الصغیرة اذا قال زوجت الصغیراوالصغیرةامس لایصدق الا بالبینة او بتصدیق الصغیر بعدالبلوغ عندابی حنیفة**

ترجمہ: نابالغ بچے یا بچی کے ولی نے کہا کہ میں نے بچے یا بچی کا نکاح کیا تو اس

---

[1]۔(خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج4ص79)

[2]۔(درمختار، کتاب الشھادۃ ص484،مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان)

[3]۔(درالمختار۔باب شہادت علی شہادت۔ص63)

کی گواہوں کے بغیر تصدیق نہیں کی جائے گی ہاں اگر صغیر (بچہ) بالغ ہونے کے بعد اس کی تصدیق کر دے تو امام صاحب کے نزدیک (اس کی بات تسلیم کی جائے گی)۔[1]

ھکذا فی الھندیة اسی طرح فتاویٰ ہندیہ المعروف فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔[2] **والدر المختار** (اور اسی طرح در مختار میں ہے)۔[3]

بحر میں ہے۔ **اقر الولی بالنکاح لا یجوز الا بالشھادة او بتصدیقھا۔**

ترجمہ: اگر ولی نے نکاح کا اقرار کیا تو اس کا اقرار گواہی یا تصدیق کے بغیر قبول نہیں ہوگا۔[4]

بحر الرائق میں ہے **لم ینعقد النکاح بالاقرار لان الاقرار اظھار لیس بانشاء**......الخ

ترجمہ: نکاح اقرار کے ساتھ منعقد نہیں ہوگا کیونکہ اقرار نکاح کا اظہار ہے نکاح کا انشاء نہیں ہے۔[5]

۵۔ اگر کسی شخص کو واقعہ یاد نہیں لیکن خط اپنا پہچان کر واقعہ کی شہادت دیتا ہے تو یہ ناجائز ہے۔ در مختار میں ہے **وَلا یشْھَدُ من رئی خطه ولم یذکرھا**الخ......

ترجمہ: جس شخص نے اپنے خط کو دیکھا حالانکہ اس کو واقعہ یاد نہیں تو وہ گواہی نہ

---

[1]۔(فتاویٰ قاضی خان، ج1 ص301، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان)

[2]۔(فتاویٰ عالمگیری۔ص273)

[3]۔(در مختار، باب الولی ج2 ص7)

[4]۔(بحر۔ ج3۔ص119)

[5]۔(بحر الرائق، ج3 ص89)

دے گا۔[1]

۷۔ اگر بھائی نے نابالغ کی طرف سے قبول کیا ہے اور باپ زندہ ہے اور اس نے بھی قبول نہیں کیا تو وہ پہلا فضولی ہے، والی نہ رہے گا اور فضولی کی عقد کے لیے مجیز کی ضرورت ہے یعنی جو اس وقت اجازت پر قادر ہو اور نابالغ ظاہر ہے کہ اجازت پر قادر نہیں لہذا یہ قبول لغو ہو جائے گا۔[2]

۸۔ اب ماجن جس کا فسق معروف ہو، اس واقعہ میں فسق کا تحقق کافی رہتا ہے۔ اگر معروف بالفسق والسوء اختیار رہے۔ پھر تو اس کا نابالغہ لڑکی کا نکاح کر دینا جس میں طمع اور لالچ کے لیے لڑکے یا لڑکی کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے، ناجائز ہو گا۔

علامہ ابن عابدین علی حواشی البحر میں ہے **وفی شرح المجمع حتی لو عرف من الاب سوء الاختیار سفهه و طمعه لایجوز عقده اجماعًا۔** الخ

ترجمہ: شرح مجمع میں ہے یہاں تک کہ اگر باپ سے برا اختیار یعنی اس کی بیوقوفی اور لالچ مشہور ہے تو اس کا عقد کرنا جائز نہیں۔[3]

فتح القدیر میں ہے: **لو کان معروفا بذلک فسقا و مجانة فالعقد باطل علی۔الخ...**

ترجمہ: یعنی اگر وہ برے اختیار کے ساتھ بے باکی اور فسق میں مشہور ہے تو عقد باطل ہو گا۔[4]

---

[1]۔ (درالمختار۔ج3 ص57، کتاب الشھادات)

[2]۔ (درالمختار۔ج3 ص18 فصل فی الفضولی)

[3]۔ (شرح مجمع۔ج2 ص330)

[4]۔ (فتح القدیر۔ج3 ص194 ،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ)

اسی طرح درمختار میں ہے۔[1]

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ **غاب الولی او عضل اوکان الاب والجد فاسقا فللقاضی ان یزوجھاکفِ اھ...**

ترجمہ: اگر ولی غیب ہوگیا یا اس نے تنگ کرنا شروع کیا یا باپ دادا فاسق ہیں تو قاضی کو اختیار ہوگا کہ عورت کا نکاح اس کے کفو میں کردے۔

وفی البدائع ھکذا (ترجمہ: بدائع میں اسی طرح ہے)۔[2]

(فان قیل) صاحب ہدایہ کی کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبین کا مسلک ہے۔ امام صاحب کے نزدیک نکاح لازم ہوجائے گا۔ اور مندرجہ بالا حوالہ جات کتب مسئلہ کے متفق علیہ ہونے پر دال ہیں۔ فما جوابکم۔ اقول: اختلاف اس وقت ہے جبکہ باپ اپنی لڑکی صغیرہ کا نکاح غیر کفو میں یا بغیر مہر کے یا فاسق کے ساتھ اس لیے کردے کہ اس میں لڑکی کے لیے کوئی مصلحت یا فائدہ نظر آتا ہے تو نکاح ہوجائے گا

اور صاحبین کہتے ہیں کہ جب صورتاً صاف ظلم ہے تو شفقت مظنونہ کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اور اگر باپ نے عمداً اور ظلماً اپنے نفع کے لیے یا بے پروائی سے ایسا کردیا ہے تو بالاتفاق نکاح باطل ہوگا۔ وجیز کردی میں ہے۔ **و المختلف بین الامام وصاحبیه فیما اذا علم الاب عدم الکفاء ۃ و مع ذلک زوجھا منه و یشھده التعلیل و ھو قولھم انه انما ترک الکفاء ۃ لمصلحۃ تفوتھا و من علم منه المجانۃ او عدم العلم بحاله لایتاتی فیه ھذه العلۃ ولذلک قالوا اذا زوج السکران بنته و نقص عن مھر المثل اوزوج السکران ابنه وزاد علی مھر المثل لایصح اجماعا**

---

[1] ۔(درمختار۔ج2ص5)

[2] ۔(بدائع۔ ص245)

لان السکران لا یتاتی منه ماذکرنا اھ۔

ترجمہ: امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اختلاف اس وقت ہے جب باپ کفو کے نہ ہونے کو جانتا ہو اور اس کے باوجود اس کا نکاح اس (یعنی مرد) سے کر دیا اس کی دلیل وہ تعلیل بھی ہے کہ بہر حال کفو کو مصلحت کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے اور جس شخص سے بے پرواہی یا اس کے حال کی لاعلمی جانی گئی ہو تو اس میں یہ علت حاصل نہیں ہوگی اسی وجہ سے علماء کرام نے فرمایا کہ جب نشے والے شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح اور اس کے مہر مثلی میں کمی کی یا نشے والے شخص نے اپنے بیٹے کا نکاح کیا اور مہر مثلی میں زیادتی کی تو یہ بلا تفاق صحیح نہیں ہوگا کیونکہ نشے والے شخص سے وہ چیز جس کو ہم نے ذکر کیا وہ حاصل نہیں ہوتی۔

(فان قیل) علامہ شامی فرماتے ہیں اگر لڑکی نے وہ نکاح بعد البلوغ رد کر دیا ہے تو اس صورت میں نکاح باطل ہوگا ورنہ نہیں۔ ہاں قضا شرط نہیں۔ اھ۔ اور مندرجہ بالا شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح منعقد بھی نہیں ہوگا جیسا کہ لایصح وغیرہ الفاظ سے ظاہر ہے۔ فما التوفیق۔

اقول: متون تمام مطلق ہیں اور شروح بھی اور فتاویٰ بھی، لہٰذا رد اور رضا کا فرق اس صورت میں ہے جبکہ باپ نے اپنی طرف سے تو سوچ سمجھ کر کام کیا ہے مگر درحقیقت وہ خلاف تھا تو اس وقت لڑکی کے رد کی ضرورت ہوگی۔

وجیز میں ہے: **زوج بنته الصغیرة من رجل ظنه مصلیاً لا یشرب مسکرا فاذا هو مد من فقالت بعد الکبر لا ارضی بالنکاح فالنکاح باطل**

ترجمہ: کسی شخص نے اپنی چھوٹی بیٹی کا نکاح ایسے مرد کے ساتھ کیا کہ جس کو وہ نمازی گمان کرتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی گمان کرتا ہے کہ یہ شرابی نہیں ہے حالانکہ وہ شراب کا عادی ہے پھر اس عورت نے بڑا ہونے کے بعد کہا کہ میں اس نکاح سے راضی نہیں ہوں تو

نکاح باطل ہے۔[1]

۔۔۔ و ھکذا فی البحر نعم اذاکان تھتکا لا ینفذ تزویجه ایاھا وکذا فی الفتح ۔اھ......اور اسی طرح بحر الرائق میں ہے کہ جب نکاح رسوائی کا سبب ہوتو اس کا نافذ کرنا جائز نہیں ہے[2]......ھذا ما عندی والعلم عند اللہ الکبیر

سوال ۱۹

کیا سونے کے بٹن یا زنجیری کپڑوں میں لگانی جائز ہے یا نہیں؟

بینوا وتو جروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔(سائل از رسول نگر)

جواب

ہاں جائز ہے۔ درمختار میں ہے **باب الحظر والاباحة فصل فی اللبس و فی التاتار خانیه عن سیر الکبیر لا باس بازرار الدیباج** اھ......[3]

دانت ٹوٹا ہوا ہو یا گھڑی کی زنجیر یا ناک وغیرہ کی ضرورت پڑ جائے تو سونے کا لگانا جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۲۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید مرض اسہال میں سخت بیمار تھا۔ اس

---

[1]۔(الوجیز۔ص 116)

[2]۔(بحر الرائق۔ص 124)

[3]۔(درمختار۔کتاب الحظر والاباحۃ فصل فی اللبس صفحہ 653 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان)

کی عورت نے دیکھا کہ وہ لحاف کو دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔ اس نے منع کیا تو بیمار نے نہایت فحش گالیاں دیں اور کہا کہ میں نے تجھے تین طلاق سے چھوڑا ہے۔ عورت کو مارنے کیلئے کھڑا ہوا مگر چارپائی سے ناطاقتی کی وجہ سے عریاں ہوکر گر پڑا اور پھر ننگا ٹخنوں کے بل اوندھا پڑا رہا۔ پھر دوسرے دن بعض لوگوں کے سامنے اس نے ذکر کیا کہ میں نے طلاق دے دی ہے۔ اب زید مذکور کہتا ہے کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ میں نے کیا کہا، صرف اتنا یاد ہے کہ کچھ بکواس کرتا رہا۔ طلاق مجھے یاد نہیں۔ اوپر والے کہتے ہیں کہ تم نے طلاق بھی کہی ہے۔ بینوا وتو جروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔ (سائل از جال)

جواب

اصل جواب سے پہلے مختصر تمہید کے طور پر چند فوائد کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ جواب کا سمجھنا آسان ہوجائے۔ واللہ ولی التوفیق اولیٰ شامی میں ہے...... **قال ابن قیم ان طلاق الغضبان علی ثلثة اقسام احدھا ان یحصل لهٗ مبادی الغضب بحیث لایتغیر عقله ویعلم مایقول ویقسده وھذا لا اشکال فیه (یعنی ینفذ طلاقه) الثانی ان یبلغ النهایة فلا یعلم مایقول ولا یریده فهذا لاریب فیه انه لاینفده شیٔ من اقواله (کالمدھوش) الثالث من توسط بین المرتبتین بحیث لم یصر کالمجنون فهذا محل النظر والادلة تدل علی عدم نفوذ اقواله**

ترجمہ: فتاوی شامی میں ہے کہ ابن قیم نے کہا کہ غصہ کی تین قسمیں ہیں۔

1۔ اس طرح غصہ آئے کہ اس کی عقل متغیر نہ ہو اور وہ جو کہتا ہے اسے جانتا ہے اور وہ اس کا ارادہ کرتا ہو۔ اس شخص کی طلاق نافذ ہونے میں کوئی اشکال نہیں (یعنی طلاق واقع ہوجائے گی)

2۔ غصہ انتہا تک جا پہنچے وہ جو کہتا ہے اس کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس کا ارادہ کرتا

ہے۔تو اس صورت میں اس کی طلاق واقع نہ ہونے میں کوئی شک نہیں (یعنی اس کی طلاق واقع نہ ہوگی)۔اوراس کے اقوال میں سے کوئی چیز نافذ نہ ہوگی

3۔دونوں مرتبوں کے درمیان والی صورت اس طرح ہے کہ وہ مجنون کی طرح نہیں یہ محل نظر ہے اور دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس کے اقوال نافذ نہیں ہوں گے

ثم قال الشامی والذی یظهرلی ان کلا من المدهوش والغضبان لایلزم فیه ان یکون بحیث لا یعلمهم مایقول بل یکفتی فیه بغلبة الهذیان واختلاط الجد بالهزل کما هو المفتی به فی السکران علی مامر ولا ینافیه تعریف الدهش بذهاب العقل فان الجنون فنون ولذافسره فی البحر باختلال العقل و ادخل فیه العته وابرسام والاغماء والدهش ویوید ما قلنا قول بعضهم العاقل من یستقیم کلام وافعاله الا نادرا والمجنون ضده وایضا فان بعض المجانین یعرف مایقول وریده و یذکر مایشهد الجاهل به بانه عاقل ثم یظهر منه فی مجلسه ماینافیه فاذاکان المجنون حقیقةً قد یعرف مایقول و یقصده فغیره بالاولی فالذی ینبغی التعویل علیه فی المدهوش ونحوه اناطة الحکم بغلبة الخلل فی اقواله وافعاله الخارجة عن عادته وکذا یقال فیمن اختل عقله لکبر اولمرض اولمصیبة فاجئَةٍ فمادام فی حال غلبة الخلل فی الاقوال والافعال لا تعتبر اقواله وان کان یعلمها ویریدها لان هذه المعرفة والارادة غیر معتبرة لعدم حصولها عن إدراک صحیح کما لاتعتبر من الصبي العاقل انتهی کلام

میرے لیے جو امر ظاہر ہوا کہ مدہوش اور غصے والے شخص میں سے ہر ایک میں یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ایسا ہو کہ جو کہے اس کو نہ جانتا ہو بلکہ اس میں غلبہ ہزیان (غیر معقول

باتیں) اور مذاق پر اکتفاء کیا جاتا ہے جس طرح کہ سکران (نشے والے شخص) میں یہ مفتٰی بہ ہے۔

دہش کی تعریف عقل کے چلے جانے سے کرنا اس کے منافی نہیں کیونکہ جنون کی قسمیں ہیں (ولذا افسرہ باختلال العقل) اس وجہ سے البحر میں اس کی تفسیر عقل میں خلل سے کی ہے اس میں (عتہ) یعنی بے وقوفی اور بے ہوشی کو عقل میں داخل کیا ہے اور ہماری بات کی تائید ان میں سے بعض کا قول کرتا ہے کہ عاقل وہ ہوتا ہے جس کا کلام اور افعال درست ہوں مگر کبھی کبھی درست نہ ہوں۔ مجنون اس کی ضد ہے یہ بھی ہے کہ بعض مجنون جو کہتے ہیں اسے پہچانتے ہیں اور وہ اس کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس کے علاوہ تو بدرجہ اولی ایسا ہو سکتا ہے مدہوش وغیرہ میں جس پر بھروسہ کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ حکم کا دارومدار غلبہ خلل پر ہو اس کے اقوال اور افعال میں ہوتا ہے جو اس کی عادت سے خارج ہے اسی طرح اس آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے جس کی عقل بڑھاپے یا مرض کی وجہ سے خلل والی۔ جب اقوال اور افعال میں خلل کے غلبہ کی حالت ہو تو اس کے اقوال معتبر نہیں ہونگے اگرچہ وہ ان کو جانتا ہو اور ان کا ارادہ کرتا ہو کیونکہ یہ معرفت اور ارادہ غیر معتبر ہے کیونکہ یہ معرفت ادراک صحیح سے حاصل نہیں ہوتی جس طرح عقل مند بچے سے معرفت کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔[1]

الفائدة الثانیه قال الشامی فی الحاوی الزاهدی ظن انهٗ وقع الثلاث علٰی امرأتهٖ بافتاء من لم یکن اهلاً للفتویٰ وکلف الحاکم کتابتها فی الصک فکتبت ثم استفتٰی ممن هو اهل للفتویٰ فافتی بانهٗ لا تقع و التطلیقات الثلاث مکتوبة فی الصک بالظن فلهٗ ان یعود الیها دیانة ولٰکن لا یصدق فی الحکم

ترجمہ: الحاوی زاہدی میں ہے خاوند نے گمان کیا کہ تین طلاق اس کی بیوی پر واقع

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص463،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

یہ اُس آدمی کے فتویٰ کی بناء پر تھا جو فتویٰ دینے کا اہل نہیں تھا۔ حاکم نے اقرار نامہ میں ان کی کتابت کا حکم دے دیا تھا تو انہیں لکھ لیا گیا پھر اُس نے اس سے فتویٰ پوچھا جو فتویٰ دینے کا اہل تھا اس نے فتویٰ دیا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی جب کہ گمان کی وجہ سے اشٹام میں لکھی ہوئی ہیں تو خاوند کو دیانۃ حق حاصل ہے کہ اس عورت کی طرف رجوع کرے (**لکن لا یصدق فی الحکم**) یعنی حکم میں اس کی تصدیق نہ کی جائے گی۔[1]

فتاوی شامی: ولو اقر بالطلاق کاذبا او ھازلا وقع قضاء لا دیانۃً۔

ترجمہ: اگر طلاق کا جھوٹ اور مذاق کے طریقہ سے اقرار کیا تو قضاء طلاق ہو جائے گی دیانۃ نہ ہوگی۔[2]

نقل عن البزازیه والقنیة لو اراد به الخبر عن الماضی کذبا لا یقع دیانةً و قضاء ایضاً۔اھ

ترجمہ: پھر بزازیہ اور قنیہ سے نقل ہے اگر اس نے زمانہ ماضی میں جھوٹی خبر کا ارادہ کیا تو دیانۃ طلاق واقع نہ ہوگی اگر اس سے قبل اس پر گواہ بنائے تو قضاء بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔[3]

وقال صاحب التحفة: لا تطلق دیانة اھ وما في التحفة لا یخالف ما قبله لأن المراد طلقت قضاء فقط، لما مر من أنه لو أخبر بالطلاق کاذبا لا یقع دیانةً اھ ک

ترجمہ: صاحب التحفہ نے کہا کہ دیانۃ طلاق واقع نہ ہوگی اور جو تحفہ میں ہے وہ ماقبل

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی، جلد 2 صفحہ 461، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

[2]۔ (فتاویٰ شامی۔ جلد 2 ص 457، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

[3]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج 2 ص 459 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

کے مخالف نہیں کیونکہ (طُلّقت) سے مراد قضاء طلاق ہے فقط اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر جھوٹی خبر دی تو دیانۃ طلاق واقع نہ ہوگی۔[1]

فائدة رابعه ان الحكاية لا تقع به الطلاق اصلا و الاتصير المرأة بالطلقة الو احدة مغلظة مثلا لوقال رجل لامرته انت طالق فسئل عن زيد العالم قلت لامراتی انت طالق ثم سال عن عمر العالم ولكن فلو وقع بالحكاية لصارت التطليقات ثلاثة وهو باطل۔۔۔الخ

ترجمہ: چوتھا فائدہ یہ ہے کہ حکایت کے ساتھ طلاق واقع نہ ہوگی بالکل ورنہ عورت ایک ہی طلاق سے مغلظہ ہوجائے گی مثلاً اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو کہا کہ اَنْتِ طالق یعنی تجھے طلاق ہے (فسئل) پھر زید جو کہ عالم تھا اس سے پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو اَنْتِ طالق (یعنی تجھے طلاق ہے) کہا پھر عمر سے پوچھا اگر حکایت سے طلاق واقع ہوئی تو تین طلاقیں واقع ہوجاتی حالانکہ یہ باطل ہے۔

قال الشامی فی تحت قول الدرواما الطلاق فيقع بالالفاظ المصحفة ولايصدق الا اذا شهد على ذلك قبل التكلم بان قال امرءتی تطلب منی الطلاق وانا لااطلق فاقول هذاو لا فرق بين عالم و جاهل اه . . .

ترجمہ؛اور بہرحال الفاظ مصحفہ کے ساتھ طلاق قضاء واقع ہوجائے گی اور اس کی تصدیق نہ کی جائے گی۔مگر کلام کرنے سے پہلے اس پر گواہ بنائے اس طرح کہ وہ کہے میری بیوی نے مجھ سے طلاق طلب کی میں نے اس کو طلاق نہ دی اور میں نے یہ الفاظ کہے تو اس بات میں عالم اور جاہل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔[2]

۱۔(فتاویٰ شامی،جلد2 ص466،باب الصریح)

۲۔(فتاوی شامی۔ج2 ص294 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

الفائدة السادسة ، متی اخر شاهد الحسبة شهادته بلا عذر فسق فترد کطلاق امرءۃٍ بائناًوعتق امة وتدبیرهاالخ...

ترجمہ: جب شاھد حسبہ نے اپنی شہادت کوفسق والے عذر کے بغیر مؤخر کیا تو اس کی گواہی کو رد کیا جائے گا۔جس طرح کہ اس کی بیوی کی طلاق (بائن) اور باندھی کو آزاد کرنا اوراس کو مدبر بنانا۔[1]

فتاوی شامی میں ہے: **والمراد بشاهد الحسبة الشهادة فی حقوق اللّٰه و السرفیه انه لا حاجة ههنا الی الدعوی فلا عذر له ای للموخر فی التاخیر بل یجب علیه ان یذهب الشاهد الی العالم و یطلعه علی الطلقات سواء دعت المرءة،اولا الخ...**

ترجمہ: شاہد حسبہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق میں گواہی دینا ہے اوراس کے اندر راز والی بات یہ ہے کہ یہاں دعویٰ کی ضرورت نہیں لہٰذا گواہی کے مؤخر کرنے والے کے لیے یہاں کوئی عذر نہیں بلکہ اس کے لیے عالم کی طرف جانا اوراس کو طلاق پر مطلع کرنا ضروری ہے۔برابر ہے کہ عورت دعوی کرے یا نہ کرے۔[2]

الفائدة السابعه، ثم الافتاء فی زماننا فافهم یفتون کانهم قضاة غیر جائز لهم فان المفتی یجب علیه الحکم بمسئلة الدیانة و لا یجوزله الحکم بمسئالة القضاء والدلیل علی ان الفرق القضاء والدیانة کان فی السلف ایضا مااخرجه الطحاوی[3]

---

[1]۔(درمختار۔ج2ص483 کتاب الشھادۃ،مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

[2]۔(ملخص الفتاوی شامی،ج4ص412)

[3]۔(الطحاوی۔ج2ص250)

او کلام المحدث الکشمیری فی عرف الشذی [1]

مندرجہ بالا فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر حالف مذکور سے بیمار ہونا، لحاف کاٹنا، گالیاں دینا، ننگا پھرنا، دو مردوں کا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی بصورت دیگر تحلیل کا حکم ہوگا۔

ھکذا، قال سیدی ووالدی مدظلہ العالی وحقہ حق التحقیق واللہ ولی التوفیق وھو خیر رفیق (ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ۔)

سوال ۲۱

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید نے عورت کے ساتھ تنازعہ کرتے ہوئے کہا، ''میں نے چھوڑی ہے، چھوڑی ہے، اللہ کے حکم نال چھوڑی ہے'' تو کیا مغلظہ ہوگی یا نہیں؟ تحلیل کی ضرورت ہوگی یا تجدید نکاح کافی ہے؟ بینوا توجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

گو یہ مسئلہ علماء میں مختلف فیہ ہے کہ لفظ ''چھوڑی ھے'' کنائی ہے یا صریح۔ مولوی عبدالحئی نے صریح لکھا ہے لیکن یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ اس کے صریح ہونے کی کوئی صحیح دلیل نہیں پیش کر سکے۔ حق یہ ہے کہ کنائی ہے۔ **ھکذا قال رشید احمد گنگوھی و مجتھد لکھنوی و مخدوم ھاشم و صرح بہ صاحب انواع بارک اللہ و غایۃ الاوطار وصاحب الخلاصۃ نقل عن مجموع النوازل و المحیط قال لا یقع باللفظین** (یعنی رہا کردم وغیرہ) **الا واحدۃ**

---

[1]۔(الشذی۔ص412و413)

خلاصۃ الفتاوی میں ہے دولفظوں یعنی رہا کردم وغیرہ سے ایک طلاق واقع ہوگی[1]

وقال مجتھد ان ''چھوڑا ہے'' من کنایات الطلاق البائین بمعنی سرحتک لایحتمل الرد والسب وھو فی الغضب طلاق بائن والتکرار تاکید لایلحق الموکد الموکد یعنی یحتاج الزوج اِے تجدید النکاح لا الی تحلیل ولا رجوع

ترجمہ: مجتھد نے کہا بے شک لفظ، چھوڑا ہے، طلاق بائن کے کنایات میں سے ہے اورتکرار تاکید ہے جو موکد کو موکد لاحق نہیں ہوتا یعنی زوج تجدید نکاح کا محتاج ہوگا اور حلالہ اور رجوع کا محتاج نہیں ہوگا۔ **اذ یقال فی الھندیۃ . . .**

گھوڑے کو چھوڑا ہے را کبہ میں یا تر یمت کوں چھوڑا ہے ڈیرہ میں **وھو الساکن بغیرہ** اور صریح ہندی اور عربی لفظ طلاق ہے۔ اھ

ثانیاً حالف مذکور نے جیسا کہ اس کی عورت مدعیہ طلاق نے میرے روبرو مذکورہ بالا الفاظ کی تصدیق کی ہے، لفظ ''چھوڑی ہے'' کو عورت کی طرف قطعاً مصاف نہیں کیا حالانکہ طلاق کی اضافت عورت کی طرف ایقاع طلاق کے لیے شرط ہے۔ کما حررہٗ صاحب الدر اور یہاں قطعاً نہ طلاق کا لفظ ذکر کیا گیا نہ عورت کی طرف ''چھوڑی'' کی اضافت کی گئی ہے۔

ثالثاً لفظ ''چھوڑی ہے'' یہ خبر بالطلاق ہے۔ **مفتی کفایت اللّٰہ دھلوی فی فتواہ**

فتاوی شامی میں ہے: **لو اخبر بالطلاق کاذبا لایقع دیانۃً وقال فی ایمان البزازیۃ المفتی یفتی بالدیانۃ والقاضی یقضی بالظاھر و کذا صرح بہ محمد انور الکشمیری فی العرف۔**

ترجمہ: اگر طلاق کی جھوٹی خبر دی تو طلاق دیانۃ واقع نہیں ہوگی اور بزازیہ میں ہے

---

[1]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج2 ص98)

کہ مفتی دیانت پر فتوی دے اور قاضی ظاہر پر فیصلہ کرے۔[1]

رابعاً ، **اذا تکلم متکلم بکلام فمهما امکن جعله اخبارا جعل اخبارا ولا یصار الی الانشاء الا بالضرورة هکذا حررهٔ صاحب الدر فجعل لفظه الثانی ایضاً اخبارا عن الاول کانت بائن بائن فلا یضره تکرار لفظ چهوڑی لانه ثبت کنائیته ویقع بالکنائیة طلاقا واحدا بائناً بشرط النیة وهذا مراد قولهم البائن لا یلحق البائن**

ترجمہ: جس وقت متکلم نے کوئی کلام کیا جب تک اس کو خبر بنانا ممکن ہو تو اس کو خبر بنایا جائے گا اور انشاء کی طرف بغیر ضرورت کے رجوع نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح صاحب در مختار نے اس کو تحریر کیا اور دوسرے لفظ کو پہلے سے خبر بنایا جس طرح کہ انت بائن بائن تو اس کو لفظ چھوڑی کا تکرار نقصان نہیں دے گا کیونکہ اس کا کنایہ ہونا ثابت ہے اور کنایت کے ساتھ ایک طلاق بائن واقع ہوتی ہے اور اس میں بھی نیت شرط ہے اور یہی ان کے قول البائن لا یلحق البائن کا معنی ہے۔[2]

ولا شک ان المراد به البائن المنوی اذ غیر المنوی لا یقع به شئی اصلاً ولم یشترطوا ان ینوی به الطلاق الاول و هکذا قال المحقق ابن همام فی الفتح و تبعه تلمیذه ابن الشحنه فی عقد الفرائد و کذا صاحب البحر والنحر والمنح والمقدسی والشر نبلالی وغیرهم قال قاضی خان و فی فتاویٰ النسفی ترا بله کردم او رها کردم او دست بازداشتم او قال ترا هشتم لا یقع الطلاق مالم نیوه . . . فاقول بعد واللتی ان الفاظ الحالف المذکور

---

[1]۔ (فتاوی شامی، ج 2 ص 466)

[2]۔ (ملخص از درمختار۔ باب الکنایات)

علی حسب قول مفتی الھند یکون اخبارا و لا یقع الطلاق بالاخبار الکاذب ولو جعل انشاء بالفرض یکون بائنا واحدًا و تکرارہ لایلحق بالاول وان قال بحکم اللّٰہ لانہ ایضا بائن فلا یلحق بالبائن وکیف یقع اذلم یضف الفاظ الکنائیۃ الی امراتہ ھذا ماعندی العلم عند اللّٰہ الکبیر فماکان من خطائی فمن نفسی وجھلھا ومن الشیطان ونعوذ باللہ تعالیٰ منھما وماکان من صواب فبتوفیق اللّٰہ تعالیٰ والحمدللہ رب العلمین۔ (۵ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ)

سوال ۲۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید کی عورت بغیر وجہ گھر چھوڑ کر باپ کے ساتھ چلی گئی ہے اور زید نے متواتر آدمی منانے کے لیے روانہ کیے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ پھر زید نے دوسری شادی کر لی۔ عورت مذکورہ کو پھر بھی علیحدہ مکان اور خرچ دینے کیلئے منت کی مگر اس نے راضی ہونے کی بجائے عدالت سرکاری میں جھوٹا دعویٰ کر کے نکاح فک کرا لیا کہ خاوند متعنت ہے اور نفقہ نہیں دیتا ہے اور پھر دوسری جگہ نکاح کر لیا۔ اب قابلِ دریافت امر یہ ہے کہ فقہ حنفی کی رُو سے ایسی عورت نکاح فک کرا سکتی ہے یا نہیں؟ اور حاکم مسلمان اندریں حالات میں فک کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب

عورت کا خاوند سے بلا وجہ بصورت نشوز گھر چھوڑ کر بلا اجازت چلا جانا نفقہ کو ساقط کر دیتا ہے اور بصورت اسقاط حق نفقہ خاوند متعنت نہیں رہتا اور غیر متعنت کی عورت خصوصاً جبکہ ناشزہ ہو نکاح فک کرانے کا حق نہیں رکھتی اور اگر ایسے حالات ہوتے ہوئے حاکم مسلمان

بغیر وجہ شرعی فک کر دے تو وہ نکاح شرعاً فک نہ ہوگا۔ **وھو مصرح فی کتب الفقه۔** ہاں، متعنت کی صورت میں قاضی حنفی فک کر سکتا ہے، شافعی یا مالکی کو نائب مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو **غایة الاوطار ممتدة الطهر** کے مسئلہ میں نا قلاعن الطحطاوی و صرح بہ قاضی خان اور صاحب شرح وقایہ نے مشائخ حنفیہ سے اس کا استحسان نقل کیا ہے[1] دیکھو باب النفقہ۔

باقی رہا حاکم مسلمان کا غیر عادل ہونا تو یہ جب علامہ شامی کے زمانہ میں قضاۃ فساق کا حکم جاری رہا ہے تو فی زمانہ ان شرائط کے وجود کا مطالبہ جو مالکیہ کے نزدیک مثلا عدالت وغیرہ کے متعلق ہیں باب ضرورة کا انسداد ہے۔ جب عادل میسر نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے۔ ہذا ما عندی والعلم عنداللہ الکبیر۔

سوال ۲۳

زید لوگوں میں افواہ اڑاتا ہے کہ میرا فلاں عورت کے ساتھ نکاح ہے اور میرے پاس گواہ موجود ہیں لیکن کسی حکم یا قاضی کے پاس دعویٰ نہیں کرتا بلکہ دو چار مرتبہ مطالبے کے باوجود بھی عالمِ دین کے پاس اس نے اپنے نکاح کا ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ حیلے حوالے کر کے ٹال گیا، ایسے شخص کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب

(منجانب مولوی احمد دین کیلوی)

صحتِ دعویٰ کی شرط ہے مجلس قضا میں دعویٰ کرنا، فقط افواہ اڑانا اور کسی حکم شرعی کے

---

[1]۔(الطحطاوی۔ج2ص217/ فتاوی قاضی خان۔باب الاکفاء۔ج4ص118)

پاس دعویٰ نہ کرنا بالکل بے سود ہے بلکہ اس کا دعویٰ نہ سنا جائے گا۔

عنایه شرح هدایه و علی هذا القضاة من آخرهم فی کل عصر یویده قوله تعالیٰ اذا دعوا الی اللّٰه ورسوله لیحکم بینهم اذا فریق منهم معرضون وهکذا فی درالمختار وقال والظاهر ان هذا حیث لم یظهر من المدعی امارة [1]

درالمختار میں ہے **لاتسمع دعواه کے ماتحت وجعل سکوته کالافصاح قطعاً للتزویر والحیل** [2]

درمختار میں ھے۔ لایکلف بینة الخ [3] **...**

هذا مختصر مانقل فی فتیاه عن کتب الفقه والعلم عندالله

سوال ۲۴

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ چند اشخاص نے مل کر ایک عورت نومسلمہ کو طمعِ زر کے لیے واپس والدین کے حوالہ کر دیا اور بعض علماء نے ان اشخاص کا کفر ثابت کر کے تعزیر دینا چاہا ہے اور گواہان اثباتِ کفر وہ اشخاص ہیں جو اس جرم میں شریک ہیں۔ کیا ایسا کرنے سے واقعی وہ کافر ہو گئے ہیں یا نہیں؟

جواب

(منجانب فقیہ العصر حضرت والدی المکرم مدظلہ العالی)

۱۔(درمختار۔ج4ص218)

۲۔(درمختار۔ج4ص381)

۳۔(درمختار۔ج3ص280،282۔باب الخراج والجزیہ)

واقعی ایسے اشخاص نے بہت برا کام کیا ہے۔ اثباتِ جرم کے بعد وہ قابلِ تعزیر ہیں تاکہ دوسروں کو عبرت ہو لیکن تعزیر دینے کے لیے پہلے چند مسلمانوں کو کافر ثابت کرنا کوئی درست بات نہیں اور اس کے متعلق مندرجہ ذیل چار امور کو زیرِ ملاحظہ رکھنا چاہیے۔

دلیل اول:

مسئلہ متازعہ فیہا میں رضا بکفر غیرہ (حاشیہ 1) ہے اور یہ کفر نہیں ہے کیونکہ **رضا بکفر غیرہ مما اختلف فیه المشائخ** ہے۔

ھندیہ باب کفریات (صغریٰ)، اور جو **مما اختلف فیه المشائخ** ہو وہ کفر نہیں ہوتا (کبریٰ) لہٰذا اس مسئلہ میں بھی کفر نہ ہوگا۔ (حاشیہ 2) کبریٰ کی دلیل تنویر الابصار کی عبارت ہے جس کی توصیف وتعریف میں شامی پر کافی زور لگایا گیا ہے اور عبارت درالمختار و شامی میں ہے : **واعلم انه لا یفتی بتکفیر مسلم امکن حمل کلا مه علی محمل حسن اوکان فی کفره خلاف ولوکان ذالک روایته ضعیفةً**

ترجمہ: جان تو کہ کسی مسلمان پر اتنے تک کفر کا فتویٰ نہیں جاری ہوگا جتنے تک اس کے کلام کو صحیح یا اچھے معنی پر محمول کرنا ممکن ہو یا اس کے کفر میں اختلاف ہو اگرچہ اس اختلاف کی روایت ضعیف ہو۔[1]

ونص علیه کلام البحر وغیره ولا یفتی بالکفر بشئی من الفاظ الفتاویٰ الا فیما اتفق علیه المشائخ قال صاحب البحر وقد الزمت علی نفسیِ ان لا اکفر بشئی منها۔

(حاشیہ 1)۔ بکفر غیرہ سے مراد لزوم کفر ہے (محمد طیب ارشد)

(حاشیہ 2)۔ یعنی حکم کفر نہ ہوگا۔ (محمد طیب ارشد غفرلہ)

[1]۔ (درالمختار و شامی۔ ص 356)

ترجمہ: اور اس پر بحر کا کلام نص ہے اور وہ اس طرح کہ فتاویٰ کے الفاظ میں سے کسی چیز کے ذریعہ کفر کا فتویٰ جاری نہیں ہوگا مگر جس میں مشائخ کا اتفاق ہو۔

صاحب البحر نے کہا کہ میں نے اپنے آپ پر اس چیز کو لازم کیا ہے کہ اس میں سے کسی چیز کے ساتھ کفر کا حکم جاری نہیں کرتا۔[1]

دلیل دوم بطریق القیاس الاستثنائی:

اگر بالفرض رضا بکفر غیرہ کفر ہوتو نعوذ باللہ کفر جبریلؑ لازم آئے گا۔

واللازم باطل فالملزوم مثله ملازمہ کے لیے ملاحظہ ہووہ حدیث شریف جو حاکم نے مستدرک میں اس کی تصحیح بخاری اور مسلم کی شرط پر فرمائی ہے۔

اور ترمذی نے بھی مسنداً روایت کیا ہے:

عن ابی عباس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انه ذكر ان جبرائيل جعل يدس فی فرعون (اے فی فم فرعون) الطين خشية ان يقول لا اله الا اللہ فيرحمه اللہ او خشية ان يرحمه۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں یہ بات ذکر کی کہ وہ فرعون کے منہ میں مٹی ٹھونس رہے تھے اس اندیشہ کے تحت کہ وہ لا الہ اللہ نہ پڑھ لے اور اللہ تعالیٰ اس پر رحمت نہ کرے۔[2]

معلوم ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام فرعون کے کافر مرنے پر راضی تھے۔

دلیل سوم:

---

[1]۔(بحر۔ ص355)

[2]۔(ترمذی شریف۔ج2 ص611،ابواب التفسیر)

مسئلہ مانحن فیہ میں لزوم کفر ہے اور لزوم کفر کفر نہیں ہوتا بلکہ التزامِ (حاشیہ 1) کفر کفر ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو شرح عقائد و خیالی وغیرہ۔

دلیل چہارم:

اگرچہ صاحب شرح وقایہ نے فرمایا ہے کہ جہل حر مکلف کا امور شرعیہ میں عذر نہیں۔ دیکھو مسئلہ خیار بلوغ، لیکن تحقیق یہ ہے کہ حر مکلف کا جہل باب کفریات میں عذر ہے **کما صرح بہ صاحب اشباہ و النظائر**

علاوہ ازیں مسئلہ متنازعہ علمائے مکفرین پر بندہ کے چند اعتراضات ہیں، ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حکم تکفیر مدعا علیہم کے بیانات لینے سے پہلے تحریر فرمایا گیا ہے اور یہ خلاف جمیع قضاۃ اسلام ہے۔

۲۔ جب مذکورہ شہود و علماء کے نزدیک مجرمین کافر ہیں جو انہی سے چند شاہد بنے ہوئے اور ایک منکر ہے تو کفار کی شہادت سے منکر کی ردت کس طرح ثابت ہو گی۔ **قولہ تعالیٰ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا۔**

ترجمہ: اور ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ نہ دے گا۔ (ترجمہ کنزالایمان)

۳۔ زیادتی شہادت بعد قیام عن المجلس ظاہر المذہب میں ناجائز ہے۔ اگرچہ گواہ عادل کیوں نہ ہو اور مسئلہ مذکور میں ایک شخص نے جو مجرم تھا، بیانات قلم بند کرانے کے بعد دوسری صبح کو زیادتی بیان کی۔

(حاشیہ 1)۔ لزوم کفر جو قول، فعل، عین کفر نہ ہو مگر مخبر کفر ہو یعنی مال سخن سے کسی دینی امر کا انکار لازم آئے تو اس لزوم کفر پر کفر کا حکم نہیں ہوتا التزام کفر یہ ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی شہ کا صراحۃ خلاف کرنا یا خلاف دین پر اصرار کرنا یہ التزام کفر ہے اور اس پر کفر کا حکم ثابت ہوتا ہے
(فتاوی رضویہ۔ البحر الرائق فتاوی شامی) محمد طیب ارشد غفرلہ۔

۴۔ مسئلہ ردت مسلم وہ مسئلہ ہے کہ اس کے انکار کے وقت نہ گواہان عادل سنے جا سکتے ہیں نہ حلف بالقرآن اور اس کی تشدید حلف فی المسجد جائز ہے۔ **الدر المختار شهدوا على مسلم بالردة وهو منكر لا يتعرض له۔**

ترجمہ: اگر گواہوں نے کسی مسلمان کے مرتد ہونے پر گواہی دی حالانکہ وہ انکار کرتا ہے تو اس کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔[۱]

۵۔ حضرت ماعز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے زنا کا اقرار کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعراض فرما کر چوتھی دفعہ انحراف کی تلقین لطیف اشارے کے طور پر فرمائی۔ لعلک لمست الخ ...... اور حضور نے ماعز کے ابھارنے والے کو کہا...... **عن يزيد ابن نعيم عن ابيه ان ماعزا اتى النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاقر عنده اربع مرات فامر برجمه وقال لهزال لو سترته بثوبك كان خير الك (الحديث)**

ترجمہ: روایت حضرت یزید بن نعیم سے کہ وہ اپنے باپ سے ماعز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کے پاس چار مرتبہ اقرار کیا تب آپ نے ان کے رجم (یعنی سنگساری) کا حکم دیا۔ تو آقا علیہ الصلوۃ والسلام نے ہزال سے فرمایا کہ اگر تم کپڑے کے ساتھ ان کو ڈھانپ لیتے تو یہ تمہارے لیے بہتر تھا۔[۲] اور زنا یقیناً ردت سے اخف ہے۔ اول میں چار گواہ عادل انکار کو لا انکار بنا سکتے ہیں لیکن ثانی میں ہزار گواہ عادل انکار کو لا انکار نہیں بنا سکتا۔ حضور سنگین سزا کے مجرم کے اقرارِ جرم کے وقت منہ پھیر لیتے تھے اور یہاں علماء نے مجرمین کے

۱۔ (درمختار۔ ج2 ص111، باب المرتد)

۲۔ (مشکوہ شریف۔ ج2 ص311)

قدموں پر پگڑیاں اتار اتار کر رکھیں اور اقرار کرنے پر راضی کیا۔

بہ بین تفاوت راہ از کجا است تا بکجا ع

٦۔ کلام کفر عناد حجود میں ہے نہ کفر دون کفر میں کیونکہ ثانی الذکر مومن میں جمع ہوسکتا ہے کیونکہ ہر گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، کفر کا شعبہ ہے جس طرح حیاء اور اماطۃ الاذی ایمان کا شعبہ ہے۔

٧۔ اقرار حجۃ قاصرہ ہے(حاشیہ 1) لہٰذا چند مجرمین کا اقرار منکر پر اثبات جرم و الزام سزا نہیں کر سکتا لہٰذا یہ شہادت نہ ہوگی بلکہ اقرار علی الغیر ہوگا اور یہ حجت متعدیہ نہیں۔

٨۔ جس شخص کو علمائے مکفرین گواہ عادل کر رہے ہیں وہ اس نومسلمہ کا نکاح خواں ہے اور عدت کے اندر نکاح پڑھا چھوٹے میاں چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ اور حالانکہ عدت کے اندر نکاح کرنا قرآن، حدیث، آئمہ اربعہ، اجماعِ اہلِ سنت بلکہ اجماع تمام امت اِجابت سب کے نزدیک حرام ہے۔

قرآن پاک میں ہے: **وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ**

شامی میں ہے ائمہ اربعہ بھی اس کی حرمت پر متفق ہیں[1]۔ ابنِ جریر طبری ابن ابی لیلیٰ، امام بخاریؒ وغیرہ اہل السنۃ والجماعۃ میں داخل ہیں، اب جس نے ایسے حرام متفق علیہ کا ارتکاب کیا ہے، وہ کیسا عادل ہے؟

علاوہ ازیں شہادتِ نکاح فی نفسہٖ مجرم پر شہادت نہیں۔ یہ پہلے کا ایک قصہ ہے۔

(حاشیہ 1)۔شریک جرم کی گواہی شرم قبول نہیں ہوتی یونہی شریک جرم کا اقرار دوسرے شریک جرم کے لیے شرم قبول نہیں ہوتا۔

---

[1]۔(فتاوی شامی۔ج2ص401)

۹۔ جن لوگوں نے عبرت کی بجائے تعزیر کے بعد کسی قسم کی خوشی منائی ہے، ان کے لیے دو حدیثیں لکھ دینی کافی ہیں۔

عن واثلة قال قال رسول الله ﷺ لا تُظهر الشَّمَاتَة لأخيك فيَرْحَمَه الله ويَبْتَلِيك۔ رواه الترمذی

ترجمہ: حضرت واثلہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اپنے بھائی پر لعن طعن ظاہر نہ کرو ورنہ اللہ اس پر رحم کر دے گا اور تجھے مبتلا کر دے گا۔[1]

و عن معاذ قال قال رسول الله ﷺ من عیر اخاه بذنب لم یمت حتی یعمله یعنی من ذنب قد تاب منه۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے بھائی کو کسی گناہ کی عار دلائے تو وہ نہ مرے گا حتیٰ کہ خود بھی کرے گا۔ یعنی وہ گناہ جس سے وہ توبہ کر چکا ہے۔[2]

هذا مالخصته من فتیا الطویل لاستفادة الناظرین والحق علی من استفاده منه الدعاء بالخیر لهٰذا الغریق فی بحر العصیان وعلی الله التکلان

سوال نمبر 24 کے جواب میں حضرت علامہ مفتی محمد طیب ارشد صاحب کے تائیدی کلمات ملاحظہ فرمائیں۔

رضا بکفر غیرہ سے مراد یہاں لزوم کفر ہے حضرت علامہ فقیہ العصر مولانا حافظ غلام محمود صاحب قدس سرہ نے خود بھی دلیل سوم میں وضاحت فرمائی ہے کہ مسئلہ مانحن فیہ میں لزوم کفر

---

[1]۔ (مشکوٰۃ شریف۔ ج2 ص414)

[2]۔ (مشکوٰۃ شریف۔ ج2 ص414۔ اسلامی کتب خانہ)

ہے اور لزوم کفر کفر نہیں ہوتا بلکہ التزام کفر کفر ہوتا ہے اور لزوم کفر یہ ہے کہ جو قول، فعل عین کفر نہ ہو مگر مخبر کفر ہو یعنی مآل سخن سے کسی دینی امر کا انکار لازم آئے تو اس لزوم کفر پر کفر کا حکم نہیں ہوتا اور التزام کفر یہ ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی شے کا صریحا خلاف کرنا یا خلاف دین پر اصرار کرنا یہ التزام کفر ہے اور اس پر کفر کا حکم ثابت ہوتا ہے۔

(بحوالہ فتاوی رضویہ البحر الرائق فتاوی شامی) (محمد طیب ارشد غفرلہ)

سوال ۲۵

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ ایک شخص نے اپنی ساس کے ساتھ تنازعہ کیا۔ ساس نے کہا کہ میری لڑکی کو چھوڑ دو۔ اس نے جواباً تین پتھر اٹھا کر ساس کی طرف پھینک دیے اور کہا کہ یہ آرہے ہیں، تیری لڑکی مجھ پر حرام ہے۔ منہ سے لفظ طلاق نہیں بولا۔ ایسے شخص کی عورت مغلظہ ہوگئی ہے یا بغیر تحلیل صرف تجدید نکاح سے آسکتی ہے۔ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از راغو خلیل)

جواب

طلاق کے لیے (۱) الفاظِ طلاق رکن ہیں جو صریح ہوں یا کنایہ (۲) اگر لفظ بالکل کوئی موجود نہ ہو تو فقط نیت اور اعتقاد سے طلاق نہیں ہوتی۔ دعویٰ اول کی تفصیل کے لئے فتاویٰ شامی میں ہے **وبه ظهر أن من تشاجر مع زوجته فأعطاها ثلاثة أحجار ينوي الطلاق ولم يذكر لفظًا صريحًا ولا كنايةً لا يقع عليه۔**

ترجمہ: اسی سے ظاہر ہوا کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑا کیا پھر اس کو تین

ڈھیلے طلاق کی نیت سے دیے اور نہ لفظ صریح بولا نہ کنایہ تو طلاق واقع نہ ہوگی **كما أفتى به خير الرملي وغيره**۔[1]

فتاوی شامی میں ہے **فلا يقع بالقاء ثلثة احجار اليها او بامرها بحلق شعرها وان اعتقد الالقاء والحلق طلاقا كما قدمناه لان ركن الطلاق اللفظ او مايقوم مقامه مماذكر كمامر**۔

ترجمہ: طلاق ڈھیلے پھینکنے اور اس کے سر کے بال مونڈنے سے واقع نہ ہوگی اگرچہ ڈھیلے پھینکنے یا بال مونڈنے سے اس کی طلاق کی نیت کیوں نہ ہو کیونکہ طلاق کا رکن لفظ یا لفظ کا قائم مقام ہے۔[2]

درمختار میں ہے **ولو قال انت هكذا مشيراً ولم يقل طالق لم اره**۔

ترجمہ: اگر انگلیوں کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تو اس طرح ہے اور طلاق کا لفظ نہ بولا تو میں طلاق نہیں سمجھتا یعنی طلاق واقع نہ ہوگی۔[3]

وكلام الزيلعى نص ثمه فيها او عيناه و هكذا صرح صاحب الدر ههنا ثانياً ان مطلق اللفظ لايكفى لوقوع الطلاق بلا لفظ الطلاق صريح او كناية فلا بدمن لفظ الطلاق لا مطلق اللفظ لان مطلق اللفظ موجود فى قوله انتِ كذا مشيراً۔

ترجمہ: دوسری بات یہ ہے مطلق لفظ طلاق کے واقع ہونے کے لیے کافی نہیں جب تک طلاق کا لفظ صریح یا کنایہ نہ ہو پس طلاق کے لفظ کا ہونا ضروری ہے صرف مطلق لفظ

---

[1]۔(فتاوی شامی، ج2 ص438)

[2]۔(فتاویٰ شامی، ج2 ص465۔ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

[3]۔(درمختار، ص 211 باب الصریح۔ مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

کافی نہیں ہے کیونکہ مطلق لفظ تو اس کے قول **اَنْتِ کذا مشیراً**،،یعنی اشارہ کرتے ہوئے اگر کہتا ہے کہ تو اس طرح ہے۔

اب سائل مذکور کا یہ لفظ ''تیری لڑکی مجھ پر حرام ہے'' وقوعاً صریح ہے اور الحاقاً کنائی ہے۔ اگر اس لفظ سے تین طلاق کا ارادہ کیا ہے تو مغلظہ ہو جائے گی ورنہ فقط تجدیدِ نکاح ہی کافی ہے۔ تحلیل کی کوئی ضرورت نہیں۔ والعلم عند اللہ العلی الکبیر۔(۱۱ محرم الحرام ۱۳۶۵ھ)

سوال ۲۶

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ زید نے وصیت کی ہے کہ میرا مال متروکہ کسی کارِ خیر میں لگایا جائے، میرا کوئی وارث نہیں حالانکہ اس کی ماں اور مادری بھائی بہنیں اور چچازاد موجود ہیں اور ماں مدعی ہے کہ اس کے یعنی میرے لڑکے نے کچھ زیورات جو خالص میرے تھے، یعنی میں نے اپنی محنت مشقت سے تیار کروائے تھے، وہ چرا کر اپنے قبضہ میں کیے ہوئے تھے اور ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ میں تمہیں واپس دے دوں گا۔ بینوا رحمکم اللہ۔

جواب

زید کے ترکہ میں سے وہ مال علیحدہ کر لیا جائے جو اس کی والدہ کا ہے اور باقی اس طرح تقسیم کر لیا جائے۔

۶ حصہ میں سے

ماں	بھائی بہنیں مادری	چچازاد	وصیت
۱	۲ بحصہ برابر	۱	۱

بحصہ برابر کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کا فرق نہ ہوگا۔ ایک تہائی میں برابر کے

شریک ہیں اور وصیت چونکہ تہائی سے زائد نا جائز ہے، اس لیے ایک تہائی وصیت کی ہوگی اور ایک تہائی اخوان واخوات (بہن، بھائی) کی اور سدس ماں کا باقی سدس بچے گا وہ چچازاد کا۔ والعلم عند اللہ۔

سوال ۲۷

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ مدعی بھی گواہ پیش کرتا ہے اور مدعیٰ علیہ بھی تو کس کے گواہ معتبر ہوں گے؟

جواب

چونکہ گواہ اثبات کے لیے ہوتے ہیں، نفی کے لیے نہیں، اس لیے گواہ مدعی کے سنے جائیں گے۔ ہاں جرح مقید پر مدعی علیہ کے گواہ سنے جاسکتے ہیں۔[1]

مثلاً مدعی کے گواہ شراب پی کر گواہی دے رہے ہیں یا رشوت لے کر گواہی دے رہے ہیں یا مجھ سے رقم لی ہے کہ ہم باطل کی گواہی نہ دیں گے اور پھر دے رہے ہیں لہٰذا میری رقم واپس دیں وغیرہ وغیرہ فقط نفی پر گواہی قبول نہیں کی جاسکتی۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۲۸

۱۔ جہاد کے لیے کیا شرائط ہیں اور جہاد کی نیت کیا ہے؟

۲۔ کیا کشمیر کی لڑائی جہاد ہے یا نہیں؟

۳۔ امام اور امیر کے کیا فرائض ہیں اور امام شرعی کس طرح مقرر کیا جاسکتا ہے؟

---

[1]۔ (ہدایۃ۔ ج3 ص244)

۴۔محمد علی جناح صاحب امام شرعی ہو سکتے ہیں؟

۵۔جہاد کے لیے دعوت الی الاسلام یا دعوت الی الجزیہ ضروری ہے یا نہیں یا بغیر ان کے بھی جہاد ہوسکتا ہے؟

۶۔کیا پاکستان دارالاسلام ہے؟

۷۔جہاد کے لیے امام یا امیر دونوں کا ساتھ ہونا ضروری ہے یا موخر الذکر کا وجود کافی ہے۔

جواب

مندرجہ بالا استفادات کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے تمہیداً تین چیزوں کی پوری تحقیق و تفتیش لازمی ہے۔

۱۔جہاد کسے کہتے ہیں؟

۲۔دارالاسلام اور دارالحرب میں کیا فرق ہے؟

۳۔امارت اور امامت کی شرائط وفرائض کیا ہے؟

جہاد کسے کہتے ہیں؟

جہاد دین کی طرف بلانے کو کہتے ہیں اور جو شخص دین کو قبول نہ کرے، اس کے ساتھ لڑنے کو۔ مجمع الانہر باب السیر میں ہے: **والمراد الاجتهاد فی تقوية الدين بنحو قتال الحربيين والذميين والمرتدين والباغين**

ترجمہ: حربی، ذمی مرتد اور باغی لوگوں سے جنگ کر کے دین کو تقویت دینے میں کوشش کرنا جہاد کہلاتا ہے۔[1]

۱۔(مجمع الانہر۔باب السیر)

جہاد کی شرائط:

جہاد کے لیے اولاً استطاعت شرط ہے یعنی خود جنگ کرنے کے قابل ہو، ہتھیار رکھتا ہو اور ہتھیار استعمال کرنا بھی جانتا ہو، زادِ سفر اور سواری وغیرہ کی طاقت رکھتا ہو، یا مرہم پٹی اور رسد رسانی کی اہلیت رکھتا ہو یا مال کے ساتھ تعاون کرنے یا رائے اور تدبیر کے ساتھ مدد کرے یا تکثیر سواد کا باعث ہو...... لہٰذا ایسے مریض کو بھی جہاد میں جانا چاہیے جو قوتِ مدافعت تو نہیں رکھتا لیکن چلنے پھرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اسے مسلمانوں کا ہجوم زیادہ کرنے کے ارادہ سے میدانِ جہاد میں جانا چاہیے۔ الدر المختار ناقلا عن الفتح۔ جہاد کے لیے مجاہدین کی قوت بھی شرط ہے یعنی وہ مقابلے کی طاقت رکھتے ہوں اور بادشاہ کا اعلان یا اس کی طرف سے کسی دوسرے شخص کا خبر دینا جو بادشاہ کی طرف نسبت رکھتا ہو اگرچہ وہ خبر دینے والا فاسق ہی کیوں نہ ہو ا۔ بعض اوقات بادشاہ کا سکوت بھی کافی ہوتا ہے۔ جہاد کے لیے بادشاہ کا ساتھ ہونا ضروری نہیں بلکہ کوئی امیر یا منتظم جو لڑا سکنے کی اہلیت رکھتا ہو، ضروری ہے (حالاتِ صحابہؓ)۔

جہاد کس وقت فرض ہوتا ہے؟

جہاد مسلمانوں کے لیے ابتدا (پہل کرنا) فرض کفایہ ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو سرحدوں کے قریب رہتے ہوں اور مقابلے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ورنہ ان لوگوں پر لازم ہوگا جو ان کے قریب ہیں۔ الاقرب فالاقرب اور کفار ابتدا کریں تو فرضِ عین ہے۔ قولہٗ تعالیٰ **فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ**۔ الآیۃ، شامی میں ہے: **وان ضعف اهل الثغر عن مقاومة الكفرة خيف عليهم من**

ا۔ (درمختار۔ص98)

العروفع من ورائهم عن المسلمين الاقرب فالاقرب ان ينفروا اليهم وان يمدوهم بالسلاح والكراع والمال لماذكرنا انه فرض على الناس كلهم ممن هو من اهل الجهاد الخ ......یعنی اگر کفار کی سرحد پر رہنے والے لوگ مقابلہ کرنے میں کمزور ہو جائیں اور ان پر دشمن کے غلبہ پا جانے کا خوف ہو تو پھر دوسرے مسلمانوں پر ان کی امداد کرنی فرض ہے جو ان کے قریب رہتے ہیں۔خود بھی جائیں اور اسلحہ وغیرہ سے بھی ان کی امداد کریں۔[1]

شامی نے آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھا ہے: قولہٗ تعالیٰ **قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ** الآیۃ۔**تدل على ان الجهاد فرض على كل من يلى الكفار من المسلمين على الكفاية** الخ ...... (نہر عن حواشی و السعدیہ) ......یعنی قرآن شریف کی یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جہاد ہر اس شخص پر لازم ہے جو کفار کی سرحدوں کے قریب رہتے ہیں۔

جہاد کن اغراض ومقاصد کے لیے کرنا چاہیے:

جہاد اعلائے کلمۃ الحق اور غلبہء اسلام کی نیت سے کرنا چاہیے۔قولہٖ تعالی **وَقٰتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ** ۔ فتنہ سے مراد مطلق شرارت ہے یا فسادِ عقیدہ وغیرہ۔ **وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ** اور دین اللہ ہی کا ہو جاوے۔آنحضرت ﷺ نے بعض معاہد کافروں کی مدد کے طور پر جہاد فرمایا ہے جیسا کہ فتح مکہ کے وقت۔مجمع الانہر میں ہے:

فى البحر امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على اهل المغرب تخليصها مالم تدخل حصونهم و اخراجهم ۔ یعنی اگر مشرق میں مسلمان عورت کو کفار قید کر لیں تو مغرب میں رہنے والے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسے رہائی دلانے

---

[1]۔(شامی عن بدائع۔ ج 3 ص 240، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ)

کی کوشش کریں۔[1]

مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ جہاد دینِ حق کی بلندی کی خاطر ہو یا کمزور مسلمانوں کی مدد کے لیے ہو یا کفار کی شوکت کو کم کرنے کی غرض ہو، سب یکساں ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں میں فتنہ وفساد کی رکاوٹ کے لیے ایک دوسرے کے خلاف بھی جہاد فرض ہے۔ قولہ تعالیٰ **قَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ** (الآیۃ)

دارالاسلام اور دارالحرب کا فرق:

دارالاسلام وہ جگہ ہے جہاں مسلمانوں کے رئیس کے احکام نافذ ہوں اور دارالحرب وہ ہے جہاں کفار کے رئیس کے امور جاری ہوں۔ **و دار الاسلام مایجری فیھا حکم امام المسلمین و دارالحرب مایجری فیھا امور رئیس الکافرین کما فی الکافی**[2]۔ اورزاہدی نے ذکر کیا ہے کہ جہاں مسلمان غالب ہوں اور امن سے زندگی گزار سکیں، وہ دارالاسلام ہے اور دارالحرب وہ ہے

جہاں مسلمان کفار کے خوف وخطرہ میں زندگی گزاریں اور بلاشک دارالحرب میں اگر بعض احکامِ اسلام جاری ہو جائیں تو وہ بھی دارالاسلام بن جاتا ہے لیکن دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لیے تین شرطوں کا وجود ضروری ہے۔ اولؔ احکامِ کفر کا اجراء علی الاعلان یعنی حکامِ وقت کفار کے احکام کے ساتھ حکم کریں اور مسلمانوں کی قضاء احکام کا کوئی نہ پوچھے۔ دومؔ وہ جگہ دارالحرب کے ساتھ اس طرح متصل ہو کہ درمیان میں مسلمانوں کا کوئی شہر آباد نہ ہو اور نہ مسلمانوں کی آبادی سے انہیں مدد لاحق ہو سکے۔ سومؔ وہاں کوئی مسلمان اور ذمی کفار کی امان کے بغیر نہ رہ سکے۔ صاحبین رحمہا اللہ کے نزدیک فقط

---

[1]۔(مجمع الانہر۔ ص443)

[2]۔(دارالمنتقی ۔ ص634)

شرطِ اول کافی ہے۔ شیخ الاسلام نے کہا ہے کہ اگر اسلام کا ایک حکم بھی وہاں باقی ہوتو اسے دارالاسلام کا نام دیا جائے گا۔

امام کس طرح بنتا ہے؟

امام شرعی مبایعت سے ہوتا ہے۔ یعنی اس علاقہ کے چند سمجھ دار آدمی اولاً اس کی بیعت کرلیں اور عوام کی اکثریت ان کے ساتھ اس بات پر متفق ہو جائیں، جس طرح حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا قیام ہوا ہے یا امامِ حق اسے اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کر جائے، جس طرح حضرت عمرؓ کو خلیفہ اولؓ نے وفات سے قبل اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ یا تسلط اور غلبہ سے وہ شخص تمام لوگوں کا بادشاہ بن جائے یا علماء کی ایک جماعت اس کی بیعت کرلے۔ بیعت حلفِ وفاداری اور اقرارِ اطاعت کے قائم مقام اور صحتِ انتخاب علامت سمجھی جاتی ہے۔ بیعت شرعاً کئی قسم کی ہے یا چند اہل الرائ والتدبیر اس کے ساتھ اس شخص کی امارت پر متفق ہو جائیں۔ اشعری کے نزدیک ایک صاحبِ علم ومقدمہ بھی کافی ہے بشرطیکہ وہ منکرین کے دفع انکار کے لیے اپنے پاس مسکتِ جواب رکھتا ہو۔ حنفیہ کے نزدیک مسلمانوں کی ایک جماعتِ اتفاق شرط ہے لیکن اس کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں۔ لہٰذا اس شخص میں جواب منتخب کیا گیا ہے، علم اور عدالت کا وجود نہ ہو لیکن اس کے امارت سے علیحدہ کرنے میں فتنہ وفساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ہم اس کو امامت کے انعقاد کا حکم دے دیں گے تا کہ ہم پر وہ مثال صادق نہ آئے کہ ایک مکان کی تعمیر کے لیے شہر مسمار کر دیا گیا۔[1]

کیا امام مقرر کرنا ضروری ہے؟

درالمختار باب الامامۃ میں ہے کہ امامتِ کبریٰ کا قیام یعنی مسلموں کے لیے اپنا امیر مقرر کرنا ان پر واجب ہے۔ امام حرؔ، عاقلؔ، بالغؔ، مذکرؔ، قادرؔ، قریشیؔ ہونا چاہیے۔ قریشی کی

1۔(فتاویٰ شامی۔ج3ص319۔باب البغاۃ)

شرط صاحب الدر نے شاید حدیث شریف **الائمة من القریش** کی وجہ سے لگائی ہے لیکن حدیث شریف کا یہ مفہوم متعین کرنا کہ تمام دنیا میں ہر جگہ قیامِ قیامت تک قریشی ہی خلافت کے منصب پر فائض ہوتے رہیں گے تو پھر اسلامی مساوات اور آیات **وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا** اور **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** اور **وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ** یعنی مسلمان ہونا چاہیے، وغیرہ آیات کے صراحۃً خلاف اور منافی ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کا تعلق حالاتِ حاضرہ عہد النبویہ علیہ التحیۃ والتسلیم کے لیے تھا کیونکہ اس وقت خاندانِ قریش کو تمام ملک عرب میں غلبہ اور شوکت حاصل تھی جو دوسرے کسی کو نہ تھی اور سرزمینِ حجاز میں کسی شخص کو ان کی سرداری سے انکار نہیں تھا۔ اس وجہ سے امورِ مملکت کے انصرام اور حکومت جمہوری نظام کو مستحکم بنانے کے لیے عصبیت قومی کی بنا پر خلافت کو قائم کرنا زیادہ انسب اور پائیدار تھا۔ **ھٰکذا قال علامه ابن خلدون فی مقدمته حاصل حکوم** امامت کبریٰ کے لیے وجہ ترجیح کا موجود ہونا لازمی امر ہے خواہ وہ غلبہ عصبیت ہو یا سیاستِ حاضرہ کی مجارت ہو۔

اگر امامتِ کبریٰ کی بنا صرف تقویٰ یا قریشیت پر ہوتی تو پھر خلافتِ راشدہ کے عہدِ زریں سے لے کر آج تک تمام خلجی، سلجوقی، غزنوی اور تیموری مسلمانوں کی حکومتیں یقیناً ناجائز ہوتیں۔ حالانکہ یہ زمانے علماء کے وجود سے معمور رہے ہیں۔

عن انس عن رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسه زبیبة

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام کو حاکم مقرر کیا جائے۔ جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔[1]

1۔ (مشکوٰۃ۔ ص319، کتاب الامارۃ والقضاء)

خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم

ترجمہ: تمہارے بہترین حکام وہ ہیں جو تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔[1]

قسم کی احادیث بہ بانگِ دہل پکار رہی ہیں کہ امامت کے لیے نسبی افتخار یا دنیاوی وجاہت ضروری نہیں۔ **ان استعمل** الخ...... والی حدیث شریف میں ولایتِ صغریٰ یعنی ماتحت امارت کی تاویل ظاہر مفہوم حدیث بالکل خلاف ہے۔

(کما فعله صاحب المرقات) خلاصۃ المرام...... فاسق کی تقلید یعنی بدکار آدمی کو امام منتخب کر لینا مکروہ ہے۔ اگر پہلے نیک ہو لیکن بعد میں فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہو تو اسے معزول کر دینا چاہیے۔ اگر فتنہ و فساد کا خوف نہ ہو یعنی عوام اتنی منتظم اور متحد ہو کہ بغیر جدال و قتال بین المسلمین کے وہ اسے معزول کر سکتے ہوں ورنہ نہیں۔

بلکہ اس کی اصلاح اور درستی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص انتخاب کے بغیر کسی حیلہ سے مسلمانوں پر بالجبر مسلط ہو جائے تو بھی ضرورتِ وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے شخص کی سلطنت صحیح اور درست ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے جب تک خلافِ شرع حکم نہ دے۔ (الدر المختار)

امام شرعی اور امیر:

لغوی اور فقہی طور پر امامت اور امارت کے الفاظ ایک ہی معنی میں مستعمل ہوتے ہیں لیکن احادیث کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ متبع سنت ہو اور اس کی حکومت کی اساس خلافتِ راشدہ کے طریقہ پر ہو تو اسے خلیفہ یا امام کہنا چاہیے ورنہ امیر یا سلطان ملک وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جائے۔ جیسا کہ **سیکون من بعدي امراء** اور **من**

---

[1]۔ (مشکوٰۃ شریف۔ ص319،)

دراہِ ملک عضوض وغیرہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے (اوکما قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اب مندرجہ بالا گزارشات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے استفتاء مذکور کے جوابات کا جائزہ لیجئے۔

۱۔ جہاد کے لیے استطاعت اور قوت اور بادشاہ کا اعلان یا سکوت وغیرہ لازم ہیں۔ جہاد دینِ اسلام کی سرفرازی اور مظلوم مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت یا رہائی کے لیے یا فتنہ وفسادِ کفار کو روکنے کے ارادہ سے کرنا چاہیے۔ کمامر مفصلاً

۲۔ کشمیر کی لڑائی یقیناً جہاد ہے ورنہ وہاں کفار کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ کئی لاکھ مسلمان برباد ہو جائیں گے اور پاکستان کے رہنے والے مسلمانوں کا امن خطرہ میں پڑ جائے گا۔ جس سرزمین پر پانچ وقت اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہوتا ہے، وہاں ناقوس کی آواز گونجا کرے گی اور وہ مفاسد ومہالک پیش آئیں گے جو مشرقی پنجاب میں پیش آچکے ہیں۔

۳۔ امام شرعی چند اہل الحق والعقد یعنی صاحب الرائ والتدبیر کے انتخاب سے بھی ہوسکتا ہے، تسلط اور جبر کے ذریعہ بھی امام شرعی یا امیر پر عدالت، انصاف، امن، رعایا پروری، مظلوم کا بدلہ لینا ااور اللہ کی مخلوق میں اللہ کا حکم رائج کرنا لازم ہے۔

۴۔ قائد اعظم محمد علی جناح صاحب مسلم لیگ ہائی کمان کے مسلمان ممبروں کے ووٹوں اور انتخاب سے امیر مقرر ہوئے ہیں جن میں علماء بھی ہیں اور ہائی کمان کے افراد کو بالواسطہ تمام پاکستان کے مسلمانوں نے اس انتخاب کا اختیار دے رکھا تھا، تو گویا محمد علی جناح صاحب پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں میں یعنی غالب اکثریت کے انتخاب سے امیر مقرر ہوئے ہیں۔ جس شخص نے اپنا سب کچھ صرف کر کے ہمارے حقوق حاصل کیے ہیں، ان کی حفاظت کیلئے اس سے بہتر دوسرا شخص کون ہوسکتا ہے۔ کسی شخص کے خیال میں اگر کعبہ سے دیر اچھی

ہے، یا موجودہ قطعہء ارضی پر رہنے والے تمام مسلمانوں سے ہنود اور عیسائی اچھے ہیں تو پھر اسے اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بوسیدہ اور سڑی ہوئی لاش کو بہت جلد دفن کر دینا چاہیے ورنہ بقیہ زندگی قدرت کی ستم ظریفی پر ماتم کرتے گزار دینی چاہیے۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور علاج ہے؟

۵۔ کفار متحاربین کو محاصرہ کے حالات میں دعوت الاسلام دینی چاہیے۔ یہ وہاں ضروری ہے جہاں لوگ اسلام سے بالکل ناواقف ہوں (درالمختار)۔ اور فی زمانہ اسلام شرقاً وغرباً مشتہر ہے اور بچہ بچہ اسلام کے مقتضیات سے واقف ہے۔ لہٰذا ایسے خطرات کے مہلکات کے وقت موجودہ وقت کے کفار کو فقط اظہارِ اسلام کی دعوت دے کر جان بخشی مسلمانوں کے استیصال کا سامان مہیا کرنا ہے کیونکہ کفارِ وقت نے خطرہ کے وقت زبانی اسلام کو شعار بنالیا ہے اور اس میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں، وہ کسی عاقل پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت اظہارِ اسلام کے بعد فرار الی الکفر کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا اور مرتد ہونے کی حالت میں قتل ہوجانا لازمی تھا لیکن اب ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

درالمختار میں ہے: **وندعُوندباًمَن بَلَغَتْهُ اِلاّاِذاتَضَمَّن ذٰلکَ ضَررًااَولو بغَلَبَةِ الظَّنِّ کان یستعدُّوْنَ اَوْیتحصَّنون فلایُفعَلُ۔**

یعنی اگرچہ اسلام کی دعوت معلوم ہو پھر بھی استحباباً اسے دعوت دینی چاہیے لیکن اگر اس میں مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہو خواہ فقط احتمال ہی کیوں نہ ہو، مثلاً اتنی دیر میں وہ تیاری کرلیں گے یا قلعہ میں داخل ہوجائیں گے تو پھر دعوت نہیں دینی چاہیے۔[1] **وفی المحیط تقدیم الدعوۃ الی الاسلام کان فی ابتداء**

---

[1]۔ (درالمختار، ص 330 کتاب الجہاد، مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

الاسلام واما بعد ما انتشر یحل القتال معهم قبل الدعوة ویقوم الدعوة وشیوعها مقام الدعوة وهذا صحیح ظهر کما فی التبیین ۔
یعنی دعوۃ الی الاسلام ابتدائی دور میں ضروری امر تھا لیکن جب اسلام کی تعلیم عام ہوگئی تو پھر بغیر دعوت دیے جنگ کرنا جائز ہوگیا۔ اور دعوت کا ظہور عین دعوت کا قائم مقام ہوگیا۔[1] درالمنتقی شرح الملتقیٰ میں ہے کہ دو موقعوں پر دعوت الی الاسلام ضروری نہیں۔ اولاً جہاں مسلمانوں کے نقصان کا خدشہ ہو۔ دوم جس چیز کی دعوت دی جارہی ہے، اس کے حصول کی امید نہ ہو۔[2]

کما فی المحیط دعوت الی الجزیة ہر جنگ میں ضروری نہیں۔ جیسے کشمیر کی جنگ ہے۔ کیونکہ کشمیر میں متحارب مخالفین انڈین یونین کے مدعیہ ہیں جو اطراف سے جمع ہوکر کفار کی امداد کے لیے جان دینے آئے ہیں۔ یہاں کے باشندے نہیں تاکہ وہ اطاعت کی صورت میں جزیہ ادا کرنے کے لیے یہاں قائم رہیں گے۔

۶۔ پاکستان یقیناً دارالاسلام ہے۔ کما مر مفصلاً

۷۔ جہاد کے لیے بادشاہ خود لشکر میں موجود ہو یا اس کی طرف سے کوئی منتظم یا سپہ سالار موجود ہو جو لشکر کو لڑا سکنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان میں سے ایک کا وجود جہاد کے لیے کافی ہے۔

هذا عندی والعلم عند الله العلی الکبیر المتعال والیه المرجع والمآل

۱۔ (مجمع الانہر۔ ص435)
۲۔ (درالمنتقی شرح الملتقیٰ۔ ص635)

سوال ۲۹

میں نے ایک شخص کو عرصہ بارہ سال سے ایک قطعہ اراضی بخش کے طور پر دیا ہے اور میرا ارادہ اس وقت سے یہی تھا کہ میں جس وقت چاہوں گا، واپس لے لوں گا۔ کیا میں اسے واپس لے سکتا ہوں یا نہیں؟ اور اس قبضہ کا کوئی حق ہے یا نہیں؟ (اللہ داد، کڑی خیسور)

جواب

اکثر جو لوگ فی زمانناً بخش کے لفظ سے اراضی یا زیورات بوقت جہیز اولاد وغیرہ کو دیتے ہیں اور ان کا ارادہ یہی ہوتا ہے کہ بوقت نزاع یہ واپس لے لیں گے اور اکثر وہ واپس لے بھی لیتے ہیں، یہ عرفاً عاریتہً ہوتے ہیں۔ ہبہ نہیں ہوتے اور لوگوں کے عرف کا اعتبار کرنا لازم ہے، اگر نص کے خلاف نہ ہو۔

فتاویٰ شامی میں ہے: ہاں اگر ارادہ یہی ہو کہ یہ ہبہ ہے، پھر بھی وہ واپس لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ دمع خزقہ کے سات مشہور فقہی عوارض موجود نہ ہوں۔ کیونکہ یہ عوارض رجوع کو ساقط کر دیتے ہیں۔ اکثر لوگ جو ہبہ میں ایجاب وقبول کو شرط سمجھتے ہیں، یہ بھی غلط ہے بلکہ **قرائن دالۃ علی التملیک** موجود ہوں۔[1]

ہبہ فاسدہ میں واہب کے فوت ہو جانے کے بعد بھی وارث رجوع کر سکتا ہے۔

قبضہ خواہ جائز ہو یا ناجائز، ملکیت غیر میں شرعاً کوئی اعتبار نہیں رکھتا خواہ کتنی مدت نہ گزر جائے۔[2]

ہٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ج4ص531)

[2]۔ (فتاوی شامی۔ص533)

سوال ۳۰

میرے والد نے مجھے اپنے قبضہ میل سکنی سے محروم کر دیا ہے اور میرے بھائی نے اپنا حصہ بعوض یک صدروپیہ مجھے اسی میل سکنی میں سے بیع کر دیا ہے۔ کیا میں اس کا حقدار ہوں یا نہیں؟ (میاں عثمان)

جواب

میل سکنی شاملاتِ دیہہ ہے اور بوجہ شرائط واجب الارض پر قبضہ رکھنے والا اس کا مالک سمجھا جاتا ہے لہٰذا تمہارا بھائی قابض تھا، پھر تو یہ بیع صحیح ہوگی ورنہ نہیں۔

شرعاً ایسی جگہ سے جہاں تمہارا قبضہ موجود نہیں، والد کا ملک تسلیم ہونے کی وجہ سے والد تمہیں محروم کر سکتا ہے۔ جدی جائیداد اور خود پیدا کردہ میں شرعاً کوئی فرق نہیں۔ سب سے والد محروم کر سکتا ہے۔

سوال ۳۱

میرے بھائی کا نکاح ہے اور ہم برضا ورغبت فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی عمر سرکاری اندراج کے مطابق چودہ سال پانچ مہینے ہوتی ہے۔ کیا وہ طلاق دے سکتا ہے یا نہیں؟ (سائل ازنواں جنڈانوالہ)

جواب

اگر بلوغ کی کوئی علامت ظاہر ہے، مثلاً احتلام یا موئے زہار داڑھی وغیرہ اور وہ خود کہتا ہے کہ میں بالغ ہوں تو طلاق دے سکتا ہے۔ کنز الدقائق میں ہے: **فان راھقا وقالا بلغنا صدقا ویحکم علیھما حکم البالغین۔**

ترجمہ: اگر لڑکی لڑکا بلوغت کے قریب ہیں اور انہوں نے کہا ہم بالغ ہو گئے تو ان کی تصدیق کی جائے گی اور ان کے احکام بالغین جیسے ہوں گے۔[1]

اگر آثار مفقود ہیں تو پھر پندرہ سال عمر بحساب سنہ قمریہ پوری کرنی ضروری ہے۔تمام شرعی امور میں سنہ قمریہ معتبر ہیں۔جمہور کا یہی مذہب ہے۔

ملاحظہ ہو شرح وقایہ باب العنین۔قمری سال تین سو چون (۳۵۴) دن کا ہوتا ہے اور شمسی تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن کا، گویا سال میں دس دن کا فرق پڑتا ہے۔تو اس حساب سے صورت مسئولہ میں دو مہینے چار دن اور گزار کر طلاق دے سکتا ہے۔ہذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

سوال ۳۲

فریقین کا اختلاف ہے کہ افطار کا صحیح وقت کیا ہے۔ایک فریق تعجیل فی الافطار کو اچھا سمجھتا ہے اور غروبِ شمس کے بعد اقبال لیل ہونے کے بعد افطار کر دیتا ہے اور دوسرا فریق اسے تعجیل فی الافساد بتاتا ہے اور عمداً ایسا کرنے والے پر قضا لازم سمجھتا ہے۔

بینوا توجروا ترحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

الحمد لله الذى فصل لنا الآيات و بين لنا سبيل الحق واليقين على لسان سيدنا و سيد المرسلين وصلى عليه بنفسه وثنى بملائكته المقربين وعلى آله المطهرين صلوةً وسلاماً دائمين متلازمين الى يوم الدين اما بعد

[1]۔(کنزالدقائق، ص422، فصل حد البلوغ)

فیا معشر الاخوان والخلان هذا مسئلة من سائل اوقات العبادات و هو یتعلق بالسمعیات، کما هو ظاهر من حدیث جبریل علیه الصلوٰة لا مدخل فیه بالتخیلات ولا مساغ فیه للاجتهادات والظنیات، ان اللّٰه بعث حبیبه محمد النبی الامی علیه افضل التحیات الی قوم امی الذین لایعلمون الهئیة والطبعیات قد بین لهم الرشد من الغی وما احسن قوله و بیانه فی حدیث الافطار اومٰی بیده الشریف وقال اذا اقبل اللیل من ههنا فقد افطر الصائم رواه البخاری و المسلم و حققه النووی وفصله الشامی بقوله اذا وجدت فی جهة المشرق ظلمة حساً وقال قال رسول اللّٰه ﷺ فی حدیث آخر اذا اقبل اللیل من ههنا وادبر النهار من ههنا وغربت الشمس و بین هذا الثلاثة تلازم ظاهر و جمعهم ﷺ للایضاح والتفهیم حتی لا یبقی فی زوایا المسئلة ظلمة خافیة اشرق مشرقها ومغربها بالبرهان القاطع والفجر الساطع هذا حق لمن القی السمع وهو شهید۔ و وعید لمن ارتاب فیه وهو عنید وازدیاد قول الحمرة والصفرة علی بیاض الحدیث لیس بقول سدید صدق سیدنا علی کرم اللّٰه وجههٗ لوکان الدین بالرائی لکان تحت الخف اولی بالمسح الخ۔۔۔ وقول الاطباء فی مسئلة الطب وامثاله فی المجتهد فیه وفی ما نحن فیه نص ظائر هل من رجل رشید۔ والحق ان وقت المغرب عکس و قت الفجر وهما متساویان کما وکیف ولها اول و آخر و ان کان مختصرا والافطار فی اولها افضل والے آخرها جائز والغلو فی التاخیر مکروه۔

هذا ما عندی والعلم عند اللّٰه تعالیٰ۔

ترجمہ: اے بھائیو اور دوستو یہ مسئلہ عبادت کے اوقات کے بارے میں سوال کرنے

والے کی طرف سے ہے اور اس کا تعلق دلائل سمعیہ (قرآن وسنت) ہے جس طرح کہ حدیث جبرائیل سے ظاہر ہے۔اور اس میں عقل، اجتہاد اور گمان کو گنجائش نہیں بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو اس قوم کی طرف بھیجا جو ہیت اور طبیعت کو نہیں جانتے تھے تحقیق ان کے لیے ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے اور سب سے اچھا آپ کا قول مبارک جو کہ حدیث افطار میں موجود ہے کہ آقا علیہ صلوۃ وسلام نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ جب رات اِدھر سے آجائے اور دن اِدھر سے چلا جائے اور سورج غروب ہو جائے تو تب روزہ دار افطار کرے۔[1]

امام نووی نے اس کی تحقیق کی اور شامی نے تفصیل بیان فرمائی کہ جب مشرق کی جانب میں اسی طور پر اندھیرا پایا جائے اب ان تین چیزوں میں ظاہری طور پر تلازم ہے۔

آقا علیہ الصلوۃ والسلام نے وضاحت اور سمجھانے کے لیے بیان فرمایا تاکہ اس مسئلہ میں کوئی پوشیدگی نہ رہے۔اس کی مشرق اور مغرب دلیل قطعی اور روشن صبح کے ساتھ روشن ہے اور یہ مسئلہ اُس شخص کے لیے حق ہے جس نے اس کو متوجہ ہو کر اور حضور قلب سے سنا اور اس شخص کے لیے وعید ہے جس نے اس میں شک کیا اور عناد کا اظہار کیا۔اور سُرخی اور زردی کا قول درست نہیں۔حضرت علی المرتضی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر دین رائے کے ساتھ ہوتا تو موضع کے نچلے حصے میں مسح کرنا اولیٰ ہوتا اور اطباء کا قول طب اور اس جیسے مسائل میں مجتہد فی ہے۔اور ہمارا جو مسئلہ ہے اس میں ظاہری نص موجود ہے اور حق یہ ہے کہ مغرب کا وقت فجر کے وقت کے برعکس ہے اور وہ دونوں برابر ہیں اور اس کے لیے اول اور آخر ہے اور افطار اول میں افضل ہے اور آخر تک تاخیر جائز ہے اور تاخیر میں زیادتی مکروہ ہے۔

---

[1]۔(مشکوۃ شریف۔ص 177، الجزالاول کتاب الصوم)

سوال ۳۳

کیا قریب البلوغ اور عاقل لڑکا والد کی موجودگی میں مجلسِ عقد میں بزبان خود قبول کہہ سکتا ہے اور وہی قبول کافی ہوگا یا نہیں؟

جواب

۱۔ قبول کر سکتا ہے بلکہ ضرور اپنی زبان سے قبول کرنا چاہیے۔

ہدایہ میں ہے: **وان شرط الالف علیها توقف علی قبولها ان كانت من اهل القبول (بان كانت تعقل العقد و تعبر عن نفسها)۔**

ترجمہ: اگر ہزار کی اس پر شرط لگائی تو اس کا دارومدار عورت کی قبولیت پر ہوگا اگر وہ قبول کرنے کی اہل ہے یعنی عقد کو سمجھتی ہے۔ (خلع میں مال دینا پڑتا ہے اور خلع طلاق ہے)۔[1]

جب خلع کیلئے لڑکی کا بھی نکاح کی صورت میں لڑکے پر مہر واجب ہو رہا ہے لٰہذا اس کا قبول بھی ضروری ہوگا۔ گو باپ کا قبول بھی کفایت کر سکتا ہے اگر مہر مثل ہو۔

۲۔ یہ تصرف نافع ہے اور تصرف نافع صبی اور معتوہ سے بلا اذن بھی جائز ہوتا ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

وتصرف الصبی والمعتوه ان كان نافعا كالاسلام والاتهاب صحيح بلا اذن۔

ترجمہ: بچے اور معتوہ کا ایسا تصرف جس میں صرف نفع ہو تو وہ صحیح ہے۔ جس طرح

---

[1]۔ (ہدایہ۔ ج2 ص417۔ باب الخلع)

کہ بچے کا اسلام قبول کرنا اور ہبہ قبول کرنا۔[1]

۳۔ جس عقد کا مجیز موجود ہو وہ اجازت پر موقوف ہوتی ہے اور یہاں والد جو مجیز ہے وہ موجود ہے اور اس کی اجازت صراحۃ ودلالۃ ثابت ہے کیونکہ اس نے اتنی دور سے اسی عقد کے لیے سفر کیا ہے، تہنیت قبول کی ہے شیرینی وغیرہ تقسیم کی ہے۔

كل عقد له مجيز حال وقوعه يقف على الاجازة

ترجمہ: ہر عقد جس کے وقوع کی حالت میں کوئی اجازت دینے والا ہو تو وہ اجازت پر موقوف ہوگا۔[2]

۴۔ نکاح کے لیے اہلیۃ بلوغ وعقل والی شرط ہے، عاقد کے لیے نہیں ہے۔

بحر میں ہے: **الاول الاهلية بالعقل والبلوغ قال فى الفتح القدير وينبغى ان يُزادَ فى الولى لافى الزوج والزوجة ولا فى متولى للعقد فان تزويج الصغير والصغيرة جائز و وتوكيل الصبى الذى يعقل العقد ويقصده جائز عندنا۔** ہذا ما عندی

ترجمہ: نکاح کی اہلیت بلوغ اور عقل کے ساتھ ہوتی ہے فتح القدیر میں ہے کہ مناسب یہ ہے کہ اس چیز (یعنی) عقل وبلوغ کو ولی میں زیادہ کیا جائے نہ کہ زوج اور زوجہ میں اور نہ ہی عقد کے متولی میں کیونکہ چھوٹے بچے اور بچی کا نکاح کر دینا جائز ہے اور بچے کو اس چیز کا وکیل بنانا جس کو وہ سمجھتا ہے اور اس کا ارادہ کرتا ہے جائز ہے۔[3]

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ ج5 ص121)

[2]۔ (خلاصۃ۔ ج2 ص17)

[3]۔ (بحر الرائق۔ ج3 ص138۔ کتاب النکاح مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

سوال ۳۴

ایک بالغہ یتیمہ کا نکاح بوجہ خوفِ فرار اس کے عم نے دوسرے نابالغ لڑکے جس کی عمر پانچ چھ سال تھی، بالجبر کر دیا۔ بدیں صورت کہ دو دفعہ لڑکی نے اس نکاح سے انکار کیا لیکن بعد میں ایک مفسد کے پھسلانے سے اپنے بھائی کو اختیار دیا جو وہ بھی نابالغ تھا۔ باقی والیوں نے اس عم کو اس فعل سے منع کیا لیکن وہ مصر رہی۔ لڑکے نابالغ کی طرف سے ایک اجنبی آدمی نے قبول کہہ دیا۔ وارث بوجہ ناراضگی شامل نہ ہوئے۔ اب وہ لڑکی بار بار فرار ہو جاتی ہے اور تمام خاندان کے لیے باعثِ ننگ (شرم) بنی ہوئی ہے۔ کیا بوجہ ضرورت نابالغ لڑکا طلاق دے سکتا ہے؟ یا کوئی اور صورتِ نجات ہے۔ بینوا و توجروا رحمکم اللہ تعالیٰ

جواب

صورت مسئولہ میں اِنکاح ابتداءً صحیح نہیں ہوا کیونکہ اولاً لڑکی رضامند نہیں تھی اور پھر اختیار دیا بھی تو نابالغ کو جو نکاح کا اہل نہیں۔

دوم قبول فضولی نے کیا اور اس قبول کا مجیز حالۃ العقد میں موجود ہونا لازمی تھا جو نہیں یعنی لڑکا نابالغ تھا اور اس حالت میں مجلس سے اٹھ کر چلے گئے گویا عقدِ مذکورہ میں نہ ایجاب موجود ہے نہ قبول۔ **والنکاح ینعقد بالایجاب والقبول کما هو مصرح فی کتب الفقه ونقل صاحب البحر عن فتح القدیر حیث رد علی صاحب النهایه هذا یوجب ان یفسر المجیز صاحب الدر المختار فی فصل الفضولی فانظر ثمه**

باقی طلاق نابالغ اجماع کے خلاف ہے۔ فتح القدیر نے عمدہ تحقیق اس مسئلہ میں تحریر فرمائی ہے۔ جواز کا قول صرف کتب اصول نے شمس الائمہ سرخسی صاحب المحیط سے نقل کیا ہے لیکن وہ بھی مرد کی ضرورت کے وقت اجازت دیتے ہیں، عورت کی ضرورت کیلئے

نہیں۔مختصر الکلام لڑکی مذکورہ دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔[1]

هذا ما عندی و العلم عند الله وهو الموفق۔

سوال ۳۵

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ مردار کی چربی کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اوراس کا استعمال مثلاً صابون وغیرہ بنانے جائز ہے یا نہیں؟

جواب

مردار جانور کی چربی کی بیع بالاتفاق ناجائز ہے۔ درمختار میں ہے **وفی المجمع ونجیز بیع الدهن المتنجس والانتفاع به فی غیر الاکل بخلاف الودک اه**

ترجمہ: اور مجمع میں ہے کہ ہم ناپاک تیل کی بیع جائز جانتے ہیں اور اس سے کھانے کے علاوہ فائدہ حاصل کرنے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں بخلاف مردہ کی چربی کے۔(یعنی اس کی بیع اورانتفاع ناجائز ہے۔ (**درالمختار باب بیع الفاسد۔**)

یعنی اس تیل کی بیع جس میں پلیدی واقع ہوجاوے، فی ذاتہٖ نجس نہ ہو، اس کی بیع جائز ہے اور بغیر کھانے کے نفع اٹھانا بھی جائز ہے بخلاف مردار کی چربی کے کہ اس کے بغیر الاکل انتفاع بھی ناجائز ہے۔شامی لکھتے ہیں بغیر الاکل سے مراد چراغ وغیرہ جلانا ہے لیکن وہ بھی مسجد کے علاوہ اور دہن المیتۃ کی بیع بالاتفاق ناجائز ہے کیونکہ بخاری نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ خمر کی بیع میتہ کی بیع اور صنم کی بیع ناجائز ہے۔صحابہ نے عرض کیا کہ حضرت لوگ مردار کی چربی سے کشتیاں چپڑتے ہیں، چمڑے کو لگاتے ہیں اور

---

[1]۔(بحر۔ج3ص138)

چراغ وغیرہ بھی جلاتے ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا وھو حرام**۔ملاحظہ فرمائیے: **فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلاَّ الضَّلٰلُ** ...... باقی یہ مسئلہ کہ اس چربی سے صابون بنانا جائز ہے یا نہیں،تو بھی مندرجہ بالا شواہد سے صاف ظاہر ہے۔بعض لوگوں کو شامی کی اس عبارت سے غلط فہمی ہوئی ہے جو اس نے درالمختار کی عبارت: **ویطھر زیت النجس بجعلہ صابونا وبہ یفتی للبلوی کتنور رش بماء نجس لا باس بالخبز فیہ** الخ

ترجمہ: نجس تیل کو صابن بنادیا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے اور عموم بلوٰی کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے اس کی مثال اس تنور کی ہے جس پر ناپاک پانی چھڑکا گیا ہو تو اس میں روٹی پکانے میں کوئی حرج نہیں۔

...... باب الانجاس کے ماتحت لکھا ہے کہ یہ تیل ناپاک کا حکم ہے اور وہ بھی صرف امام محمدؒ کے نزدیک۔خلافا لابی یوسف علامہ شامی لکھتے ہیں کہ ظاہر کلام امام محمد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہن المیتۃ کا حکم بھی یہی ہے کیونکہ امام نے محیط میں دہن النجس فرمایا ہے۔ دہن المتنجس نہیں فرمایا۔پھر کہتا ہے مگر دہن المیتۃ تو خاص چیز ہے، اس کو عام کا حکم شامل نہیں ہوسکتا۔علاوہ ازیں اس زمانہ میں صابون وغیرہ تیل سے بنائے جاتے تھے، چربی سے نہیں۔**کما ھو ظاھر من الحدیث** اور چونکہ تیل کے مٹکوں سے چوہے وغیرہ تیل پیتے تھے، اس میں پیشاب بھی کرتے تھے، کبھی انہی میں مر بھی جاتے تھے اور مصیبت سے نجات مشکل تھی۔لہٰذا عموم بلوٰی کی وجہ سے یہ فتویٰ امام محمد صاحب نے دیا تھا۔جن لوگوں نے اس کو شراب پر، جس کو سرکہ بنالیا جاتا ہے، اور تبدیل حقیقت سے شئے دیگر ہوجاتی ہے، قیاس کیا ہے، قیاس مع الفارق ہے کیونکہ سرکہ والی مثال میں شئے کی حقیقت تبدیل ہوجاتی ہے اور طین کوز اور تنور وغیرہ میں صرف وصف تبدیل ہوتا ہے، حقیقت تبدیل نہیں ہوتی اھ ملخصا اس عبارت سے صاف ظاہر ہے۔علامہ شامی کی رائے عدم استعمال کی طرف ہے

اور جس شبہ کو علامہ کی گرمیء طبیعت نے پیدا کیا تھا، اس کو علامہ نے خود مسترد کر دیا۔ ہذا ماعندی والعلم عنداللہ، جولوگ علم کے باوجود اس کی تجارت کرتے ہیں، قابلِ تنبیہ ہیں۔

(۲۰ شعبان ۱۳۶۳ھ)

الجواب الصحیح: فقیر محمد سعید عفی عنہ

سوال ۳۶

بعض احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خضاب سیاہ بالوں کو لگانا درست نہیں۔ شرعی طور پر کیا حکم ہے؟

جواب

اتفق المشائخ ان لخضاب بالحمره سنته۔ ای بمعنیٰ انه ﷺ امر به ابا بکرؓ الصدیق و انه من سیماء الصالحین وعلاماتهم وان الخضاب بالسواد فمن فعل ذلک فی الغزو لیکون اهیب فی عین العدو فهو محمود و علیه اتفق المشائخ ومن فعل لیزین نفسه للنساء ولیحبب الیهن فذلک مکروه وعلیه عامة المشائخ وبعضهم جوزوا ذلک من غیر کراهة وروی من ابی یوسف علیہ الرحمۃ انه قال کما یعجبنی ان تتزین لی یعجبها ان اتزین لها کذا فی الذخیرة و عن الاما م ان الخضاب حسن لکن بالحناء والکتم والوسمة کما هو ظاهر من حدیث ابن ماجة واراد به اللحیة وشعر الراس والخضاب فی غیر حال الحرب لا باس به فی الاصح کذا فی الوجیز للکردی

ترجمہ: مشائخ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سرخ مہندی بالوں پر لگانا سنت ہے

یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کے لگانے کا حکم دیا۔اور بے شک یہ نیک لوگوں کی علامت ہے لیکن جو آدمی سیاہ خضاب اس لیے استعمال کرتا ہے تاکہ دشمن پر اس کا رعب پڑے تو اس پر اتفاق ہے کہ ایسے آدمی کے لیے اس نیت پر سیاہ خضاب مستحب ہے اور اگر کوئی آدمی سیاہ خضاب اجنبی عورتوں کے سامنے خوب صورت ظاہر ہونے کے لیے کرے تو یہ مکروہ ہے اور اسی پر اکثر مشائخ ہیں اور بعض نے اس کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ جیسے مرد اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی بیوی خوب صورت معلوم ہو اسی طرح عورت بھی اس بات کو پسند کرتی ہے کہ خاوند خوب صورت معلوم ہو۔امام صاحب سے مروی ہے کہ خضاب مہندی کے ساتھ اچھا ہے اور اس کے ساتھ داڑھی اور سر کے بالوں کا ارادہ کیا اور جنگ کے علاوہ میں بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔

سوال ۳۷

کیا فرماتے ہیں علمائے زماں اندریں مسئلہ کہ آج کل عوام و خواص بزرگانِ دین کی مزارات کو بوسہ دیتے ہیں اور احترام کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیا دلیل ہے؟ بوضاحت تحریر فرماویں۔

جواب

الدرر السنیہ میں ہے: **ان اعرابیا وقف مقابل قبر الشریف فقال اللھم ان ھذا حبیبک و انا عبدک والشیطان عدوک فان غفرتنی سر حبیبک وفاز عبدک وغضب عدوک وان لم تغفرلی غضب حبیبک ورضی عدوک وھلک**

عبدک وانت یا رب اکرم من ان تغضب حبیبک وترضی عدوک وتھلک عبدک وانت یا رب اکرم من ان تغضب حبیبک وترضی عدوک وتھلک عبدک اللھم ان العرب اذا مات فیھم سیدا اعتقوا علی قبرہ وان ھذا سید العلمین فاعتقنی علی قبرہ یا ارحم الراحمین فقال لہ بعض الحاضرین یا اخاالعرب ان اللہ قد غفر لک بحسن ھذاالسوال......

ترجمہ: ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی قبرانور پر آیا اور کہا اے اللہ یہ آپ کے حبیب ہیں اور میں تیرابندہ ہوں اور شیطان تیرادشمن ہے۔اگر بخش دے تو تیرادوست خوش ہوگا اور دشمن ناراض اور تیرابندہ کامیاب ورنہ دوست ناراض دشمن خوش اور بندہ ہلاک...... اور تیری شان کے مناسب نہیں کہ تو دوست کو ناراض کرے اور دشمن کوخوش کرے اور بندہ کو شرمندہ۔بعض سخی عرب اپنے معزز مرنے والے کی قبر پر غلام آزاد کرتے ہیں ۔لہٰذا مجھے اپنے حبیب ﷺ کا صدقہ آزاد فرما دے۔[1]

عبداللہ بن احمد ابن حنبل سے روایت ہے کہ کتاب العلل وسوالات میں **سالتہ عن مس القبر وتقبیلہ لرجاء الثواب فقال لاباس بہ فلھٰذا بطل مانقل الاجماع قال السبکی عدم تمسح القبر لیس مماقام علیہ الاجماع۔**

ترجمہ: کہ میں نے (امام احمد بن حنبل سے) ان سےثواب کی نیت سےقبر کو چھونے اور بوسہ دینے کا سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں تو اس سے اجماع باطل ہوگیا ۔امام سبکی فرماتے ہیں کہ قبر کا نہ چھونا اجماعی مسائل میں سےنہیں ہے

قصہء مروان و ابی ایوب انصاری: عن داؤد ابن ابی صالح قال اقبل مروان یوم فوجد رجل واضعا وجھہ علی القبر فقال اتدری ماتصنع فاقبل

---

[1]۔(الدررالسنیہ فی الردعلی الوہابیہ۔ص25،مطبوعہ ترکی)

عليه فاذا هو ابو ايوب فقال نعم۔ جئت رسول الله ﷺ ولم اٰت الحجر سمعت رسول الله ﷺ لاتبكوا على الدين اذا وليه اهله ولكن ابكو عليه اذا وليه غير اهله

ترجمہ: سیدنا داؤد بن ابو صالح سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ ایک دن مروان نے دیکھا کہ ایک صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور پر اپنا چہرہ رکھے ہوئے ہیں مروان کہنے لگا کہ تم کیا کر رہے ہو جب آگے بڑھا تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف فرما تھے فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں میں کسی پتھر کے پاس نہیں آیا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ تم دین پر مت رو جب اس کا اہل اس کا حکمران ہو البتہ اس وقت رو جب کوئی اس کا حکمران نا اہل ہو۔[1]

وعن بلال انه اتى قبر الشريف فجعل يبكى عنده ويمرغ وجهه عليه

ترجمہ: حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور پہ آئے پس اس کے پاس آپ رونے لگے اور اپنے چہرے کو اس پر ملنے لگے۔[2]

وان ابن عمر كان يضع يده اليمنى عليه

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا دائیاں ہاتھ مبارک اس پر رکھا کرتے تھے۔

ونقل خطيب عن ابن ابى الصيف والمحب الطبرى جواز تقبيل قبور الصالحين

ترجمہ: خطیب نے ابن ابی صیف اور محب طبری سے نیک لوگوں کی قبر کے بوسے

---

[1]۔ (مسند امام احمد۔ حدیث نمبر 24302)

[2]۔ (وفاء الوفا۔ ج 4 ص 182، مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور)

کے جواز کو نقل کیا ہے

وعن اسماعیل التیمی قال کان ابن المنکدر یصیبه الصمات فکان یقوم فیضع خده علی قبر النبی ﷺ فسئل فی ذلک فقال انه یستشفی بقبر النبی ﷺ

ترجمہ: اسماعیل تیمی سے مروی ہے کہ ابن منکدر کو صمات (پیاس کی صورت) پہنچی تو وہ نبی کریم ﷺ کی قبر انور پر اپنے رخسار کو رکھا کرتے تھے ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اللہ کے محبوب ﷺ کی قبر انور سے شفاء حاصل کرتے ہیں

ومانقل عن الحنفیة احتیاط بالترک وغیره وهوکله بخیال اساءت الادب لان الادب یقینا فی البعد عنه لکن الرجال تختلف مراتب استغراقهم فی الحب (جواهر من بخیه)

ترجمہ: جو حنفیہ سے بوسے کا ترک منقول ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ قبر کی بے ادبی نہ ہو کیونکہ یقیناً ادب اس سے دور رہنے میں ہے لیکن لوگوں کے محبت میں مستغرق ہونے کے مراتب مختلف ہیں

ونقل عن کفایة الشعبی ان رجلا الی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ ﷺ انی حلفت ان اقبل عتبة باب الجنة والحور العین فامره النبی ﷺ ان تقبل رجل الام و وجبهة الاب ویروی انه قال یا رسول اللہ ان لم یکن لی ابوان فقال قبل قبرهما۔ قال فان لم اعرف قبرهما قال خط خطین وانو بان احدهما قبر الام والآخر قبر الاب فقبلهما فلا تحنث فی یمینک کذا فی کنز العباد۔

ترجمہ: شعبی سے منقول ہے کہ ایک مرد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض

کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے شک میں نے قسم اٹھائی ہے کہ جنت کے دروازے کی چوکھٹ اور حورعین کو بوسہ دوں گا۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ماں کے پاؤں اور باپ کی پیشانی کے بوسے کا حکم دیا اور مروی ہے کہ اس نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر میرے والدین نہ ہوتو آپ نے فرمایا کہ ان کی قبر کو بوسہ دے اس نے عرض کی کہ میں ان کی قبر کو نہ پہچانوں۔تو اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تو دو خط کھینچ اور یہ نیت کر کہ ایک ان میں سے ماں کی قبر ہے اور دوسری باپ کی قبر ہے پھر ان کو بوسہ دے تو تو اپنی قسم میں حانث نہ ہو گا۔ (۵ شوال ۱۳۷۰ھ)

سوال ۳۸

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ کسی شخص سے تھانیدار نے زبردستی طلاق اٹھوائی ہے اور اس نے اپنی عورت کا نام بدل کر لیا ہے۔مثلاً مریم کی بجائے زینب کہہ دیا یا باپ کا نام بدلایا، مریم دختر صدیق کی بجائے جو اس کی زوجہ کا نام ونسب تھا، مریم دختر حیات کہہ دیا تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا......

جواب

اگر عورت سامنے موجود ہے اور اس نے اُس کی طرف اشارہ کر کے نام غلط لیا ہے تو پھر کوئی فرق نہیں کیونکہ اشارہ تسمیہ اور صفت کو باطل کر دیتا ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے **لاتعتبر الصفة اوالتسمية مع الاشارة** الخ......

ترجمہ: صفت یا نام کا اشارہ کے ساتھ اعتبار نہیں کیا جائے گا۔[1]

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص499)

اگر اشارہ نہیں کیا اور عورت کا نام بدلا یا مثلاً مریم کی بجائے زینب کہہ دیا تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ درالمختار میں ہے: **لو حلف لدائنه بطلاق امراءته فلانة واسمها غيره لاتطلق۔**

ترجمہ: اگر کسی شخص نے اپنے قرض خواہ کو فلاں بیوی کی طلاق کی قسم دی حالانکہ اس کا نام کوئی اور تھا تو اس کو طلاق نہیں ہوگی۔[1]

اسی طرح اگر باپ کا نام غلط لیا ہے تو بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

قال امراته عمرته بنت صبيح طالق وامراته عمرة بنت حفص ولا نية له لاتطلق امراته۔

ترجمہ: ایک شخص نے کہا کہ میری عمرہ بنت صبیح طلاق والی ہے۔ حالانکہ اس کی بیوی عمرہ بنت حفص ہے۔

اور اس شخص کی نیت کچھ نہیں ہے تو اس کی بیوی طلاق والی نہیں ہوگی۔[2]

یعنی صرف باپ کا نام تبدیل کرنے میں یا صفت تبدیل کرنے میں مثلاً کہا کہ میری فلاں سیاہ عورت کو طلاق ہے اور اس نام سے اس کی عورت سیاہ نہیں بلکہ سفید ہے، نیت کا ہونا یا نہ ہونا معتبر ہوگا۔ اگر ارادہ اور نیت اپنی عورت کے طلاق کرنے کا ہے اور صفت میں غلطی واقع ہوگئی تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر ارادہ طلاق کا نہیں اور عمداً غلطی کی ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

ہذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

---

[1]۔ (درمختار۔ ج2 ص23، باب طلاق غیر المدخول بہا)

[2]۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج1 ص393)

سوال ۳۹

ایک شخص پر بہت سے گواہوں نے شہادت دی ہے، کوئی کہتا ہے میں نے اسے اکٹھے سویا ہوا دیکھا ہے، کوئی کہتا ہے کہ زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ خود بھی اکٹھے بیٹھے بیٹھنے کا مقر ہے اور پھر اس عورت کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے، حرمت ثابت ہوگی یا نہیں؟

جواب

حرمت مصاہرہ کے لیے دو گواہ کافی ہیں۔ درمختار میں ہے **ونصابها لغيرها من الحقوق سواء كان الحق مالااو غيره كنكاح وطلاق ووكالة ووصية واستهلال صبى ولو للارث رجلان** ......

ترجمہ: اور گواہی کا نصاب اس کے علاوہ حقوق کے لیے دو مرد ہیں چاہے وہ حق مال ہو یا غیر مال ہو جس طرح کہ نکاح طلاق وصیت بچے کا آواز نکالنا اگرچہ وراثت کے لیے ہو۔[1]

شامی نے حقوق کی تفسیر میں حرمت کا ذکر بھی کیا ہے۔ شاہد حسبہ جو پہلا وجود دعوی بھی شہادت دے سکتے ہیں، انہیں حرمت مصاہرت کے شاہد بھی علامہ شامی نے شمار کیے ہیں۔ اور طلاق عتاق وکف حدود خلع ایلا ظہار وغیرہ کو ایک ہی درجہ میں شمار کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ زنا کے بغیر جملہ حقوق میں بقول علامہ شامی حرمت مصاہرہ بھی داخل ہوگی جس کے لیے بنص درالمختار دو گواہ کافی ہیں۔ امور معلق بالزنا میں صرف دو گواہ کافی ہیں۔ درالمختار میں ہے۔ **لو علق عتقه بالزنا وقع بالرجلين ۔**

---

[1]۔ (درالمختار۔ ص 484 کتاب الشہادۃ، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

ترجمہ: اگر اس کی آزادگی کو زنا کے ساتھ معلق کیا تو یہ دو مردوں کی گواہی کے ساتھ واقع ہوگی۔[1]

معلوم ہوا کہ جہاں مقصودِ زنا ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ زنا کے ثابت ہونے کے ساتھ کسی دوسری چیز کا تعلق ہے تو اس کے لیے صرف دو گواہ ہی کافی ہوں گے۔ حرمتِ مصاہرہ جس طرح زنا کے ساتھ ثابت ہوتی ہے، اس طرح **تقبیل مس بالشهوة** اور معانقہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ **والمباشرة عن شهوة بمنزلة القبلة وكذا المعانقة**

ترجمہ: اور مباشرت یہ بوسہ دینے کے قائم مقام ہے اور اسی طرح معانقہ (یعنی گلے ملنا)۔[2]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے **وهل تقبل الشهادة على نفس اللمس والتقبيل بشهوة المختار انه تقبل واليه ذهب فخر الاسلام على البزدوى كذا فى تجنيس والمزيد**

ترجمہ: خالی شہوت سے چھونے اور بوسہ لینے آیا گواہی مقبول ہوگی یا نہ ہوگی مختار یہ ہے کہ مقبول ہوگی فخر اسلام علی بزدوی کا یہی مذہب ہے اور اسی طرح تجنیس اور مزید میں ہے۔[3]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **وكان الشيخ الامام الاجل ظهير الدين المرغينانى يفتى بالحرمة فى القبلة فى الفم و الخد والراس وان كان على مقنعة وكان يقول لا يصدق فى انه لم يكن شهيدة۔**

ترجمہ: شیخ امام ظہیر الدین مرغینانی منہ اور گال اور سر کے بوسہ میں اگرچہ مقنعہ کے

---

[1]۔ (درالمختار۔ ص 484، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

[2]۔ (فتاویٰ قاضی خان۔ ج 1 ص 317، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

[3]۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 1 ص 304۔ مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

او پر ہو حرمت مصاہرہ ثابت ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔

اگر اس نے شہوت کے نہ ہونے کا دعویٰ کیا ہو تو اس کے قول کی تصدیق نہ کی جائے گی۔[۱]

ہذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

سوال ۴۰

آج کل ریڈیو پر حکومت کی طرف سے بھی سرکاری ہلال کمیٹیوں کی اطلاع رمضان شریف اور عید کے متعلق شائع کی جاتی ہے اور اس کے علاوہ بھی جہاں جہاں رویتِ ہلال ہوتی ہے اور اس کی خبر بذریعہ ٹیلیفون یا تار برقی یا ریڈیو والوں کو معلوم ہوتی ہے، اس کی بھی اطلاع دیتے ہیں کہ فلاں فلاں شہر میں رویت ہوئی ہے اور وہ اطلاع چونکہ سرکاری ذرائع سے ہوتی ہیں، اس لیے نہایت پختہ اور موثق ہوتی ہیں۔ ریڈیو چونکہ سرکاری ادارہ ہے، وہاں اس بات کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص غیر مسلم یا غیر ذمہ دار آدمی بلا سوچے سمجھے یا بلاتحقیق و اجازت اپنی طرف سے کوئی بات بھی سنا سکے نہ راستہ میں اس خبر میں آمیزش یا کذب بیانی یا اختلاف یا تبدیلی کا خطرہ یا گمان ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں بستیوں میں جہاں ریڈیو لوگوں کے پاس ہوتے ہیں، وہاں وہ لوگ صرف اس ریڈیو کی اطلاع پر عید کر سکتے ہیں یا نہیں؟ بعض لوگ اس سے منع کرتے ہیں۔ بینوا وتوجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

حقیقتاً اخبار تین قسم ہیں۔ معاملاتِ دینیہ، بیع، سزا، وکالت وغیرہ۔ ان میں ایک آدمی

۱۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 1 ص 304، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

کی خبر پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **الفصل الثانی من اول الکراھة من الھندیه یقبل قول الواحد فی المعاملات عدلا کان او فاسقا حرا کان او عبدا ذکرا کان او انثی مسلما کان او کافرا دفعا للحرج والضرورة۔**

ترجمہ: ایک شخص کا قول معاملات میں مقبول ہوتا ہے خواہ عادل ہو یا فاسق آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت مسلمان ہو یا کافر تاکہ ضرورت اور حرج دور ہو جائے۔[1]

دوم دیانات وعبادات ہیں اور خالص حقوق اللہ ہیں جیسے پانی، کھانا، کپڑا وغیرہ کی نجاست یا طہارت کی خبر نکاح اور طلاق وغیرہ کی اطلاع، ان میں مسلمان عادل کی خبر شرط ہے۔ کافر اور فاسق کی خبر پر اعتماد کرنا درست نہیں۔ **إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا۔** ترجمہ: اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلو۔ لیکن **فَتَبَيَّنُوا** کے لفظ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تبیین اور وضاحت طلبی کے بعد اگر خبر درست نظر آئے تو اعتبار کر لینا جائز ہے کیونکہ قرآن کریم نے فاسق کی خبر کو مطلقاً قبول کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس پر سوچ بچار کے بعد عمل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ صراحتہً مذکور ہے کہ دیانات میں کافر کی خبر اگر محتف بالقرائن ہو تو معتبر ہے۔ یہی حکم خط کا ہے کہ اگر وہ پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ کس آدمی کا ہے تو اس پر اعتبار کرنا جائز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں سب احکام و ہدایات شرعیہ دور دراز کے نائبین کے لیے اور دعوتِ اسلام وغیرہ جنگ کے مواقع پر صدور احکام خلفاء کے زمانے میں بھی جملہ ہدایات افسران و نائبین کو بذریعہ خطوط دی جاتی تھیں تو معلوم ہوا کہ اگر یہ یقین ہو کہ یہ خط واقعی فلاں آدمی کا ہے اور وہ ثقہ ہے تو اس پر عمل کرنا جائز ہے۔

---

[1]۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 5 ص 383، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

رویت ہلال کے متعلق خطوط کا حکم یہی ہے کہ وہ پہچانے ہوئے ہوں اور مختلف اطراف سے وصول ہوئے ہوں۔ **کما فی الاول من کراهته الهندیه خبر الواحد یقبل فی الدیانات کالحل والحرمة والطهارة والنجاسة اذا کان مسلما عدلا۔** ترجمہ: دیانات میں ایک شخص کا قول معتبر ہوگا جس طرح کہ حلال حرام طہارت اور نجاست جب کہ وہ شخص مسلمان عادل ہو۔[1]

رویت ہلال کے خطوط کے لیے کتاب القاضی اے القاضی کے شرائط ضروری نہیں۔ جیسا کہ کتبِ فقہ کے مندرجہ بالا حوالہ جات سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ **دفعا الحرج والضرورة۔**

خلاصۃ المرام قسم دوم میں ریڈیو ٹیلیفون اور تار وغیرہ کی خبر اگر پہچانی ہوئی ہو یا قطعی اور یقینی ہو جیسے حکومتِ وقت کی طرف سے کوئی خبر وغیرہ جو قرائن سے صحیح معلوم ہو تو اعتبار کرنا درست ہے۔

تیسری قسم ہے وہ معاملات جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ انہیں شہادت دو عادل آدمیوں کی اور لفظ شہادت قاضی یا حکم کے روبرو ہونا لازم ہے۔ اکثر احادیث سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ اگرچہ دیانات میں سے ہیں، لیکن ان کا تعلق عوام کے نفع سے بھی ہے۔ لہٰذا باوجود دیانات میں سے ہونے کے جس میں ایک عادل کی خبر کافی ہوتی ہے، جیسا کہ رمضان المبارک کے چاند کی خبر، گردوغبار کی صورت میں ایک آدمی کی بھی معتبر ہوتی ہے۔ لیکن عید کے لیے دو آدمیوں کی رویت اور شہادت عند القاضی یا حاکم ضروری ہے۔

قابلِ غور چیز یہ ہے کہ جو لوگ ریڈیو پر ہلالِ عید کی خبر پر اعتبار کرنے کے مدعی ہیں،

1۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 5 ص 382۔ مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

ان کے پاس صرف یہ دلیل ہے کہ رویتِ ہلالِ عید کے لیے شہادت شرط ہے اور یہ خبر ہے خواہ کتنی ہی یقینی اور موثق کیوں نہ ہو، خصوصاً جب کہ دنیا کی کوئی حکومت کسی قسم کی شہادت بذریعہ تار ٹیلیفون ریڈیو وغیرہ جائز اور معتبر نہیں سمجھتی ہے، بات کسی حد تک درست ہے لیکن ان حضرات نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ ریڈیو پر رویت کی شہادت نہیں دی جا رہی تا کہ آپ اس کے قبول یا رد کے متعلق کچھ ارشاد کریں۔ یہاں اس شہادت کی خبر دی جاتی ہے جو ہلال کمیٹی کے سامنے ثقہ اشخاص نے دی ہے اور علماء کمیٹی نے جو ثقہ اور معتبر ہوتے ہیں، حکم دیا ہے کہ عید کرنی درست ہے۔ حضرت رویتِ ہلال جہاں با شہادت ثابت ہو جائے اور قاضی یا حکم یا کمیٹی کا حکم بذریعہ ریڈیو آپ تک پہنچایا جائے، جو یقیناً صحیح اور قطعی ہے۔ حکومت روزانہ اپنے تمام اہم احکام بذریعہ ریڈیو نشر کر کے لوگوں تک پہنچاتی ہے اور انہیں ہر شخص صحیح اور قابلِ عمل سمجھتا ہے تو کیا اس خبر کے دوسروں تک پہنچانے کیلئے بھی شہادت شرط ہے جو یقیناً نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نظامِ حکومت قائم رکھنے کے لیے تمام احکامِ شرعیہ خواہ معاملات کے ساتھ متعین ہوتے تھے یا دیانات کے ساتھ، صرف ایک ثقہ آدمی کو بھیج کر بذریعہ خط مطلع کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں ہے:

قال فی العیون والفتویٰ علی قولها اذا تیقن انه خطه سواء کان فی القضاء والروایة او الشهادة علی الصک... ماذا تیقن جاز الاعتماد علیه توسعته علی الناس۔[1] لہٰذا اگر تار یا خطوط یا ٹیلی فون مختلف اطراف سے آ جائیں کہ فلاں جگہ فلاں آدمی نے چاند دیکھا ہے، فلاں عالم یا قاضی یا حاکم نے حکم دیا ہے کہ کل عید ہو گی تو یہ خبریں معتبر ہوں گی۔

درالمختار فی الذخیرۃ میں ہے: **قال الشمس الائمه الصحیح من مذهب**

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ ج4 ص310)

اصحابنا ان الخبر اذاستفاض وتحقق فیما بین اھل البلدۃ الاخری یلزمھم حکم ھذا البلدۃ اھ......

ترجمہ: شمس الائمہ نے کہا کہ ہمارا صحیح مذہب یہ ہے کہ جب خبر مشہور ہو جائے اور دوسرے شہر والوں کے درمیان ثابت ہو جائے تو ان پر یہ حکم لازم ہوگا۔[1]

اب استفاضہ اور تحقق کا ذریعہ چونکہ قدیم زمانے میں سوا بہت سے آدمیوں کے آ کر اطلاع دینے کے اور کوئی نہیں تھا، اس لیے شامی لکھتے ہیں: **قال الرحمتی معنی الافاضۃ ان تاتی من تلک البلدۃ جماعات متعددون کل منھم یخبر عن اھل تلک البلدۃ انھم صاموا قلت ھو کلام حسن ویشیر الیہ قول الذخیرۃ اذاستفاض وتحقق فان التحقق لایوجد بمجرد الشیوع** اھ......

ترجمہ: رحمتی کہتے ہیں کہ افاضہ کا معنی یہ ہے کہ اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں جو کہ ان میں سے ہر ایک اس شہر والوں سے خبر دیں کہ انہوں نے روزہ رکھا۔ میں کہتا ہوں یہ اچھا کلام ہے اور اسی کی طرف ذخیرہ کے قول سے اشارہ ملتا ہے یعنی جب خبر مشہور ہو جائے اور ثابت ہو جائے کیونکہ صرف تحقق محض شہرت کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔[2]

معلوم ہوا علامہ شامی اس خبر کے لیے استفاضہ یعنی شہرت کافی نہیں سمجھتے بلکہ تحقق ضروری سمجھتے ہیں۔ خواہ وہ جماعات متعددون کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے۔

شامی میں ہے:

فکانت تلک الاستفاضۃ بمعنی نقل الحکم المذکور وھی اقوی من الشھادۃ......

۱۔(درمختار۔ص145۔مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

۲۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص,102 مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

ترجمہ: تو یہ استفادہ نقل مذکور کے حکم میں ہوگا اور یہ شہادت سے زیادہ قوی ہے۔[1]

لیجئے صاحب! گویا استفاضہ اور شہرت نقل حکم کا حکم رکھتے ہیں اور وہ شہادۃ سے زیادہ اقوی ہے، تو یقیناً ریڈیو کے ذریعے صرف نقل حکم ہوتا ہے جو قطعی اور موثق ہوتا ہے جس میں خطا اور آمیزش کا قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا استفاضہ اور تحقق موجود ہو گیا۔ باقی اس تحقق کے ذرائع ہر زمانہ میں مختلف ہوتے ہیں اور احکامِ شرعی بھی زمانہ کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتے جاتے ہیں۔ شامی میں ہے: **اقول انت خبیر بان کثیرا من الاحکام تغیرت لتغیر من الزمان...**

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ تو اس بات سے خبردار ہے کہ بہت سارے احکام زمانے کے تبدیل ہونے کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔[2]

درالمختار میں ہے: **فیلزم اہل المشرق برویۃ اہل المغرب اذا ثبت عندھم رویتہ اولئک بطریق موجب کما مرّ** اھ ک......

ترجمہ: لہٰذا اگر اہل مغرب چاند دیکھیں تو ان کی رویت یعنی چاند دیکھنا بطریقہ موجب اہل مشرق کو ثابت ہوگی ۔[3]

درالمختار میں ہے کہ جہاں حاکم نہ ہو، وہاں دو عادل آدمیوں کی خبر معتبر ہوتی ہے اور علۃ للضرورۃ قرار دی ہے تو ان سب حوالہ جات سے واضح ہے۔ کہ ثبوت ہلالِ عید کے لیے شہادت حاکم کے نزدیک شرط ہے اور نقل حکم مذکور کے لیے خبر موثق اور تحققِ رویت کافی ہے، خصوصاً جہاں حاکم نہیں ہوتے۔

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص102)

[2]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص101)

[3]۔(درمختار۔ص145 مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

جیسا کہ تمام فقہا شہر کے گردونواح میں رہنے والوں کے لیے توپ کی آواز یا نقارۂ مخصوصہ جس کا پہلے سے اعلان کیا گیا ہو، کہ اگر چاند ہو گیا تو نقارہ یا توپ کے ذریعے اطلاع دی جائے گی تو ان کے لیے ویسی کسی قطعی علامت پر عید جائز ہے۔ ریڈیو سے زیادہ موثق ذریعہ نقل حکم کا موجودہ زمانہ میں یا اس سے قبل بھی آج تک اور کوئی ایجاد نہیں ہوا تو ریڈیو کی اس قسم کی اطلاع کہ فلاں فلاں جگہ پر رویت ہوئی ہے اور وہ مختلف اطراف سے اور اس قدر کثیر ہوں کہ متواتر کہی جا سکیں، یا فلاں شہر کی ہلال کمیٹی کے سامنے اتنے آدمیوں نے شہادت دی ہے، اور انہوں نے یہ حکم دیا ہے تو یہ خبر معتبر ہوگی۔ باقی رہا ضد یا عناد یا جہالت، تو اس کا کوئی علاج ہی نہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ چونکہ اکثر فاسق ہیں، لہٰذا ان کی کسی قسم کی اطلاع معتبر نہیں، تو مودبانہ عرض ہے کہ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں کیا صحابہ دین کے جملہ معاملات میں انہی کے احکام کے ماتحت ادا نہیں کرتے تھے؟ الغرض نقل حکم کا ذریعہ وہ آلہ ہے جو فاسق نہیں اور خبر دینے والے اگر فاسق ہوں تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے **فَتَبَيَّنُوا** ...... یہاں کوئی شہادت موجود نہیں بلکہ نقل حکم کا ایک یقینی ذریعہ ہے۔ یعنی تم خود اس کی بات سن کر سحری کرو اور صادق اور کاذب کا امتیاز کرو نہ یہ کہ اس کی خبر ہی باطل قرار دے دو۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ مولوی عبدالحیی وفتاویٰ امداد یہ در حکم تار و خطوط کہ اگر خطوط از بلادِ مختلفہ آمدند کہ از انہا خبر رویت ہلال بحر استفاضہ تمبز لۂ تواتر رسیدہ و افادھہ یقین دہد پس بموجب آں عمل باید کرد اگر باین مرتبہ نباید عمل نباید کرد۔[1] کذا فی الدر المختار وھکذا قال القاضی خان: **والمعتبر یقین اهل العلم فی البلدة لا یقین العوام**......

ترجمہ: اور معتبر شہر میں اہل علم کا یقین ہے عوام کا یقین نہیں ہے

---

[1] ۔(فتاویٰ مولوی عبدالحیی ۔کتاب الصوم ۔ص 257)

یعنی اس حکم کی صورت اور سقم کا امتیاز وثوق اور شہرت کا یقین کرنا یہ اہلِ بصیرت اور اہلِ علم کا کام ہے۔ عوام کا تیقن معتبر نہیں کیونکہ وہ تو صرف خلاصی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ مکرر سمجھنے اور ملحوظِ خاطر رکھنے کے لیے اصل بات کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ بات تو متفق علیہا ہے کہ رویتِ ہلال کے لیے شہادت معتبر ہے۔ لفظ خبیر معتبر نہیں۔

لہٰذا اگر ریڈیو پر صرف خبریں ذکر کر دی جائیں کہ فلاں فلاں جگہ چاند دیکھا گیا ہے، جس میں نہ دیکھنے والے کا ذکر ہو نہ عادل غیر عادل کا ذکر، نہ کسی اہلِ علم کا قبول ورد مذکور ہو تو ایسی خبر ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ اگر چاند دیکھنے والے عادل اور قابلِ شہادت آدمی چند اہلِ علم کے سامنے شہادت دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے، اور وہ علماء کی جماعت ان کی شہادت قبول کر کے حکم دیتی ہے کہ کل عید ہوگی تو اس حکم کو ریڈیو والے منتقل کرتے ہیں کہ فلاں ہلال کمیٹی کے علماء کے سامنے شہادت ہوئی ہے اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ کل عید ہوگی تو یہ خبر قابلِ قبول ہے کیونکہ یہ نقل حکم ہے، شہادت نہیں اور نقل حکم میں شرعاً خبر موثق ومعتبر ہے۔ کما مرا؛ بستیوں میں، شہروں میں ہر جگہ جہاں بھی شہادت ہوتی ہے تو قاضی اور حاکم کے حکم پر ڈھول اور منادی توپ نقارہ وغیرہ سے شہر وگرد ونواح میں مشتہر کیا جاتا ہے۔ کسی اہلِ علم وعقل نے ہر شخص یا ہر محلہ یا ہر بستی والوں کے لیے فی شہادت کے مہیا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ واللہ اعلم بالصواب

ھدایہ کتاب الشہادت فصل فیما یتحمل الشاہد میں ہے:

انما یجوز للشاھد ان یشھد بالاشتھار وذلک بالتواتر۔ (اشتہار حکمی)

او باخبار من یثق بہ کما قال فی الکتاب جامع الصغیر (اشتہار حقیقی)

ترجمہ: اشتہار کے ساتھ گواہی دینا جائز ہے اور اشتہار تواتر سے ہوگا۔ یا کسی معتمد

کے خبر دینے سے ہوگا۔[1]

غالبا فقہ حنفی میں خبر موثق کے سلسلہ میں دونوں باتیں استعمال ہوسکتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۴۱

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید نے چوری کی تھی اور اس نے حلف اٹھائی ہے کہ اگر میں نے یہ چوری کی ہو تو میری عورت مجھ پر تین طلاق، لیکن دو تین آدمی جو نشانات پاؤں پہچاننے والے سمجھے جاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ نشانات اس کے قدم کے ہیں۔ کیا طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

(سائل از میاں والہ)

جواب

اگر عینی شہادت یا اقرار زبانی نہیں ہے تو صرف نشانات کوئی ذریعہ ثبوت نہیں۔ اس طرح اس پر طلاق واقع نہیں ہوسکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائف کے قول کو صرف کفار کو الزام دینے کے لیے ذکر فرمایا ہے کہ تمہارے خیال اور زعم میں چونکہ معتبر ہے، لہٰذا پھر تو میں مستحق نہیں رہا۔

سوال ۴۲

محمد نواز ولد احمد نے کہا ہے کہ اگر تم ترکہ یعنی زیورات وغیرہ جو تمہارے میکے میں

---

[1]۔ (ہدایہ۔ جلد 3، صفحہ 166)

ہیں، نہ لائی اور میں تجھے گھر بٹھاؤں تو تُو مجھ پر عمر طلاق ہے۔ پھر بذریعہ محمد نواز ہمسایہ اس نے بغیر وہ ترکہ واپس لائے گھر میں ایک رات گزاری، دوسرے دن پھر میکے چلی گئی۔ کیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب

عمر طلاق، فقہ حنفی میں کوئی طلاق کا لفظ نہیں ہے لیکن اگر کلما کا ترجمہ سمجھا جائے یعنی ایسی طلاق کہ پھر تا زندگی نکاح نہ ہو سکے، اسے عرفاً عمر طلاق سمجھا جاتا ہے تو بھی تزوج جدید کے ساتھ متعلق ہوگی۔ جب تک یہ تفصیل نہ کرے کہ ہر عورت جو اس وقت میرے نکاح میں ہے یا بعد میں نکاح کروں گا، اس پر طلاق واقع ہو۔ کیونکہ کلما اتزوج منکوحہ پر وارد ہی نہیں ہوتا یعنی یہ کنوارے کے لیے تو اثر انداز ہو سکتا ہے، شادی شدہ پر نہیں۔ ہاں اگر پھر نکاح کرنے کی نوبت آ جائے تو بغیر فضولی نکاح ناجائز ہوگا۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے

الفاظ التی للشرط بالفارسیة، اگر و همی و همیشه و هر گاه و هر زماں و هر بار ... فالاول بمعنی قوله ان فلافلا یحنث الامرة والثانی بمعنی متی فلا یحنث الامرة الثالث کالثانی و معنا هما واحد و فی الرابع والخامس یحنث مرة لانه بمعنی کل وهو الصحیح والسادس بمعنی کلما الخ......

ترجمہ: اگر وہمی و ہمیشہ ہرگاہ ہرزماں ہر بار پس لفظ اِن (اگر) ان کے معنی میں ہے تو پس حانث نہ ہوگا مگر ایک مرتبہ اور دو بمعنی متی ہے کہ اس میں بھی ایک مرتبہ حانث ہوگا اور سوم مثل دوم کے ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں اور چہارم اور پنجم میں بھی ایک مرتبہ حانث ہوگا اس لیے کہ یہ لفظ کل کے معنی میں ہے، یہی بات صحیح ہے اور ششم کلما کے معنی میں ہے۔[1]

---

[1]۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 1 ص 452، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

علاوہ ازیں جہاں طلاق کی صفت ایسی ذکر کی جائے جو درحقیقت صفت نہ ہو سکے تو وہاں صفت لغو ہو جاتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے...... **الاصل انه متی وصف الطلاق ان کان وصفا لایوصف به الطلاق یلغوا الوصف ویقع رجعیا۔مثال: انت طالق طلاقا لم یقع علیک وان کان وصفا یوصف به الطلاق فلا یخلوا اماان لاتنبئ** الخ......

ترجمہ:اور اصل یہ ہے کہ جب اس نے طلاق کے ساتھ وصف بیان کیا پس اگر ایسا وصف ہو کہ جس سے طلاق موصوف نہیں ہوتی تو وہ وصف لغو ہوگا اور طلاق رجعی واقع ہو گی۔جیسے انت طالق طلاقا اور جب ایسے وصف کے ساتھ موصوف کیا کہ وہ طلاق کی صفت ہوتا ہے تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ایسا لفظ ہوگا کہ وہ زیادتی ہونے پر دلالت کرنے والا نہیں ہے جیسے احسن الطلاق وغیرہ یہ ایک طلاق رجعی ہوگی یا ایسا وصف ہوگا جو زیادت پر دلالت کرنے والا ہے جیسے اشد الطلاق وغیرہ تو یہ طلاق بائن ہوگی۔[1]

عمر طلاق کی صفت واقع ہوسکتی ہے کیونکہ یہ ہر زمان کے ہم معنی ہے۔دومؔ عمر ایک وقت ہے اور وقت اور زمان طلاق کی صفت بن سکتا ہے اور وصف جب زیادتی پر دال ہو کا شد الطلاق وغیرہ تو اس سے بائن طلاق واقع ہوتی ہے،لہٰذا تجدیدِ نکاح ضروری ہے۔

مسئلہ مندرجہ بالا کے متعلق مولانا عطا محمد صدر مدرس مدرسہ ضیاء شمس الاسلام سیال شریف کے تاثرات جو قابلِ غور ہیں، درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ طلاق میں اضافت موجودہ منکوحہ کی طرف معتبر ہوگی۔درالمختار میں ہے: **علی الطلاق لا افعل کذا بمنزلة ان فعلت فانت طالق فهو فی العرف مضاف الی المرءة معنی و الی ان قال، واما قوله علی الطلاق** (مجھ پر طلاق ہے) **فان معناه و**

---

[1]۔(فتاویٰ عالمگیری۔ج1ص407،مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

قوع طلاق المرءة علی الزوج۔ چونکہ خطاب خاص عورت کو ہے، لہٰذا اضافت مخاطبہ کی طرف ہوگی۔

عمر طلاق کی تحقیقِ مختصر بندہ کے نزدیک یہ ہے کہ طلاق ایک وقت میں واقع ہوتو تمام اوقات میں واقع ہوتی ہے، اسی طرح ایک مکان میں واقع ہوتو تمام مکانوں میں واقع ہوگی خواہ رجعی ہو یا نہ۔ تمام اوقات اور تمام امکنہ میں وقوع کے لیے تعدد طلاق کی ضرورت ہر گز نہیں۔ مثلاً کسی نے کہا ''انت طالق'' تو یہ رجعی طلاق تمام امکنہ اور تمام اوقات میں اس پر واقع ہوگی یعنی عمر بھر اس پر یہی طلاق رہے گی۔ جب تک اس کا تدارک نہ کرے۔ تو اس سے واضح ہو گیا کہ عمر بھر تمام اوقاتِ زندگی کے لئے صرف ایک طلاق رجعی کافی ہے۔ اگر اس کا تدارک کرلیا گیا تو وہ بھی نہ رہی۔ شامی میں ہے: **متی وقع فی مکان وقع فی کل الاماکن (الی) متی طلقت فی وقت طلقت فی سائر الاوقات**۔ اس تمہید کے بعد عمر طلاق کے ظاہراً دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اول تمام عمر میں طلاق ہے۔ دوم عمر بھر طلاق ہے۔ جس طرح قرءت الیوم اور قرءت فی الیوم، اول الذکر میں واضح ہے کہ اوقات زندگی میں صرف ایک ہی رجعی واقع ہوگی اور موخر الذکر کا بھی یہی حکم ہے کہ کمامر امثال ملاحظہ ہوں: **انت طالق فی ثلثة ایام تنجیز (الی) یوم القیامة لغو و قبله تنجیز لان القبلیة ظرف متسع فیصدق بحین التکلم**۔ اسی طرح عمر بھی متسع ہے۔ اول الذکر کے امثال ہیں: **انت طالق کل یوم او کل جمعة اوکل شهر و لا نیة له تقع واحدة حاصله ان نوی بالجمعة الاسبوع او اطلق فواحدة**۔ اسی طرح عمر طلاق یعنی عمر بھر کے لیے ایک طلاق کافی ہے، جس کا ذکر زوج نے کیا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ کل یوم اور کل جمعة میں کل افرادی کا ارادہ کیا، تین دن میں مثلاً تین طلاقیں واقع ہوں گی اور اگر مجموع کا ارادہ کیا یا کوئی ارادہ نہ کیا تو صرف ایک عمر طلاق میں صرف مجموع پر دلالت ہے۔

دوسرے معنی کی لحاظ سے اور مجموع کے افراد میں تعدد نہیں۔ یہاں چونکہ کل کا لفظ نہیں، لہٰذا تعدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا عبارات سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ایک رجعی اسی عورت پر واقع ہوگی۔

(۸ جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ)

سوال ۴۳

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص نے اپنی نابالغہ لڑکی کا نکاح کر دینے کے وقت یوں کہا کہ ''فلانی لڑکی میں تینوں نکاح کر ڈِتی واسطے فلانے لڑکے تیڈے دے'' ......تو جواب میں کہا کہ ''میں قبول کر گھدی فلانے لڑکے واسطے'' کیا اس طرح الفاظ سے نکاح قائم ہوا یا نہ کہ نسبت نکاح ہے ارادہ کی طرف ہے۔

خصوصاً شامی ص ۲۸۲ - ۲۸۳ ج ۲ کو ملحوظ رکھ کر جواب لکھیں۔

جواب

نوٹ: یہ تحریر بہت ابتدا کی ہے۔ اس میں بھی فقہی طور پر علامہ کے کلام پر جو اعتراض ہیں، وہ قابلِ توجہ ہیں لیکن جہاں لڑکے کا باپ کہتا ہے کہ میں نے قبول کی ہے اور بس تو یقیناً نکاح نہ ہوگا جیسا کہ اصل تحریر میں بالآخر عرض کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میرے ذہن نارسا اور فہم قاصر میں لڑکے کا نکاح ہوگا، گو ظاہراً زوجتک بنتی لابنک، اور مندرجہ بالا الفاظ ملتے جلتے ہیں کیونکہ علامی شامی آگے خود تسلیم کر رہے ہیں کہ **اعطیتک بنتی لابنک** کا معنی **اعطیتک بنتی زوجۃ لابنک؛ وھذا المعنی وان کان ھو المراد عرفا من قولھم زوجتک بنتی لابنک لایساعدہ اللفظ**......

ترجمہ: **اعطیتک بنتی لابنک** کا معنی **اعطیتک بنتی زوجة لابنک** (یعنی میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تیرے بیٹے کے ساتھ کر دیا) یہ معنی اگرچہ عرف عام میں ان کے قول **زوجتک بنتی لابنک** (یعنی میں نے اپنی بیٹی کا تیرے بیٹے سے نکاح کر دیا) کا معنی ہے لیکن لفظ اس کے موافق نہیں۔[1]

حالانکہ خود دوسری جگہ علامہ ارشاد فرما رہے ہیں، **والعرف فی الشرع له اعتبار لزا علیه الحکم قد یدار**......[2]

جب حکم کی دارومدار عرف پر ہے اور علامہ تسلیم فرما رہے ہیں کہ عرفا نابالغہ کے نکاح کر دینے کے لیے یہی الفاظ معروف ہیں تو پھر نامساعدت الفاظ کا عذر لنگ نامناسب ہو گا۔ علاوہ ازیں یہ صرف ان کا اپنا خیال ہے۔ **کما هو ظاهر من قولهم ویظهرلی انه ینعقد للاب لاسناد التزویج... واعلم یااخی اسناد تزویج** مخاطب کی طرف ہونا ہرگز مضر نہیں۔ جب بعد والے کلام صدر کلام کے حکم کی مغیر ہو مثلاً باتفاق فقہا "**انت طالق ان دخلت الدار**" میں طلاق کی نسبت عورت کی طرف ہونے کے باوجود طلاق منجز نہیں رہے گی بلکہ معلق ہو جائے گی۔ بعینہ اسی طرح اگر وہ بعد میں "واسطے لڑکے تیڈے دے" نہ کہتا تو بلاشک باپ کا نکاح ہو جاتا گویا "لابنک" بعد میں ایسا لفظ موجود ہے جو پہلے کلام کا معنی بدل دیتا ہے۔ **هذا هو مصرح عند اهل الاصول**۔

ثالثاً لڑکے کے باپ کا کہنا کہ "قبول کر گھدی واسطے فلانے لڑکے دے" صراحتہً "قبلت لابنی" ہے۔ اب اگر لڑکی والے کے کلام کا معنی بقول حضرت علامہ یہی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ لڑکی میں نے تمہیں نکاح کر دی ہے اور قبول کرنے والا کہتا ہے کہ میں نے اپنے

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2، ص299، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

[2]۔ (فتاویٰ شامی، ج2 ص391 مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

لڑکے کے واسطے قبول کر لی ہے تو ایجاب وقبول کے مختلف ہونے کی صورت میں نہ باپ کا نکاح ہوگا نہ بیٹے کا۔ لہٰذا پھر دوبارہ ایجاب وقبول صحیح طور پر کرنے سے لڑکے کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ نہ یہ کہ منکوحۃ الاب ہونے کی وجہ سے حرام ہو چکی ہے۔ لیکن کیا ہماری عرف میں نابالغہ کی تملیک کیلئے ان الفاظ کے سوا کوئی دوسرے لفظ موجود ہیں؟

گستاخی معاف چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔

(۱۵ رجب ۷۴ ۱۳ھ)

سوال ۴۴

مسمی محمد اکبر صاحب ولد غلام سرور صاحب سکنہ ٹبہ یٰسین داخلی کڑی خیسور کے فیصلہ نکاح میں جو امور تنقیح قائم ہوئے، وہ مندرجہ ذیل تھے۔ افادۂ خلق اللہ کیلئے تحریر کر دیے گئے ہیں تا کہ ناظر کو دوبارہ کتب بینی کی ضرورت نہ پڑے۔

۱۔ امور تنقیح، نکاح کے بارے میں شہادت بالتسامع جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ گواہ کی عدالتِ ظاہری پر اکتفا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

۳۔ گواہ کو حلف بالطلاق دینی جائز ہے یا نہیں؟

۴۔ اقرار بالنکاح یا کتابت بالنکاح سے نکاح ہو جاتا ہے یا نہیں؟

جواب

۱۔ نکاح اور موت میں شہادت بالتسامع جائز ہے۔

بان سمع ناسا یقولون انا فلانا تزوج بفلانة ۔

ترجمہ: لوگوں سے سنا ہے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ فلاں مرد نے فلاں عورت سے نکاح کیا۔[1]

ھدایہ میں ہے **فانہ یسعہ ان یشھد بھذہ الاشیاء اذا اخبرہ بھا من یثق بہ**

ترجمہ: چنانچہ اس کے لیے ان چیزوں (یعنی نکاح، موت وغیرہ) کی گواہی دینا جائز ہے بشرطیکہ گواہ کو ان چیزوں کے متعلق کسی باعتماد آدمی نے خبردار کیا ہو۔

۲۔ حدود اور قصاص کے سوا ظاہری عدالت پر اکتفا کرنا چاہیے۔

ھدایہ میں ہے۔ **قال ابو حنیفہ** رحمۃ اللہ علیہ **یقتصر الحاکم علی ظاھر العدالۃ فی المسلم ...** ترجمہ: حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ مسلمان شاہد میں حاکم ظاہری عدالت پر اکتفا کرے۔[2]

قال ابو یوسف ان الفاسق اذا کان وجیھا فی الناس ذا مروۃ تقبل شھادتہ۔

ترجمہ: امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر فاسق لوگوں میں صاحبِ حیثیت ہو تو اس کی شہادت قبول ہوگی۔[3]

۳۔ حلف بالطلاق ناجائز ہے۔ **لقولہ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **من کان منکم حالفا فلیحلف باللہ او لیذر۔**

ترجمہ: جو شخص تم میں سے قسم کھانا چاہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قسم اٹھائے یا چھوڑ دے۔[4]

---

[1]۔ (حاشیہ نمبر 12 ہدایہ جلد 3 صفحہ 165، مکتبہ رحمانیہ لاہور)

[2]۔ (ہدایہ۔ ج 3 ص 163، مکتبہ رحمانیہ لاہور)

[3]۔ (ہدایہ۔ ج 3 ص 163، مکتبہ رحمانیہ لاہور)

[4]۔ (حاشیہ نمبر 5، ہدایہ، جلد 3 ص 215، مکتبہ رحمانیہ)

وقیل فی زماننا اذا الح الخصم ساغ للقاضی ان یحلف بذلک لقلة المبالاة بالیمین باللّٰہ وکثرة الامتناع بسبب الحلف بالطلاق۔

ترجمہ: اور کہا گیا ہے کہ ہمارے دور میں اگر مدعیٰ علیہ زیادہ مبالغہ کر جائے تو قاضی کے لیے اس سے قسم دلانے کی گنجائش ہے کیونکہ لوگوں کو اب اللہ کی قسم کی پرواہ کم ہے اور لوگ طلاق کی قسم کھانے سے زیادہ گریز کرتے ہیں۔

محشی لکھتا ہے: **لکنهم قالوا ان نکل عن الیمین لا یقضی علیه بالنکول لانه نکل عما هو منهی عنه شرعا ولو قضی به لم ینفذ قضاءه**

ترجمہ؛ لیکن انہوں نے کہا کہ اگر مدعیٰ علیہ قسم سے انکار کرے تو اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ ایسی چیز کا انکار کر رہا ہے جو شرعاً ممنوع ہے اور اگر قاضی فیصلہ کر بھی دے تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا

۴۔ اقرار بالنکاح نکاح اور اسی طرح کتابت بھی اگر گواہ موجود ہوں اور کتابت یا مافی الکتاب کو جانتے ہوں۔[۱]

سوال ۴۵

باپ بیٹے کے جھگڑے میں بیٹے نے کہا کہ اگر میں تمہارے ترکہ سے کوئی چیز کھاؤں تو مجھ پر میری عورت تین طلاق سے حرام ہے۔ وہ لسی دودھ مکھن وغیرہ جو اس کی طرف ماں باپ علیحدہ تقسیم کر کے کسی کے ہاتھ بھیج دیتے تھے، استعمال کرتا رہا ہے، کیا طلاق واقع ہو جائے گی یا نہیں؟

۱۔(فتاوی شامی۔ج2ص272)

جواب

اولاً، ترکہ کی حقیقت لغویہ وہ مال ہے جو والد مرنے کے بعد چھوڑ جائے مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس شخص کا ترکہ تقسیم کرنا ہے۔ ہماری عرف میں ترکہ کا لفظ مطلق مملوکہ اور مقبوضہ مال پر بولا جاتا ہے مثلاً میرا مال متروکہ یہ ہے یا میرا تو یہی ترکہ ہے، تو گویا حقیقت عرفیہ میں ترکہ سب مال پر بولا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہ حنفیہ کے دونوں قاعدوں کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ اول: **الایمان مبنیة علی العرف عندنا مالم ینو مایحتمله اللفظ**

ترجمہ: قسم کی بنیاد ہمارے نزدیک عرف پر ہے جب تک کہ اس چیز کی نیت نہ کرے جس کا لفظ احتمال رکھتا ہے۔[1]

والثانی الایمان مبنیة علی الالفاظ لا علی الاغراض۔

ترجمہ: قسم کی بنیاد الفاظ پر ہوتی ہے اغراض پر نہیں ہوتی۔[2]

علامہ شامی فرماتے ہیں: **ان قائدة بناء الایمان علی العرف معناه ان المعتبر هو المعنی المقصود فی العرف من اللفظ...**

ترجمہ: یہ قائدہ کہ قسم کی بنیاد عرف پر ہوتی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ عرف میں لفظ سے معنی مقصودی کا اعتبار کیا جاتا ہے اگر چہ لغت یا شرح میں معنی متعارف سے زیادہ عام ہے۔ قاعدہ ثانیہ کا مطلب یہ ہے کہ قسم کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے، اغراض کے ساتھ نہیں۔ یعنی وہ اغراض جو الفاظ سے زائد ہوں، لہٰذا ترکہ چونکہ سب مال مملوکہ مقبوضہ منقولہ غیر منقولہ پر بولا جاتا ہے، اور دودھ لسی نمک مرچ وغیرہ سب اشیاء اس میں شامل ہیں۔

درالمختار میں ہے **وحنث فی لا یا کل طعاما من طعام فلان باکل خله**

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ج 3 ص 78)

[2]۔ (فتاویٰ شامی۔ج 3 ص 79)

وزيته وملحه ولو بطعام نفسه۔

ترجمہ: درمختار میں ہے کہ اگر قسم اٹھائی کہ فلاں شخص کا کھانا نہیں کھائے گا تو اس کے سرکے، روغن زیتون اور اس کے نمک کے کھانے سے اگرچہ اس کو اپنی روٹی کے ساتھ کھائے تو حانث ہو جائے گا۔[1]

علاوہ ازیں کھانے سے مراد مطلق انفاق اور استعمال وغیرہ، ہماری عرف میں عام مستعمل ہے مثلاً چاقو وغیرہ۔ پھر بولا جاتا ہے،''دکھلاؤ یار میں کھا تو نہیں جاؤں گا'' اور فتاویٰ شامی میں ہے :**قال الشر بنلاليه وقد يقال يراد بالاكل الانفاق و فی ای شئی فيحنث به اذا نویٰ فلينظر قلت اذا نوی ذلک فلا کلام اما اذا لم ینو تقییده بالاكل حقيقة** لیکن یہاں کل ترکہ کا ذکر ہے جس میں مکان، غلہ وغیرہ سب آجاتا ہے۔ لہٰذا عام مراد ہوگا یعنی انفاق اور کھانا دونوں، ہاں لفظ عام کی تخصیص میں جس کا احتمال لفظ میں موجود ہو، حالف کا قول دیانۃ معتبر ہوگا۔ عندالجمہور اور قضاء بھی معتبر ہوگا، عندالخصاف، لہٰذا اگر وہ تخصیص کرے کہ اس سے میری مراد فلاں مال تھا تو حلف واقع نہ ہوگی۔

ثانیاً بوجہ اشتراک بھی حلف واقع نہ ہوگی کیونکہ وہ خود ساتھ کماتا ہے اور شادی شدہ ہونے کے وجہ سے تمام مال کا حقدار اور شریک بھی ہے۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے۔

لو حلف لاياكل من ماله شئيا فاشتریٰ بدرهم مشتركة بينهما لم يحنث،

ترجمہ: اگر قسم اٹھائی کہ اس کے مال سے کوئی چیز نہیں خریدے گا پھر ان دراہم کے ساتھ جو اس شخص اور محلوف علیہ کے درمیان مشترکہ ہے اس سے کوئی چیز خریدی تو حانث

---

[1]۔(درمختار۔ص 291، مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

نہیں ہوگا۔[1]

دودھ لسی مکھن غلہ وغیرہ جو بھی تقسیم کر کے ماں باپ اس کی طرف کسی کے ہاتھ روانہ کریں اور وہ استعمال کرے تو حانث نہیں ہوگا۔ خلاصۃ میں ہے **سئل نجم الدین عن ابن بعث الی امه اطعمة فقالت** اگر پیش چیز ہے تو **بخورم فکذا فاکلت من المبعوث لا یحنث لانها اکلت من شئی نفسها . . .**

ترجمہ: نجم الدین سے اُس بیٹے کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جس نے اپنے ماں کی طرف کچھ کھانے بھیجے پھر اس (یعنی ماں) نے کہا کہ اگر میں زیادہ کوئی چیز کھاوں تو اس طرح ہوگا پھر اُس نے بھیجے ہوئے کھانے سے کچھ تناول کیا تو حانث نہیں ہوگی۔[2]

لیکن اگر بغیر حیلہ شرعیہ طلاق معلق سے خلاص نہ ہوا تو باپ کے مرنے کے بعد حقیقتاً ترکہ میں سے کھانے سے پھر ممانعت ہوجائے گی۔

فکذا لو قال لاٰکل من میراث فلان شیئاً فمات فلان فاکل من میراثه یحنث۔ ترجمہ: اگر قسم اٹھائی کہ میں فلاں کے وراثت سے کچھ نہیں کھاوں گا پھر فلاں شخص فوت ہوگیا اور اس کی وراثت سے کچھ کھایا تو حانث ہوجائے گا۔

فالحمدلله علی هذا الجزئیة المصدقة ولله التوفیق بیده ازمة التحقیق۔

سوال ۴۶

مسمات فتح خاتوں قوم پاولی کا نابالغی کی حالت میں (چودہ سال) کی عمر میں والدہ

---

[1]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج2 ص154، کتاب الایمان)

[2]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج2 ص154، کتاب الایمان)

نے اپنے آشنا خدا یار موچی کی معیت سے دوسری قوم میں یعنی جہان موچی کو نکاح کر دیا۔پیش امام نکاح خوان نے اقرار بالبلوغ سے کروایا اور تاریخ پیدائش بھی منگوائی۔آٹھ ماہ تک لڑکی اس رشتہ سے انکار کرتی رہی لیکن بعد میں خدا یار مذکور نے شہر کے روساء کی مدد سے لڑکی رخصت کردی۔ کچھ عرصہ کے بعد لڑکی بھاگ کر واپس ماں کے پاس آ گئی اور عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دیا جو یک طرفہ عدالت میں عورت کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔کیا بغیر ورثاء اور اولیاء کی رضا مندی نابالغہ کا نکاح بذریعہ والدہ غیر کفو میں ہو جاتا ہے؟ بینوا وتوجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

درالمختار میں ہے :**ان کان المزوج غیرھما لا یصح النکاح من غیر کفوا و بغبن فاحش اصلاً،**

ترجمہ:اگر نکاح کر دینے والا باپ دادا کے علاوہ ہو تو غیر کفو میں نکاح صحیح نہیں ہوگا یا غبن فاحش کے ساتھ ہو تو پھر بھی نکاح صحیح نہیں ہوگا۔[1]

فتح القدیر میں ہے: **ولو زوجھا بحضرتھا بغیر کفو فسکتت لم یکن رضاً فی قول محمد بن سلمۃ وھو قول ابی یوسف ومحمد۔**

ترجمہ:اگر اُس (عورت) کی موجودگی میں اس کا نکاح غیر کفو میں کیا اور وہ خاموش رہی تو یہ رضا مندی نہیں ہوگی یہ محمد بن سلمہ کا قول ہے اور اسی طرح امام ابو یوسف اور امام محمد صاحب رحمہا اللہ کا قول ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **وروی الحسن عن ابی حنیفۃ ان النکاح**

---

[1]۔(درمختار۔ص 184،باب ولی،مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

لاینعقدو وبه اخذ کثیر من المشائخ کذا فی المحیط والمختار للفتویٰ فی زماننا روایۃ الحسن وقال الشیخ الامام شمس الائمۃ السرخسی روایۃ الحسن اقرب الی الاحتیاط کذا فی قاضی خان وفی مجمع الانہر لان کم من واقع لا یرفع ۔ و علیہ فتویٰ قاضی خان و ھذا اصح واحوط والمختار للفتویٰ فی زماننا اذلیس کل ولی یحسن المرافعۃ ولاکل قاضٍ یعدلہٗ خصوصاًاذاوردامر السلطان ھکذااوامر بان یفتیٰ بہ

ترجمہ:اورحسن نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ نکاح منعقدنہیں ہوتا اوراسی کو اکثر مشائخ نے لیا۔اسی طرح محیط میں ہے اور ہمارے زمانے میں فتویٰ کے لیے مختار روایت حسن کی ہےاور شیخ امام شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ حسن کی روایت احتیاط کے زیادہ قریب ہے اسی طرح فتاویٰ قاضی خان اور مجمع الانہر میں ہے کیونکہ بہت سارے واقعات جن کو قاضی کی طرف نہیں اٹھایا جاتا اوراسی پر قاضی خان کا فتویٰ ہے۔

اورمختار ہمارے زمانے میں یہ قول اسی لیے ہے کیونکہ ہر ولی قاضی کی طرف معاملے کو لے جانے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا۔اورنہ ہی ہر قاضی اس کو عدل وانصاف دے گا۔صرف قابلِ غورامر یہ ہے کہ پاولی اورموچی غیر کفو ہیں اورحرفۃ کا کفو میں اعتبار بھی ہے یانہیں۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے : **وفی ظاھر الروایۃ عن ابی حنیفۃ لاتعتبر الحرفۃ ویکون البیطار کفواًللعطار وفی قول ابی یوسف وفی احدی روایۃ عن ابی حنیفۃ صاحب الحرفۃ الدنیئۃ کالبیطار والحجام الحائِک والکناس والدباغ لایکون کفواللعطار . . . وقیل ھذااختلاف عصروزمان فی زمن ابی حنیفۃ لایعدون الدنائۃ فی الحرفۃ منقصۃ ذلک منقصۃ فی**

زمانهما۔

ترجمہ: امام اعظم ابوحنیفہ سے ظاہر روایت کے مطابق کفائت معتبر نہیں ہے چنانچہ بیطارء (یعنی جولوگ جانوروں کا علاج کرنا جانتے ہیں) مرد قوم عطار کی عورت کا کفو ہوگا ۔اورامام اعظم سے ایک روایت کے موافق اور صاحبینؒ کے قول کے موافق جس کا پیشہ گھٹیا اور ذلیل ہو جیسے بیطار ہو حجام، جولاہا و بھنگی موچی تو وہ عطار اور بزاز وصراف کا کفو نہ ہوگا اور یہی صحیح ہے۔[1]

اس زمانہ میں کپڑے کے کارخانوں کی کثرت اورفن پارچہ بافی کے عام اور مقبول ہونے کی وجہ سے یہ پیشہ معزز ہو گیا ہے۔سب قومیں سید پٹھان مغل شیخ راجپوت وغیرہ کارخانوں میں ملازم ہو کر کاریگر کہلانا فخر سمجھتے ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: **والحق اعتبار ذلک سواء کان هذا المبنی اولا فان الموجب هو انتقاص اهل العرف فیدو رمعه فعلی هذا ینبغی ان یکون الحائک کفوا للعطار لا سکندریة لماهناک من حسن اعتبار ها وَعَدْمِ عَدِّهَا نَقصًا خلاصة المرام بقول فقهاء......**

ترجمہ: خلاصہ عبارت یہ ہے کہ اگر عرف عام میں کسی پیشے کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے تو وہ مرد اعلیٰ پیشے والی عورت کا کفو نہیں ہوگا صاحب فتح القدیر کے علاقہ السکندریہ میں جولاہا کو عطار کی کفو اس لیے قرار دیا گیا کیونکہ وہاں اس پیشے کو گھٹیا نہیں سمجھا جاتا تھا۔لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرفت (یعنی پیشہ) میں کفائت کا دارومدار عرف پر ہوگا۔[2]

چونکہ غیر کفو میں فسخ نکاح کے لیے بھی قضا شرط ہے، لہٰذا حاکم اس کو فسخ کرسکتا ہے۔

---

[1]۔(فتاویٰ قاضی خان۔ج1 ص309 فصل فی الکفاءۃ)

[2]۔(فتح القدیر۔ج3 ص193، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

ہذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

سوال ۴۷

میتۃ کی چربی سے صابن بنانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب

مفصل طور پر یہ مسئلہ جواب در سوال ۴۳ میں گزر چکا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہاں انقلاب حقیقت ہوجاتا ہے، اس لیے یہ جائز ہے۔ بعض جگہ ضرورت ہے اور بعض جگہ عموم بلویٰ اور بعض جگہ انقلاب عین۔ انقلاب عین درحقیقت خود بذاتہٖ ممکن ہے یا محال۔

فتاوی شامی میں ہے: مسئلہ کیمیا کے ماتحت ذکر کیا ہے۔[1]

وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تو انقلاب حقیقت کجا انقلاب وصف بھی نہیں ہوتا کیونکہ چکنائی بدستور موجود ہوتی ہے۔ اس کو ناپاک تیل پر قیاس کرنا درست نہیں، وہ اصل میں پاک تھا۔ عارضہ کی وجہ سے پلید ہوگیا اور عموم بلوی کے لیے اجازت دے دی گئی کیونکہ گھروں میں اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔ اور چربی میتۃ تو فی ذاتہٖ حرام اور ناپاک ہے۔ یہی چیز تو صحابہؓ کرام نے دریافت کی کہ کس طریقہ سے کھانے کے سوا مثلاً چراغ جلانا یا کشتیاں چیڑنا جائز ہوجائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: **لا وھو حرام** ...... اور یہی ظاہر منطوق نص وحرمت علیکم المیتۃ الخ ...... بجا ہے۔ درالمختار میں ہے: **لا یَضُرّ اثر دُھن الا دھن ودُکِ میتۃٍ لانہ عین النجاسۃ حتّٰی لا یُدبَغ جِلد بل یُستَصبَحُ بہ فی غیر المسجد۔**

ترجمہ: اور ناپاک تیل کی چکنائی کا باقی رہنا پاک ہونے کے لیے نقصان دہ نہیں ہے

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ باب الانجاس۔ ص 228)

البتہ مردار جانور کی چکنائی کا باقی رہنا پاکی کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے کہ وہ عین نجاست ہے حتیٰ کہ اس سے چمڑے کو نہیں رنگا جائے گا۔ اور نہ مسجد میں اس سے روشنی کی جائے گی مسجد کے سوا کسی دوسری جگہ میں اس کو چراغ میں روشنی کے لیے جلا سکتے ہیں۔[1]

جو چیز عین النجس ہے اور حرام ہے، وہ دوسرے کو کس طرح پاک کرے گی؟ اس میں تو نام بھی مکمل طور پر نہیں بدلا۔ لوگ کہتے ہیں میوے کے تیل کا صابن، کھوپرے کا صابن، چربی کا صابن وغیرہ۔ ہٰذا ما عندی والعلم عند اللہ۔ (۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء)

سوال ۴۸

کیا جنازہ پڑھ لینے کے بعد دعا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اسے منع کرتے ہیں۔

جواب

سوال ۱۳ میں اس سوال کا جواب بالدلائل گزر چکا ہے۔ وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم میں: **أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ**۔

جب دعا کی جائے، اللہ قبول فرماتا ہیں۔ لہٰذا دعا کی ہر وقت عام اجازت ہے۔

حدیث شریف میں: **اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعا**

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم میت پر نماز پڑھ لو تو اس کے لیے خلوص دل سے دُعا کرو۔[2]

یہ فا تعقیب کے لیے ظاہر ہے، لہٰذا ممانعت کی کوئی سند ہو تو پیش کی جائے۔

---

[1]۔ (درمختار۔ ج 1 ص 25، باب الانجاس)

[2]۔ (مشکوۃ شریف۔ ج 1 ص 148)

سوال ۴۹

کیا جب ترک واجب کی وجہ سے نماز باجماعت کا اعادہ کیا جارہا ہوتو اس میں یعنی دوسری جماعت میں کوئی نیا آدمی شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے اس کو منع کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ درالمختار میں ہے کہ یہ جماعتِ ثانیہ صرف تکمیلِ اول کے لیے ہے اور پہلی جماعت سے چونکہ فرض ساقط ہو چکا ہے، لہٰذا بقولہ فقہا مقتدی کو چاہیے کہ امام کی مثل ہو یا کم درجہ، لہٰذا اقتدا ناجائز ہوگی۔

جواب

میرے خیال میں یہ شرکت جائز ہے کیونکہ اول تو درالمختار اور شامی [1] کی عبارت جو نماز کراہتہ تحریمہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ اسی طرح واجب ہے جس طرح ترکِ واجب کی صورت میں اعادہ واجب ہوتا ہے۔ اس میں دو قول ہیں کہ اسقاط فرض اول جماعت کے ساتھ ہو چکا ہے یا دوسری کو فرض کہا جائے گا۔ محقق ابن ھمام نے اول کو ترجیح دی ہے اور ابوالیسر کا قول ہے کہ ثانی کے ساتھ اسقاط فرض ہوگا۔ والمختار ھوالاول کیونکہ تکرار فرض ناجائز ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں یہ کہاں ہے کہ دوسری جماعت میں شرکت ناجائز ہے؟ اگر صرف اس بات سے کہ دوسری جماعت چونکہ صرف تکمیل کے لیے ہے، لہٰذا نفل ہو گی اور مقتدی مفترض ہے اور اس کا حال اقوی ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ سجدہ سہوا گر باقی ہو اور امام سلام پھیر لے اور پھر یاد آنے پر سجدہ کر کے التحیات میں بیٹھا ہے تو اس کی اقتدا صحیح ہے۔

ملاحظہ ہو درالمختار باب سجود والسہو جلد اول۔ حالانکہ اس وقت صلوٰۃ مظنونہ میں جسے

---

[1] ۔(درالمختار/شامی۔ج1ص474)

صاحب ہدایہ نے جلد اول میں ذکر کیا ہے، جس میں امام نے صبی کی امامت کے مسئلہ میں اس گمان پر کہ ایک رکعت یا دو رکعت باقی رہتی ہے، حالانکہ وہ فرض پورے کر چکا ہے، اور اس کی ادائیگی کے دوران میں کسی نے اقتدا کر لی تو وہ یقیناً جائز ہے، حالانکہ وہاں امام یقیناً نفلوں میں مصروف ہے اور اقتداء مفترض بمتنفل ہے اور جائز ہے۔ اور یہاں تو وہ فرض سمجھ کر پڑھ رہے ہیں، نفل کی نیت سے نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۵۰

مسماۃ زینب کی عمر پینتیس سال سے بھی تقریباً زائد ہے، عرصہ ۱۶ سال سے اسے حیض و ماہواری بند ہے۔ اب مس جی ایم سنڈیمن زنانہ ڈاکٹر، ہسپتال ڈیرہ اسمٰعیل خان سے ملاحظہ کرایا گیا اور اس نے لکھا ہے کہ اسے خرابیء رحم کی بہت پرانی بیماری ہے، حمل نہیں، اسے حیض نہیں آ سکتا۔ اسے یعنی مسماۃ مذکورہ کو عرصہ دو سال سے طلاق مل چکی ہے۔ اس کی عدت کس طرح گزرے گی؟ ماہواری کے ساتھ یا مہینوں کے ساتھ؟

جواب

بحر الرائق میں ہے کہ ایسی عورت **واللائی لم یحضن** کے حکم ماتحت ہوگی اور جامع صغیر کی عبارت بھی وہاں درج کی گئی ہے کہ تیس سال تک اگر عورت کو حیض نہیں آیا یا آ کر بند ہو گیا ہے تو وہ آئسہ ہے، آئسہ کے لیے پچاس سالوں کی شرط متفقہ نہیں بلکہ عدم وقوع کا اعتقاد ضروری ہے۔[1]

وکلہ مذکورو محرر فیہ وھو یلیق بالتسلیم والاتباع۔ والعلم عند اللہ

---

[1]۔(بحر الرائق۔ ص130، 131، 138)

(۲۱ صفر ۱۳۷۵ھ)

سوال ۵۱

کیا میلاد شریف جائز ہے حالانکہ قرونِ اولیٰ میں اس کا وجود نہیں اور اس میں قیام وغیرہ اختراعات مباح ہیں یا نہیں؟

جواب

۱۔ میلاد عیدوں کو عید بنانے والی عید ہے کیونکہ دوسری عیدین آنحضرت ﷺ کی پیدائش کی وجہ ہی سے عیدیں بنی ہیں۔ آپ ﷺ باعثِ تخلیقِ عالم وآدم ہیں۔ آپ کے وجود باوجود ہی کے باعث امن، انصاف، شرافت، مساوات کو بہار حاصل ہوئی ہے۔ اگر دنیا کو ان چیزوں کی ضرورت ہے تو وہ اس دن کی یاد منانے پر مجبور ہے۔

۲۔ فتاویٰ رشیدیہ جلد اول میں ہے، کسی شخص نے سوال کیا کہ کسی مصیبت کے وقت بخاری شریف کا ختم کرنا قرونِ ثلاثہ میں ثابت ہے، تو جواب دیا کہ قرونِ ثلاثہ کے وقت بخاری کی تالیف بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس کا ختم درست ہے کہ ذکرِ خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔

اس کی اصل شرع سے ثابت ہے۔ لہٰذا بدعت نہیں۔ بعینہٖ یہی جواب محفلِ میلاد کے باعث ثواب ہونے کے متعلق دیا جاسکتا ہے۔[۱]

۳۔ تفسیر روح البیان میں ہے: **قال الامام السیوطی یستحب ان اظہار**

۱۔(فتاویٰ رشدیہ۔ج1ص264)

الشکر بمولدہٖ علیہ السلام ۔ ترجمہ: امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی ولادت پر شکر کا اظہار کرنا مستحب ہے۔[1]

تصحیح المسائل الشریف میں علامہ ابو شامہ فرماتے ہیں: یہ احسن البدع ہے کیونکہ اس میں فقراء کے ساتھ احسان ہوتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جلالت اور شان کا بیان واظہار ہوتا ہے۔

ملا علی قاری مورد الروی میں فرماتے ہیں: **لا زال اھلُ الاِسلَام یحتفلون فی کل سنة جدیدة ویعتنون بقراءة مولدہٖ الکریم**

ترجمہ: یعنی اہل اسلام ہمیشہ ہر سال محفل میلاد مناتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مولود پڑھنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔[2]

ما ثبت بالسنہ میں ہے:

فرحم اللّٰہ امراء اتخذلیالی شھر مولدہ المبارک اعیادا فیکون اشد غلة علی من فی قلبہ مرض وعناد۔

اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے مہینہ کی راتوں کو عید بنایا تاکہ یہ اس شخص کے لیے جس کے دل میں بیماری ہے اس کے لیے بیماری اور زیادہ ہوجائے۔[3]

مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ ہفت مسئلہ میں فرماتے ہیں کہ مشرب فقیر کا یہ ہے کہ محفل میلاد شریف میں شریک ہوتا ہوں بلکہ ذریعہء برکات سمجھتا ہوں۔ ہر

---

[1]۔(تفسیر روح البیان۔سورت الفتح، آیت 28 ج 9 ص 56، دارالفکر بیروت)

[2]۔(المورد روی فی المولد النبوی مترجم۔ص 24)

[3]۔(ما ثبت بالسنہ۔ص 79)

سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف ولذت پا تا ہوں۔[1]

۴۔ شریعتِ اسلامیہ کا یہ کوئی قانون نہیں کہ جو چیز آیت وحدیث سے ثابت نہ ہو وہ ناجائز ہے بلکہ قانون یہ ہے کہ جو چیز قرآن وحدیث سے ثابت ہے، وہ فرض واجب مستحب یا سنت ہوگی علی حسب قوۃ الدلیل اور جس کو ان سے منع کیا گیا، وہ حرام یا مکروہ ہوگی علی حسب قوۃ الدلیل اور جس کے کرنے یا نہ کرنے کا ذکر نہیں، وہ مباح ہوگی، نہ فرض، نہ واجب، نہ حرام۔

فرمایا: **وَمَآ آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔**

ترجمہ: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ تمہیں عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں منع فرمائیں تو تم باز رہو۔[2]

۵۔ اصل تمام اشیاء کی اباحت ہے۔فرض وجوب تحریم یہ عوارض جن کا تعلق خصوصی دلائل سے ہے، جب فعل وترک پر کوئی دلیل نہ ہو تو وہ مباح ہوگی۔ علامہ شامی فرماتے ہیں: **الاصل فی الاشیاء الاباحۃ ولا بد للکراھۃ من دلیل خاص**...... لہٰذا قیام وسلام کا منع کرنا اور مجلس میلاد شریف کو گناہ و بدعت کہنا دین سے بے خبری و جہالت کی دلیل ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا**...... اور یہ صلوٰۃ وسلام جو کسی مخصوص حالت کے تابع نہ ہو جیسا کہ نماز میں ہے تو پھر تین حالتوں سے خالی نہ ہو گا۔ قیام یا قعود یا لیٹ کر اگر سلام بحالت قیام اس لیے ناجائز ہے۔

کہ آیت وحدیث سے ثابت نہیں تو سلام بحالت قعود و اضطجاع ہر کوئی آیت و

---

[1]۔(کلیات امدادیہ۔ص80)

[2]۔(کنزالایمان۔پارہ28 سورۃ الحشر)

حدیث ارشاد فرمایئے آپ کے اصول کے مطابق تو تینوں حالتیں چونکہ نص سے ثابت نہیں لہٰذا صلوٰۃ وسلام کیسی حالت میں جائز نہیں اور یہی جناب کا مقصد شنیع اور مطلوب فضیح ہے۔

۷۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ سے ذکرِ الٰہی تینوں حالتوں میں جائز ہے اور محمود ہے اور صلوٰۃ وسلام بالاجماع ذکر ہے تو یہ بھی تینوں حالتوں میں جائز ہونا چاہیے۔

۸۔ مطلقاً اہلِ قبر پر جو سلام ''السلام علیکم یا اہل القبور'' پڑھا جاتا ہے، وہ کھڑے ہو کر اور مقابل مواجہہ پڑھا جاتا ہے اور یہاں تو حرمتہ میتا کحرمتہ حیا (یعنی آقا علیہ الصلوۃ والسلام کی اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اسی طرح تعظیم واجب ہے جس طرح کہ آپ کی ظاہری حیات طیبہ میں)۔(شفا شریف)

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

ثم ینهض فیتوجهه الی قبره الشریف فیقف عند راسه مستقبل القبلة ثم یدنو منه ثلاثة ذراع او اربعة ولا یدنو منه اکثر من ذالک ولا یضع علی جدار التربة فهو اهیب واعظم للحرمة ویقف کما یقف للصلوٰة۔

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر کی طرف متوجہ ہو اور سر مبارک کے قریب قبلہ رو کھڑا ہو جائے اور پھر اس سے تین یا چار گز قریب ہو اور اس سے اور زیادہ قریب نہ ہو اور تربت کی دیواروں پر نظر رکھے اس واسطے کہ بہت ہیبت کی جگہ ہے اور عظمت اس کی اعظم ہے اور اس طرح کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔[۱]

۱۔(فتاویٰ عالمگیری۔ج 1 ص 292۔مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

۹۔ علامہ زینی دحلان الدر السنیہ میں لکھتے ہیں: مجلس میلاد کا پہلا منکر عبدالوہاب نجدی ہے۔[1]

جسے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرن الشیطان سے تعبیر فرمایا ہے اور علامہ شامی نے باغی لکھا ہے اور صاحبِ تفسیر صاوی نے خارجی کہا ہے۔ درحقیقت ان چیزوں کا بدعت کہنا ان لوگوں کا مسلک ہے۔ **خذلهم الله تعالیٰ فی الدارین۔**

سوال ۵۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ ایک شخص مسمی زمان عرصہ بیس سال سے فوت ہو چکا ہے۔ اس کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ ایک لڑکی نے اغوا ہو کر شادی کر لی۔ دوسری کو اپنے بھتیجے سے بیاہ کر اپنے گھر میں بٹھایا۔ عرصہ بیس سال سے زائد گزر چکا ہے۔ اس کے سابقہ مکان گر گئے ہیں۔ اس بھتیجے نے نئی چاردیواری مکمل کی ہے اور مکان بھی نئے بنائے ہیں۔ اب دوسری لڑکی کے خاوند نے مطالبہ کیا ہے کہ مجھے بیوی کا حصہ باپ کی جگہ سے دے دو۔ کیا اس کا کوئی حق ہے یا نہیں؟

جواب

اگر اس وقت زمان مذکور کے قبضہ کا کوئی نشان موجود نہیں اور سالم نئے قابض نے بنایا ہے تو شہر کی سکنی زمین پر جو شخص باجازت اعلیٰ مالکان یا صاحبِ خطہ والقبضہ اپنی چاردیواری مکمل کر لے، اس میں دوسرے وارث یا اعلیٰ مالک کا کوئی حق نہیں رہتا۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے: **من احاط حائطا علی الارض فهوله**۔ ترجمہ؛ جو کسی

---

[1]۔ (الدرالسنیہ فی الرد علی الوھابیہ۔ ص 56، مطبوعہ مکتبہ الحقیقۃ ترکیہ)

زمین پر احاطہ بنائے تو وہ زمین اس کی ہوگی ۔[1]

باتفاق محدثین یہ سکنی شہری زمین کے حق میں وارد ہے ورنہ احاطہ سے احیاء مورث تو نہیں ہوجاتا۔

سوال ۵۳

کیا حکم شرعی کے فیصلہ کے بعد کسی اور عالم یا مفتی کے پاس وہ فیصلہ اگر پہنچ جائے اور وہ اس کی تردید کردے تو کیا وہ سابقہ مقضیہ فیصلہ رد ہوسکے گا یا نہیں؟

جواب

آج کل عام لوگ جب ثالث شرعی مقبولہ کا فیصلہ اپنی خواہشات کے خلاف محسوس کرتے ہیں تو کسی الم غلم نیم ملا یا مفتی سے بذریعہ خط غلط بیانی کر کے استفتاء منگوا لیتے ہیں اور اپنی دانست میں سمجھتے ہیں کہ اب ہم آزاد ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اگر ایسا گمان تھا تو انہوں نے ثالث کیوں مقرر کیا تھا؟

جب اس کی ثالثی پر رضا ثابت ہوگئی، پھر اپیل کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ فقہی نقطہء نظر کے طور پر اگر حکم شرعی کا فیصلہ مختلف فیہ مسئلہ میں ایک جانب پر نہیں تھا، تو دوسرا قاضی نہ اپیل سن سکتا ہے نہ پہلی قضا کو رد کر سکتا ہے۔ اگر قضا مختلف فیہ تھی تب دوسرا قاضی اس کو رد کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ دونوں فریق یعنی مدعی اور مدعی علیہ دوسرے شخص کو ازسرِ نو حکم مقرر کریں، تو وہ اس مخصوص صورت میں سابقہ فیصلہ کو رد کر سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ھدایۃ جلد ۳ باب الحجر فی الفساد میں صراحتہً مذکور ہے۔

---

[1]۔ (مشکوۃ شریف۔ ج 1 ص 265)

سوال ۵۴

ایک شخص دو گواہوں کو ساتھ لے کر دوسرے رشتہ دار کے گھر گیا تا کہ اس کی لڑکی زینب کا رشتہ اپنے لڑکے علیم کیلئے حاصل کرے۔ وہاں جا کر اس نے زینب کے والد سے اپنا مطالبہ دہرایا۔ اس وقت زینب اور اس کی والدہ بھی تھوڑے فاصلے پر بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں۔ زینب کے والد نے کہا، ''میں نے اپنی لڑکی زینب تمہارے لڑکے علیم کے لیے دے دی۔'' علیم کے والد نے کہا، ''منظور ہے'' ...... پھر چائے وغیرہ تقسیم کی گئی اور گواہان نے زینب کے والد کو تبدیل پارچات کے لیے کہا۔ اس نے مہلت مانگی۔ کیا اس صورت میں مذکورہ الفاظ سے نکاح ہو گیا یا نہیں؟ زینب کے والد کے لیے کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

جواب

صورتِ مسئولہ میں اگر علیم نابالغ ہے تو نکاح صحیح ہو جائے گا۔ مہر کا ذکر نہ ہونے سے نکاح کی صحت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

اگر علیم بالغ ہے تو پھر اس کی اجازت صراحتً یا دلالتً موجود ہونا لازمی امر ہے جو عوام سے ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اگر ثابت ہو جائے تو بھی نکاح صحیح ہو جائے گا۔ چونکہ باپ بالغ کی طرف سے فضولی ہو گا اور اس کے قبول کی وجہ سے نکاح موقوف ہو جائے گا۔ اگر لڑکے نے اطلاع پانے کے بعد جائز رکھا تو صحیح ہو جائے گا۔ میرے خیال میں فقط سکوت رضا نہیں بن سکے گا۔ والعلم عنداللہ۔

سوال ۵۵

ایک لڑکی منکوحہ بالغہ کو بھائی اور چچا نے اغوا کر کے دوسرے شخص کے حوالے کر دیا۔

بعد میں اسے بتایا کہ اس کا پیچھے نکاح ہے۔ پھر اس شخص سے واپس کر کے تیسرے کے حوالے کر دی۔ اندریں اثنا وہ لڑکی مرد ثانی سے حاملہ ہوگئی اور ثالث کے پاس جانے کے وقت وضع حمل ہو گیا۔ تیسرے نے اول خاوند سے وضع حمل کے بعد طلاق حاصل کر لی اور وضع حمل کے بعد اور طلاق حاصل ہونے کے بعد بغیر عدت گزارے تیسرے کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔ کیا یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟

جواب

میرے خیال میں نکاح صحیح ہے کیونکہ اول نے قبل الدخول طلاق دی ہے اور ثانی نے اگر وطی بالشبہ کی ہے تو وضع حمل کے ساتھ اس کی عدت بھی ختم ہوگئی۔ اگر اسے معلوم تھا تو زنا ہوا اور حبلی من الزنا کے ساتھ بھی نکاح ہوسکتا ہے۔ وضع حمل کے بعد تو کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ رہا یہ شبہ کہ الولد للفراش کے ماتحت اگر یہ حمل پہلے ناکح کا قرار دیا جائے تو نئی عدت لازم ہونی چاہیے اور ثالث کا نکاح عدت کے اندر ہوگا جو نادرست ہوگا۔ میرے خیالِ ناقص میں فراش کا معنی بستر ہے۔ اس وجہ سے نکاح کے ساتھ فراش قوی ہوتا ہے اور ملک یمین کے ساتھ فراش ناقص ہوتا ہے۔ لہٰذا فراش کا معنی فقط نکاح کرنا سخت غلط ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ اس کے نسب سے منکر اور متنفر ہوں جو طلاق دینے سے واضح ہے۔ اندریں حالات ایسی مغویہ عورتوں کی اولاد کا نسب، جن کی شادی ان سے نہیں ہوئی، از روئے کتبِ فقہ بالکل نامعلوم ہے۔ ایسی عورتیں جو خاوند کے گھر آباد رہتی ہیں اور پھر کسی سے زنا کیا یا اغوا ہو گئیں، حدیث شریف میں ایسی عورتوں کی اولاد کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان کا نسب ماں کے ساتھ لاحق کیا جائے، اسے زانی کی طرف منسوب نہ کیا جائے اور اس کا والد سمجھا جائے۔ اور اس حدیث کے ماتحت کر کے پہلے ناکح کے ساتھ زبردستی چپکا دینا بھی اقتضاء عقل و نقل کے خلاف ہے کیونکہ الولد للفراش کے مورد میں تو لونڈی تھی جس کا نکاح

ممکن بھی نہیں اور للعاھر الحجر سے زانی کے نسب کو رد کر دینا جبکہ وہ مدعی ہو، یہ بھی مخدوش ہے۔اس صورت میں وہ اولاد کسی طرف کی نہیں رہتی۔نکاح والے اپنی طرف ان کی نسبت پسند نہیں کرتے اور زانی کے لیے ویسے تو ہمارے پاس پتھر نہیں ہیں لیکن نسب کے انتفا میں ضرور مہیا ہو جاتے اور وہ اولاد حقِ وراثت سے ہر طرف سے محروم ہو جاتی ہے۔

سوال ۵۶

(از کلورکوٹ، عبدالرزاق قریشی، مدرس مدرسہ عیدگاہ)

حضرتِ اقدس حضرت مولانا استاذیم صاحب! دام ظلکم اللہ تعالیٰ

بعد از السلام علیکم مسنون! گزارش بخدمت عالیہ ہے کہ آپ جناب نے مولوی محمد حنیف صاحب کو ایک مسئلہ تحریر فرما کر دیا ہے۔اس مسئلہ میں چند وجوہ سے شبہ ہے۔لہٰذا طلب جواب بالتحقیق مزید کیلئے خط ارسالِ خدمت ہے۔جواب مہربانی فرما دیں، مہربانی ہو گی۔صورت مسئولہ یہ ہے کہ حالف محمد رمضان محلوف علیہ چچا محمد یار مسمیٰ محمد رمضان نے کہا کہ اگر میں نے اپنے چچا محمد یار کے ساتھ ٹکہ ٹکر (برتاؤ و تعلق) رکھوں میرے او پر عورت ۳ طلاق سے حرام ہے۔اس حلف کے بعد محمد رمضان مذکور کی لڑکی فوت ہوگئی تو محمد رمضان مذکور کا چچا محمد یار، محمد رمضان کے گھر آیا اور تکفین و تدفین کے بعد برادری نے ٹکے محمد رمضان کے سامنے رکھے اور چچا نے بھی ٹکہ رکھا تو محمد رمضان نے ٹکہ ٹکر لے کر اپنے پاس رکھ لیا اور دوسرے روز چچا کے گھر جا کر ٹکہ واپس کر دیا اور ٹکہ کے متعلق محمد یار محلوف علیہ کہتا بھی ہے کہ ہم نے ٹکہ ٹکر محمد رمضان کے گھر بھیجا ہے۔اور محمد رمضان کے گھر کھایا گیا ہے۔اور محمد رمضان کہتا ہے کہ ٹکہ ٹکر کا مجھے علم نہیں کہ آیا بھی ہے یا نہیں۔جواب میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ ''ٹکہ ٹکر رکھنا کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک معنیٰ کہ غم و شادی میں حالف محلوف علیہ کے سامنے

رکھے، دوم معنیٰ محلوف علیہ حالف کے سامنے رکھے اور حالف قبول کر لے۔ دونوں معنیٰ برابر ہیں۔ ایک معنیٰ اپنی طرف سے متعین کرنا شک ہے اور شک سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ دوم جواب بالتسلیم کہ شک نہیں، تو شرط یعنی حلف میں دونوں فریق نہیں۔ ایک ٹکہ دوم ٹکر، ٹکہ لیا ہے ٹکر نہیں لیا ہے، لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ حلف کا تعلق ذاتِ حالف سے ہے۔ شبہ کی پہلی وجہ کہ جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ شک ہے اور شک سے طلاق واقع نہیں ہوتی اور ساتھ تحریر فرمایا کہ "ھو مصرح فی الھدایۃ"......تو وہ شبہ بھی نہ ہے کہ ٹکہ ٹکر رکھنے کے دونوں معنی برابر ہیں۔ شک نہیں ہے۔ کیونکہ شک تو اس صورت میں ہوتا کہ مثلاً ایک معنیٰ فرض کریں تو طلاق فی الحال واقع ہو، اگر دوسرے معنیٰ فرض کریں تو فی الحال واقع نہ ہو۔ کما ھو مصرح فی الھدایۃ......تو حالف جو فعل بھی کرے، طلاق پڑ جائے گی۔

شبہ دوم یہ ہے کہ "الایمان مبنیۃ علی العرف" صورت مسئولہ میں حلف سے مراد تعلقات برادری ہیں اور عرف میں صورت مسئولہ میں ایک فرد سے تعلقات برادری پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا حالف کو حانث ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر ٹکہ ٹکر لینے سے حانث نہیں ہوتا تو پھر حالف کو کہہ دینا چاہیے کہ غمی خوشی میں ٹکہ ٹکر دیتا لیتا رہے۔ اور ٹکہ ٹکر نہ دے حالانکہ حالف سمجھتا ہے کہ ٹکہ ٹکر سے مراد تعلق بڑھانا ہے۔ اس واسطے ٹکہ ٹکر دوسرے روز واپس کر دیا ہے

اب اس صورت مسئولہ میں حلف میں باھدھما حالف حانث ہو جائے گا، تائید کے لیے فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

رجل قال لامراته ان دخلت دار فلان و فلان ویدخل فی دارک فانت طالق فدخلت المرءۃ فی دار فلان و فلان لم یدخل دارھا حنث فی یمینه لانه یُرادُ بالیمین احدھما۔[1]

---

[1]۔(فتاوی قاضی خان۔ج2ص30)

جواب

عزیزم قریشی صاحب! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وہدایتہٗ ۔

ماشاء اللہ آپ تو بڑے اچھے سمجھ دار ہو گئے ہو۔ چشمِ بددور۔ داناؤں کا کہنا ہے ''یک من علم رادہ من عقل باید''......اور آج کل اس شئے لطیف کی سخت کمی پائی جاتی ہے۔ غلطی انسان کا خمیر ہے۔ ممکن ہے میں غلط کہہ رہا ہوں۔ عزیزِ من! آپ نے میرے پہلے سوال پر اچھی طرح غور نہیں کیا ورنہ اس کا سمجھنا بہت آسان تھا۔

اگر آپ اس پر غور کر لیتے تو خدشات پیش ہی نہ آتے۔ لیکن جب آپ نہیں سمجھ سکے اور غالباً اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ اس کیس میں ایک فریق تھے، یا کوئی دوسری بات، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ تو پھر دوبارہ اس چیز کے سمجھانے پر مغز ماری کرنا بے سود ہے۔ لہٰذا جو چیز آپ نے سمجھ لی ہے، ہمیں اس پر اپنی بات سنا لینی چاہیے اور اسی میں بہتری ہے۔ **نحمدہٗ و ھوھادی الرشاد بحرمت النبی** ﷺ **وآلہٖ الامجاد**......آپ نے **الایمان مبنیة علی العرف** کا قاعدہ سمجھ لیا ہے۔ گو آگے **مالم ینومایحتملہ اللفظ** کے قیمتی الفاظ کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ چلو، کوئی بات نہیں۔ اب آپ کے نزدیک ٹکہ اور ٹکر رکھنے کے معنی ''برادری کے جملہ تعلقات منقطع کر لینے'' ہیں جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ اور برادری کے تعلقات سینکڑوں ہیں جو اظہر من الشّمس ہیں۔ اور عرف حقیقت ہوتی ہے۔ کما ھومصرح فی الشامی۔ اب ٹکہ اور ٹکر کے لفظی معنی حقیقت نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک لفظ کے ایک معنی ہی حقیقی ہو سکتے ہیں، دوسرے نہیں اور بیک وقت دونوں معنوں کا جمع کرنا بین الحقیقت والمجاز ہے جو کہ ناجائز ہے۔ عمومِ مجاز تو یہاں ممکن نہیں رہتا کیونہ آپ نے مجازی معنی نہیں لیے بلکہ حقیقی معنی کے لیے ہیں۔ کیا خیال ہے؟

ا۔ آپ پھر خیال کریں حالف کے الفاظ پر، ''میں تمہارے ساتھ ٹکہ اور ٹکر نہیں رکھوں

گا'' یعنی تمہارے ہاں نہ ٹکہ رکھوں گا نہ ٹکر۔ اس کی مثالیں ہماری زبان میں بہت ہیں جو کہ اس معنیٰ کی مرجع ہیں۔ لینے کا بیان یہاں ذکر ہی نہیں، یہی الفاظ ہیں اور وہ کلیہ کہ...... **الایمان مبنیة علی العرف علی الالفاظ لا علی الاغراض** فقہ کا قائدہ ص ۲ ہے جس پر آپ نے نگاہ نہیں ڈالی ور جب عرف میں الفاظ کی حقیقت مستعمل ہو، مجاز نہیں لیا جا سکتا۔ اگر بالفرض لے بھی لیں تو بھی کام نہیں بنتا کیونکہ ٹکہ واپس کر دیا اور ٹکر کا اسے علم نہیں اور نہ اس نے لیا ہے۔ جیسا کہ آپ تحریر کر چکے ہیں۔ لیکن حالف کے الفاظ سے یہ معنیٰ مراد لینا زبردستی والا معاملہ ہے۔

۲۔ جب حالف کے کلام کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور ایک کے ساتھ طلاق واقع نہیں ہوتی تو خصوصاً حلف بالطلاق کی صورت میں دوسرے معنی پر حمل کرنا چاہیے کیونکہ **الطلاق ابغض الحلال کما فی الدرالمختار اذا علق الثلاث بالشئین حقیقةً یتکرر الشرط اولایقع ان وجدا الثانی فی الملک والا لاو ھی مسئلة رباعیة بل عندنا احتمالات کثیرة اخریٰ وعلی الھامش اذا کان فعلاً قائماً من اثنین من حیث ھو قائماً نحوان جاء زید و عمر، الخ۔** [1]

۳۔ قاضی خان بچارے کی عبارت آپ نے نقل تو کر دی لیکن سمجھنے کی تکلیف نہ فرمائی۔ وہ تو لکھ رہا ہے: **لانہ یراد بالیمین احدھما دون الجمع**۔ یعنی حالف کی مراد چونکہ صرف ایک معنیٰ ہے، جیسا کہ لانہٗ سے واضح ہے، لہٰذا دوسرے کا وقوع ضروری نہیں رہے گا۔ کیونکہ حالف معنوں میں سے دوسرے ایک کا ارادہ کر رہا ہے۔ دوم وہاں عورت کے فعل کے ساتھ طلاق معلق ہے اور وہ فعل الابدی نہیں اختیاری ہے

ا۔ (درمختار۔ ص222)

لہٰذا وہ عورت کا دخول ہی کافی ہو جائے گا کیونکہ اس سے اس کی رضا معلوم ہو جائے گی۔

اے وائے پسِ امروز بود فردائے

اگر آپ نے غصہ تھوک دیا اور ٹھنڈے دل سے ان گزارشات پر غور کر لیا تو امید ہے کہ حق واضح ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق بخشے ہم سب کو۔ **اللھم آمین بحرمة النبی الکریم علیہ وآلہ الصلوٰة**

سوال ۵۷

کیا فرماتے ہیں علماء اندریں مسئلہ کہ روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب

علمائے دیوبند نے اس مسئلہ میں تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹروں کی رائے اور تجربہ سے ثابت ہے کہ دوا عروق اور شرائن کے ذریعہ دماغ اور معدہ کی رگوں میں پہنچتی ہے اور عین معدہ اور عین دماغ میں نہیں پہنچتی، اس لیے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ مولوی غلام خان کا ایک فتویٰ بدیں مضمون نذر سے گزرا ہے جس پر تحریر تھا کہ چونکہ علمائے دیوبند کہتے ہیں، اس لیے روزہ ٹوٹتا ہے اور ساتھ میں ایک نئی دلیل بھی دی گئی تھی کہ سانپ یا بچھو کاٹ جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا حالانکہ باہر سے اندر وہ زہر چلا جاتا ہے۔ علمائے دیوبند نے فقہی حوالہ جات بھی دیے ہیں جن میں مجموعی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اگر معدہ کے اندر پہنچنے کا یقین ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ لیکن عالمگیری، قاضی خان، بزازیہ، شامی، بحرالرائق، بدائع، ہدایہ، ان سب حضرات کے کلام سے صاف طور پر واضح ہو رہا ہے کہ روزہ ٹوٹنے کے لیے چند

باتیں ضروری ہیں۔ اولاً دوا یا غذا کا عین جوف یا عین دماغ میں پہنچ جانا۔ دوم اصلاحِ بدن مقصود ہو۔ قاضی خان میں ہے: **واما الحقنة والوجود فلانه وصل الی الجوف مافیه صلاح البدن وفی القطور السعوط لانه وصل الی الراس مافیه صلاح البدن الخ**...... ترجمہ: خلاصہ عبارت حقنہ اور وجود اس لیے کہ پیٹ کے اندر وہ چیز پہنچی جس میں بدن کی صلاحیت ہے اور ناک میں دوائی ڈالنے کے ساتھ اس لیے کیونکہ سر تک وہ چیز پہنچی جس میں بدن کی صلاحیت ہے۔[1]

بدائع میں ہے: **اذا وصل الی الجوف او الی الدماغ من غیر مخارق الاصلیة... ولو علم انه وصل یفسد فی قول ابی حنیفه** علیہ الرحمۃ **بصوم**۔[2]

اختیار اور ایجاد فعل کا پایا جانا بھی افسادِ روزہ کا باعث ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو روزہ نہ ٹوٹے گا جیسا کہ سانپ اور بچھو کے کاٹنے کی صورت میں قاضی خان نے جامع صغیر کی شرح میں لکھا ہے: **وان بقی الرمح فی جوفه اختلفوا فیه والصحیح انه لا یفسد لانه لم یوجد منه الفعل ولم یصل الی مافیه صلاحه** (بحر)۔

ترجمہ: اگر نیزہ اس کے پیٹ میں باقی رہا تو اس میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ اس سے کوئی فعل نہیں پایا گیا اور نہ ہی پیٹ تک کوئی ایسی چیز پہنچی جس میں بدن کی صلاحیت ہو۔[3]

اور بعینہٖ سانپ اور بچھو کے کاٹنے سے نہ اختیار اور ایجاد پایا گیا اور نہ صلاح بدن حاصل ہے، لہٰذا روزہ اس وجہ سے فاسد نہ ہوگا۔

---

[1]۔ (فتاویٰ قاضی خان۔ ج1 ص186)

[2]۔ (بدائع۔ ج2 ص93)

[3]۔ (بحر الرائق۔ ج2 ص487، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

اور بزازیہ میں ہے: **وان صب فی اذنہ افسدہ فی الصحیح لوجود الفعل فلا یعتبر صلاح البدن**۔ یعنی صاحب ہدایہ نے جو کہا ہے کہ پانی کی صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا، کیونکہ اس میں اصلاح بدن نہیں تو وہ فرماتے ہیں یہ غلط ہے کیونکہ ایجاد فعل پایا گیا ہے۔[1] لہٰذا اصلاح بدن کا اب اعتبار نہیں رہے گا اور جب ایجاد فعل بھی ہو اور اصلاح بدن بھی مقصود ہو تو بالاتفاق ٹوٹ جانا چاہیے۔ بزازیہ میں ہے: **جعلت القطن فی قبلہا ان بلغ الی فرج الداخل فسد لانہ تَمَّ الدخول بالکلیۃ**۔

یہاں صلاحِ بدن اور ایجاد فعل دونوں ہیں۔ اس وجہ سے فاسد ہو رہا ہے۔ ورنہ معدہ میں تو نہیں پہنچ رہی۔[2] اور لیجئے بزازیہ میں ہے: **بالغ فی الاستنجاء حتی بلغ فی موضع الحقنۃ فطرہ**۔[3] یہ بھی بالکل مسطورہ بالا کا موید ہے۔ **وقولہ علیہ السلام الفطر مما دخل ولیس مما خرج** یعنی جو چیز باہر سے جسم کے اندر داخل ہو، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اس میں دخل کے ساتھ اختیار اور ایجاد کا اضافہ کرنا ہوگا۔

ورنہ پھر نسیان کی صورت میں کھانا پینا اور سانپ وغیرہ کی صورت میں بھی روزہ ٹوٹ جائے گا۔ جس طرح **مما خرج** سے حیض ونفاس مستثنیٰ ہوں گے، کیونکہ ان میں اہلیت صوم باقی نہیں رہتی۔ ڈاکٹروں اور اہلِ تجربہ کی رائے اس کے خلاف بھی موجود ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ دوا بالکل معدہ اور دماغ کے اندر چلی جاتی ہے۔ جن عروق کے ذریعہ پانی پینے کے بعد بالکل جسم کے ہر حصہ سے باہر نکل آتا ہے، انہیں عروق میں دوا جب پہنچ جاتی ہے تو اندر بھی عقلاً اسے چلا جانا چاہے کیونکہ پانی مجسم چیز ہے۔ لہٰذا بصورت شک اور عدم یقین

---

[1]۔(بزازیہ۔ص98)

[2]۔(بزازیہ۔ص102)

[3]۔(بزازیہ۔ص102)

دخول فی الجوف اصلاحِ بدن اور ایجادِ فعل دوسری دو شرطوں کے موجود ہونے اور مفسد کو ترجیح ہونے کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ جو ٹیکہ جلدی ہوتا ہے جیسا کہ چیچک وغیرہ کے لیے، اس سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے، ٹوٹتا نہیں۔ وہ سینگھی کھنچوانے اور پچھنے لگوانے کے مشابہ ہے لیکن سینگھی کھنچوانے اور پچھنے لگوانے سے خون اندر سے باہر نکلتا ہے اور اس کا مقصد پچھنوں کے ذریعے قلیل المقدار دوائی کو اندر داخل کرنا ہوتا ہے لہٰذا کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔ (۸ شوال ۱۳۷۵ھ)

سوال ۵۸

اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑے کے وقت کہتا ہے کہ تمہارا یہاں اب کوئی کام نہیں ہے، میں تمہیں طلاق دے چکا ہوں۔ عورت کہتی ہے کہ اس طرح تو میں نہیں جاتی، اگر تم طلاق نامہ لکھ کر دے دو یا تین طلاق کہو تو پھر میں چلی جاؤں گی۔ مرد اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ایک بار نہیں، ستر بار، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا۔ کیا طلاق مغلظہ ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

ولو قال لامراءته انتطالق واحدة فقالت المرءه خواهی هزار فقال الزوج هزار ولم ینوشیاء قالو هذا الی الوقوع اقرب۔

ترجمہ: اور اگر اپنی بیوی کو کہا کہ تجھے ایک طلاق ہے تو اس نے کہا کہ تو ہزار چاہتا ہے تو زوج نے کہا کہ ہزار اور اس نے کسی چیز کی نیت نہ کی تو انہوں نے کہا کہ یہ وقوع کے زیادہ

قریب ہے۔[1]

یہاں تو مذاکرۂ طلاق ہے۔عورت طلاقِ ثلاثہ کا ذکر اور مطالبہ کر رہی ہے اور مرد اس مطالبہ کا اقرار بلکہ زیادہ کا اثبات کر رہا ہے۔

:رجل قال لغیرہ اطلقت امرءتک فقال نعم قال بلیٰ بالھجاء ولا یتکلم بہ یقع الطلاق

ترجمہ: کسی مرد نے اپنے غیر کو کہا کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اس نے کہا ہاں بلکہ ہجہ کے ساتھ اور اس کا تکلم نہ کیا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔[2]

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: **امراۃ قالت لزوجھا اگر سہ طلاق در دہ مرا بمثل من از خانہ لو بیرون میروم فقال الزوج شدہ را کجا بری فھذا اقرار بالطلقات الثلاث۔**

ترجمہ: اگر عورت نے اپنے خاوند کو کہا کہ اگر تو مجھے تین طلاقیں دے تو میں تیرے گھر سے چلی جاوں زوج نے کہا (شدہ را کجا بری) تو یہ تین طلاقوں کا اقرار ہے۔[3]

مندرجہ بالا حوالہ جاتِ فقہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں طلاقِ مغلظہ واقع ہو جائے گی۔

سوال ۵۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ''بوہلی'' یعنی وہ دودھ جو جانور کا پہلے دوسرے دن ولادت کے بعد کا ہوتا ہے، وہ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا

---

[1]۔(فتاویٰ قاضی خان۔ج1 ص454،)

[2]۔(فتاویٰ قاضی خان۔ج1 ص454)

[3]۔(خلاصۃ الفتاویٰ۔ج2 ص99)

خیال ہے کہ حرام ہے۔ بینوا وتو جروا

جواب

بلاشک جائز ہے۔ ترمذی شریف میں حدیث موجود ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بوہلی لایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول فرمائی۔ حدیث طویل ہے، مطلب یہ ہے کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تحفہ لایا تھا تو معلوم ہوا کہ اہلِ عرب بوہلی استعمال کیا کرتے تھے اور اسے جائز سمجھا جاتا تھا اور عقلاً بھی اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ٦٠

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ مدعی کے پاس گواہ ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اگر مدعی علیہ حلف اٹھادے تو مجھے خارج سمجھا جاوے۔ مدعی علیہ نے حلف اٹھادی۔ یہ حلف اٹھوانی جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر مدعی اپنے اقرار کے مطابق دعویٰ سے خارج کیا جائے، مدعی خارج ہوسکتا ہے یا نہیں؟ نیز مدعی کو ثانیاً دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ بینوا وتو جروا۔ (سائل مولوی غلام حسین درکھان، صدر مدرس مدرسہ سراجیہ ڈیرہ، از ضلع ڈیرہ اسماعیل خان)

جواب

صورت مسئولہ میں قاضی کا یہ فیصلہ بالکل ناجائز اور غیر نافذ ہے اور مدعی کو حق پہنچتا ہے کہ ثانیاً دعوی کرکے اپنے گواہ پیش کرے۔

---

[1]۔ (ترمذی شریف۔ ج2 ص96)

ملتقی الابحر میں ہے: **وان انکر سال المدعی البنیة فان اقامها فبها والا حلف الخصم ان طلبه خصمه لانه حقه فان حلف انقطعت الخصومة حتی تقوم البینة فتسمع البینة بعد یمین الخصم علی ماهو الصواب**

ترجمہ: اگر مدعی علیہ نے انکار کیا تو قاضی مدعی سے گواہوں کا سوال کرے اگر مدعی گواہ قائم کرے تو ٹھیک ہے وگرنہ دوسرے فریق یعنی مدعی علیہ سے قسم لے اگر مدعی قسم کا مطالبہ کرے کیونکہ یہ اس کا حق ہے اگر قسم اٹھائی تو جھگڑا ختم ہو جائے گا یہاں تک کہ اگر قسم کے گواہ قائم ہو جائیں تو گواہوں کی بات سنی جائے گی۔[1]

مجمع الانہر میں ہے: **قید بتحلیف القاضی لان المدعی علیه لو حلف بطلب المدعی یمینه بین یدی القاضی من غیر استحلاف القاضی فذالیس بتحلیف لان التحلیف حق القاضی فلو برهن علیه تقبل ولا یحلف ثانیا عند القاضی** الخ

ترجمہ: قاضی کے حلف لینے کے ساتھ اس کو مقید کیا کیونکہ مدعی علیہ اگر قاضی کے سامنے صرف مدعی کے کہنے پر قسم اٹھائے حالانکہ قاضی نے قسم کا نہیں کہا تو یہ حلف لینا نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ قسم لینا قاضی کا حق ہے۔ اگر اس پر دلیل دے تو اس کو قبول کیا جائے گا اور قاضی کے ہاں دوسری مرتبہ قسم نہیں لی جائے گی۔[2]

......آگے چل کر صاحبِ مجمع نے تصریح کی ہے: **فان اقامها بعد الحلف تقبل قال علیه السلام الیمین الفاجرة حق ان ترد بالبینة العادلة ولان طلب الیمین لایدل علی عدم البینة... فلاعبرة لما قاله بعض الفقها من ان البینة**

---

[1]۔(ملتقی الابحر۔ج2ص253)

[2]۔(مجمع الانہر۔ج2ص254)

لا تسمع بعد التحلیف کمافی الدر وغیرہ اھ

ترجمہ: اگر قسم اٹھانے کے بعد گواہ قائم کیے تو ان کو قبول کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹی قسم کو عادل گواہوں کے مقابلے میں رد کیا جائے گا۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ قسم کا طلب کرنا گواہوں کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے تو لہٰذا بعض فقہا نے تو یہ بات کہی ہے کہ قسم لینے کے بعد گواہوں کی بات نہ سنی جائے گی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مکرر عرض ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فداہ ابی وامی کا فرمان ہے کہ **البینة علی المدعی والیمین علی من انکر۔**

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کہ مدعی پر گواہ اور اس مدعی علیہ پر جو انکار کرے قسم ہے تو خلاف الشرع طریق سے مدعی علیہ بری نہیں ہوسکتا اور قاضی کا یہ فیصلہ تو بالکل ہی غلط ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے **وفی الواقعات الحسامیه قبیل الرھن عند محمد قال للآخر لی علیک الف درھم فقال الآخر ان حلفت انھالک ادیتھا الیک فحلف فادا ھا الیه المدعی علیه ان کان اداھا الیه علی الشرط الذی شرط باطل لانه خلاف حکم الشرع لان حکم الشرع ان الیمین علی من انکر دون المدعی** اھ ک......

ترجمہ: ایک شخص نے دوسرے کو کہا کہ آپ کے ذمہ میرا ہزار درہم ہے دوسرے نے کہا کہ اگر تو قسم کھائے کہ وہ ہزار تیرا ہے تو میں تجھے ہزار روپے دے دوں گا پھر مدعی نے قسم اٹھائی اور مدعی علیہ نے وہ ہزار روپیہ اس کے حوالے کر دیا۔ اگر اس کو ہزار روپیہ اس شرط پر دیا تو یہ شرط باطل ہے کیونکہ یہ شریعت کے حکم کے خلاف ہے اس لیے کہ شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ جس نے انکار کیا اس پر قسم ہے۔

اور یہاں چونکہ حکم الشرع مدعی پر بینۃ کا لزوم تھا لہٰذا اس کے خلاف شرط کرنے سے مدعی علیہ حلف اٹھانے کی صورت میں بری نہیں ہوسکتا اور نہ قاضی گواہوں کی موجودگی میں مدعی علیہ کی حلف لے سکتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **لا یحلف مع وجود البرهان الا فی مسائل** الخ......

ترجمہ: دلیل یعنی گواہوں کی موجودگی میں چند مسائل کے علاوہ قسم نہ لی جائے گی۔[1]

(۹ شعبان ۱۳۷٦ھ)

سوال ٦١

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ''تن بخشی'' جو خفیہ نکاح کی صورت میں رائج ہے، اگر دو گواہوں کے روبرو کی جائے اور انہیں اخفا کی تاکید کی جائے تو کیا نکاح شرعاً ثابت ہوسکے گا یا نہیں؟

جواب

انعقاد نکاح اور چیز ہے اور اثبات و اظہارِ نکاح عند القاضی اور چیز ہے۔ گواہ شریعت نے اظہار اور اعلان کیلئے مقرر فرمائے ہیں اور جن گواہوں کو اخفا کی تاکید کی جاتی ہے، ان کی موجودگی اعلان اور اظہار کا باعث نہیں رہتی۔ درحقیقت وہ مل کر ایک جرم کا ارتکاب کررہے ہیں جو شریعت اور قانونِ وقت دونوں کی نگاہ میں ناجائز ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: **أعلنوا هذا النِّكاحَ واجعلوهُ في المساجِدِ واضربوا عليهِ بالدُّفوفِ** ......ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ نکاح کا

---

[1] ۔(فتاوی عالمگیری۔ج 4 ص 14)

اعلان کرواورنکاح مسجد میں کرواوراس پر دف بجاؤ۔[1]

اور جن گواہوں کو اظہار سے منع کیا جائے یا عملاً اور عمداً وہ بالکل اظہار نہ کریں، یہ اخفا ہے۔اعلان اور اخفا دوضدیں ہیں ۔شریعت نے اعلان شرط کیا ہے اور وہ اخفا کرر ہے ہیں

دوم نکاح وطلاق کے گواہ شاہد حسبہ ہوتے ہیں۔لہٰذا ان دونوں کوسن کر عمداً چھپانے والوں کی شہادت قبول نہیں رہتی۔لہٰذا وہ گواہ ایسی تن بخشی کو نکاح نہیں بنا سکیں گے۔

سوم ''تن بخشی'' عرف میں بھی نکاح نہیں سمجھا جاتا اور عرف ایک نص کا درجہ رکھتی ہے۔

لہٰذا گواہوں کی موجودگی میں ایسی تن بخشی کے بعد زنا تو نہیں ہوگا لیکن نکاح بھی ثابت نہیں ہوگا۔اور صاحبِ ہدایہ نے جو اعلان کی آخری حد دو گواہوں پر اکتفا سمجھا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ مجبوری اور لاچاری کی صورت میں، جب زیادہ آدمی میسر نہیں ہو سکتے تو کم از کم دو آدمی تو ضرور ہونے چاہئیں ۔ یہ مراد نہیں ایسے دو آدمیوں کے روبرو نکاح کیا جس سے زیادہ سے زیادہ اخفا ہو سکے۔یہ تو ''اعلنوا'' کے صراحتہً منافی ہے۔

سوال ٦٢

مولانا مزاج معلٰی چاہ محمد یانوالہ کے مقدمہء طلاق کے فریقین نے مجھے حکم مقرر کیا ہے اور شہادت اور زوجین کے بیانات سننے سے ثابت ہوا ہے کہ مدعی علیہ نے بحالت غضب میں ''اوگئ'' کہا اور گواہوں کے روبرو اس نے اقرار بھی کیا ہے کہ اس وقت میرے ارادہ میں طلاق دینا تھا، پھر ہاتھ میں جو مینگنیاں تھیں، وہ بھی پھینک دیں۔قرینہ نیت طلاق ہے۔لیکن لفظ کنائی طلاق موجود ہے کیونکہ ''ھی ذہبت'' کا ترجمہ ہے اور ''ھی ذہبت''،

[1]۔(مشکوۃ شریف۔ج2ص272)

اذہبی کے مادہ سے اور ''اذہبی'' صریحۃً کنایات میں سے مذکور ہے۔صرف صیغہ کا فرق ہے اور صیغہ کے تغیر سے حقیقت لغویہ نہیں بدلتی۔اس سلسلہ میں جناب کا ایک فتویٰ نظر سے گزرا جس میں عدم وقوع طلاق ظاہر کیا گیا ہے اور وجہ صرف یہ ہے کہ یہ صیغہ ٔاخبار ہے نہ انشاء کا اور اس کا ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔طلاق کے الفاظ جہاں تک بندہ کی معلومات کا تعلق ہے، سب جملہ خبریہ ہوتے ہیں۔جیسا کہ طلقتک یا طالق، یا مطلقۃ وغیرھا، یہ سب صیغہ ٔاخبار ہیں۔لہٰذا مکمل تحقیق سے مطلع فرمایا جاوے۔

(مولوی فخر الدین صاحب، ازمیانوالی شہر)

جواب

مکرم ومحترم المقام مولانا صاحب زید لفضلکم ......محترم مندرجہ ذیل امور فتویٰ لکھتے وقت مدنظر تھے۔

اول: طلاق ابغض الحلال ہے، اس میں خواہ مخواہ ایقاع واثبات کی کوشش کرنا ناجائز ہے۔

درالمختار میں ہے: **لا یلحق البائن البائن ان امکن جعله اخبارا عن الاول کانت بائن بائن او ابنتک بتطلیقة۔ فلا یقع لانه خبر فلا ضرورة فی جعله انشاءً** ترجمہ: بائن طلاق بائن کو لاحق نہیں ہوتی جب دوسری بائن کو پہلی بائن خبر بنانا ممکن ہو جیسے انت بائن بائن یا ابنتک بتطلیقہ (میں نے تجھے بائن طلاق دی) تو طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ یہ پہلی طلاق کی خبر دینا ہے اور اس کو انشاء یعنی دوسری طلاق بنانے میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔[1]

دوم: طلاق کنائی کی تعریف فقہا ہے نے یہ فرمائی ہے: **مالایوضع له واحتمله**

---

[1]۔(درمختار۔ص215،مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

وغیرہ۔''وہ گئی''، ''وہ چلی گئی'' میں دو احتمال موجود ہی نہیں ہیں ۔ یہ صرف خبر کاذب ہے۔طلاق کا لفظ نہیں نہ صریح نہ کنایہ، اگر طلاق کا لفظ صراحۃً بھی خبر کے طور پر استعمال کیا جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔فتاوی شامی میں ہے:

لو اخبر بالطلاق کاذبا لایقع دیانة وقال فی الایمان البزازیته المفتی یفتی بالدیانة

ترجمہ:اگر طلاق کی جھوٹی خبر دی تو دیانۃ طلاق واقع نہ ہو گی اور بزازیہ کتاب الایمان میں ہے کہ مفتی دیانت پر فتویٰ دے۔[1]

اور حکم کا مقاضی ہوتا ہے نہ قاضی یعنی آج کل کے حکم دراصل مفتی ہی ہوتے ہیں۔ انہیں دیانت پر ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔

سوم: ''تمہیں طلاق مل چکی ہے'' اور ''وہ چلی گئی'' یا ''وہ گئی'' یہ خبریں ہیں۔تم چلی جاؤ اور تمہیں طلاق ہے، یہ دونوں انشاء ہیں ۔ طلاق کے لیے انشاءطلاق چاہیے نہ خبر باقی، جملہ خبریہ اور انشائیہ مقصود نہیں۔

چہارم: فقہ حنفی میں کم از کم میری فہم ناقص اور نگاہ نارسا کے سامنے کوئی ایسا اصول یا خبر نہیں گزری جس میں اس مادہ کے استعمال سے طلاق ہو جاتی ہے جس میں سے طلاق کنائی یا صریح کا مادہ اخذ کیا جا سکتا ہو۔ گویا اس صورت میں ''ضَرَبَ'' اور ''ضَارب'' کو ایک سمجھنا ہوگا۔ **وبینهما بون بعید**۔ بلکہ فقہاء نے تو ''مُطلِقَة'' اور ''مطلَّقة'' میں بھی فرق بتایا ہے۔

پنجم: ''اذہبی'' بھی وہ کنائی ہے جس کے لیے دلالت حال اور قرائن کافی نہیں بلکہ یقینی نیت ضروری ہے۔کما صرح بہ فخر الاسلام

---

[1]۔(فتاوی شامی ،ج2ص466)

بعض کنائی الفاظ ایسے ہیں جو وقوعاً صریح ہیں۔ نیت کی حاجت نہیں۔ جیسا کہ ''انت علی حرام'' اور میں نے تجھے چھوڑا ہے، کما صرح بہ علامۃ الشامی ...... محض عرف کی وجہ سے کیونکہ عرف نص کا درجہ رکھتی ہے اور ہماری عرف میں ''چلی جاؤ''، ''بھاگ جاؤ''، ''دور ہو''، ''دفع ہو'' بارادۂ طلاق ہرگز استعمال نہیں ہوتے بلکہ یہ روزمرہ کے الفاظ ہیں جنہیں عوام دن میں کئی مرتبہ استعمال کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ''وہ گئی'' اور ''چلی جاؤ'' میں سینکڑوں کوس کا فرق ہے۔ **واعلم یا اخی و للفقیه فی مسائل الحرام والحلال من الکبریت عند الفقهاء المتقدمین وهذا او ان ذهاب العلم والله ولی التوفیق۔**

(۲۳ محرم ۷۷ ۱۳ھ)

سوال ۶۳

رمضان المبارک کے مہینہ میں زمیندار لوگ جو سخت غریب اور دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں، ان کے پاس اپنے کھانے کے لیے بھی غلہ موجود نہیں ہوتا نہ ان دنوں میں کوئی ادھار دیتا ہے اور اکثر مالکِ اراضی بھی مجبور کرتے ہیں کہ فصل کا انتظام کرو ورنہ زمین چھین لی جائے گی، گرمی اور کام کی شدت میں روزہ رکھ کر نبھالینا بھی سخت مشکل ہے، کیا اس مجبوری کی صورت میں قضا کر کے پھر رکھ دے، کیا حکم ہے؟

جواب

اس مسئلہ کو بندہ نے کئی سال پیشتر جب فصلات کی کٹائی عین ماہِ رمضان شریف میں آ گئی تھی، نصوصِ شریعہ سے بطور استنباط طبعاً عوام کے سامنے اظہار کیا تھا کہ میرے خیالِ ناقص میں تکلیف مالایطاق اور حرج شرعاً مدفوع ہے اور نص **فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهرَ**

فَلۡيَصُمۡهُ کے عموم سے جس طرح حبلیٰ اور مرضعہ مسافر اور مریض مستثنیٰ ہیں، اس طرح یہ بھی قیاساً مستثنیٰ ہوں گے کیونکہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک جب مطلقاً سفر علۃ رخصت قرار دیا جا چکا ہے، خواہ تکلیف نہ بھی ہو وجہاں تکلیف قطعاً مستحقق ہو وہاں بطریق اولیٰ قضا جائز ہونی چاہیے۔ اس پر عوام میں سخت شور برپا ہوا کہ مولانا صاحب نے روزے نہ رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ لاحول ولاقوۃ...... پھر کئی خطبات میں ان شکوک وشبہات کا ازالہ کیا گیا اور سمجھایا گیا کہ یہ ہر آدمی کے لیے نہیں بلکہ معذور اور مجبور کے لیے ہے جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے۔ جن لوگوں کے پاس غلہ ہے یا مالک انہیں مجبور نہیں کرتے، ان کے لیے نہیں بلکہ جو لاچار ہیں، ان کے سال کا دارومدار ان چند ایام پر ہوتا ہے یا مزارع ہیں، اور فصل پک گئی ہے، وہ کٹائی کر لیں کیونکہ اس سے ان کی تمام سال کی محنت ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس مسئلہ کی تائید جزی صورت میں کتب فقہ میں دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ آج کتاب ”بوادر النوادر“ مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی میں اس کا حوالہ نظر سے گزرا، لہٰذا تحقیق وتکمیل کے لیے تحریر کر دیا ہے۔

بوادر النوادر اور درالمختار میں ہے: **من لا یقدر ثم قضاء وقال الرملی و فی جامع الفتاویٰ ولو ضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعیشة فله ان یفطر ویطعم لکل یوم نصف صاع اه اذالم یدرک عدۃ من ایام اخریمکنه الصوم فیها والاوجب علیه القضاء وعلی هذا الحصاد اذا لم یقدر علیه مع الصوم ویهلک الزرع بالتاخیر لاشک فی جواز الفطر و القضاء الی آخر ماقیده**

ترجمہ: رملی نے کہا، جامع الفتاویٰ، میں ہے اگر وہ کام کاج میں مشغول ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنے سے کمزور ہو جائے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور ہر دن کے لیے نصف صاع گندم فقیر کو دے یعنی جب دوسرے دن اتنے نہ پائے جن میں روزہ

رکھنا اس کے لیے ممکن ہو ورنہ اس پر قضاء واجب ہوگی اسی تعبیر پر فصل کا کاٹنا ہے جب وہ روزہ رکھنے کے ساتھ فصل کاٹنے پر قادر نہ ہو اور تاخیر کے ساتھ فصل ہلاک ہو جاتی ہو تو روزہ نہ رکھے اور قضاء کرنے کے جواز میں کوئی شک نہیں۔[1]

قید بمالم یکن عندہ مایکفیہ وعیالہ واذاخاف ھلاک زرعہ اوسرقتہ فلم یجد من یعمل لہ باجرۃ المثل وھویقدر علیھا

ترجمہ: یہ مقید ہے اس شرط کے ساتھ کی جب اس کے پاس اتنا (نان ونفقہ نہ ہو) جو اس کو اور اس کے اہل وعیال کو کافی ہو اور جس وقت اس شخص کو کھیتی کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے یا اس کے چوری ہونے کا اور وہ اجرت کی طاقت بھی نہیں رکھتا۔[2]

والحمد للّٰہ علی کل حال وللّٰہ درالعلماء بتحقیق جمیع الحوادث والوقائع رضی اللّٰہ عنھم عن سائر المرسلین اللھم آمین و صلے علی سید المرسلین وآلہٖ وسلم

سوال ٦٤

کیا رمضان شریف میں جس شخص نے امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں کیا وہ وتر کی جماعت میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **واذا صلی معہ شیئا من التراویح اولم یدرک شیئا منھا او صلی ھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ ھو الصحیح کذا فی**

---

[1]۔(بوادر النوادر، ج1 ص239: وفی درالمختار، ج2 ص184 فی جواز فطر)

[2]۔(فتاویٰ شامی۔ج2 ص125)

القنیہ...

ترجمہ: اگر کسی شخص نے کچھ تراویح ایک امام کے ساتھ پڑھی یا کچھ تراویح امام کے ساتھ نہ ملی یا کچھ تراویح اور امام کے ساتھ پڑھی تو اس کو اس امام کے ساتھ وتر پڑھنا جائز ہے۔[1]

اس فقہی جزئیہ سے سے ایسا معلوم ہورہا ہے کہ وتر کی جماعت میں شریک ہونا جائز ہے کیونکہ وتر کا وقت اور فرائض کا وقت ایک ہی ہے۔

اختلاف قضا میں ہے اور وہ بھی جو اس نے اکیلے پڑھے ہیں گویا جماعت والی صورت میں اختلاف بھی نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ)

سوال ۶۵

کیا گیارہویں شریف جائز ہے؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ

جواب

نعم لان ایصال الثواب متفق علیه ولتخصیص الیوم انظر الی حدیث البخاری ایصال ثواب متفق علیہ ہے، اور دن کی تخصیص کے لیے بخاری شریف کی حدیث کو دیکھ۔

عن سهل قال كانت فينا امرأة تجعل على اربعاء (جدول) فى مزرعة لها سلقاء فكانت اذا كان يوم الجمعة تنزع اصول السلق فتجعله فى قدر ثم تجعل عليه قبضة من شعير تطحنها فتكون اصول السلق عرقه (او غرقة)

---

[1] ۔(فتاویٰ عالمگیری۔ج 1 ص 129، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

وکنا ننصرف من صلوٰۃ الجمعة فنسلم علیها فتقرب ذلک الطعام الینا فنلعقه وکنا نتمنی یوم الجمعة لطعامها

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے ہم میں ایک خاتون رہتی ہے انہوں نے نہر کے کنارے ایک کیاری بنائی ہوئی تھی جس میں چقندر بوئے ہوئے تھے جمعہ کے دن وہ چقندر کی جڑیں نکال کر ایک دیگچی میں ڈالتیں اور اس میں ایک مٹھی جَو پیس کر ڈال دیتیں اور وہ چقندر کی جڑیں گوشت کے قائم مقام ہوجاتیں، ہم جمعہ کی نماز پڑھ کر واپس آتے تو ان کو سلام کرتے، وہ خاتون ہم کو وہ طعام پیش کرتیں، ہم اس کو چاٹ چاٹ کر کھاتے، ہم اس طعام کی وجہ سے جمعہ کے دن کی تمنا کرتے تھے۔[1]

ذلک الدلیل لتخصیص الیوم للطعام وانتظارهم و تمنیهم وکانت الدعوة یقیناً لغرض الثواب والاستحسان وماذالک بعد الحق الا الضلال

ترجمہ: یہ کھانے کے لیے دن کی تخصیص کی دلیل ہے اور اسی طرح ان کا انتظار کرنا اور تمنا کرنا اور یہ دعوت یقیناً ثواب اور بھلائی کی غرض کے لیے تھی۔

(۲۳ شوال ۷۷ ۱۳ھ)

سوال ٦٦

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ مسماۃ وسائی نے برضا و رغبت اپنی دختر امیراں محمد نواز کو نکاح کر کے دی اور کچھ عرصہ بعد اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد نواز نے میرے ساتھ اس نکاح سے قبل امر ناجائز کا ارتکاب کیا اور اس پر شہادت پیش کی۔ کیا اس طرح امیراں کا نکاح باطل ہوجاتا ہے؟ بینوا و توجروا۔

---

[1]۔(بخاری شریف۔ ج 1 ص 200، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

جواب

نحمدہٗ علیٰ علمه و قدرته و نصلی علیٰ رسولهٖ بفضلهٖ و رحمتهٖ ۔عرض ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مندرجہ ذیل امور مسماۃ وسائی کے بطلانِ دعویٰ پر شاہد عدل ہیں۔

۱۔ جب کوئی شخص کسی ایسی چیز کے توڑنے کا دعویٰ کرے جس کا اکمال اور اتمام اس کے ہاتھوں ہوا ہو، تو اس کا دعویٰ بالکل باطل اور مردود ہے۔یعنی جب مسماۃ وسائی نے اپنی دختر امیراں برضا ورغبت محمد نواز کو نکاح کر کے دی۔

اب اس کے بعد اس نکاح کے ابطال کا ادعا جس کی تکمیل اس کے ہاتھوں ہوئی تھی، بالکل غلط ہے۔ ایسی حرمت کے ہوتے ہوئے اس نے اپنی لڑکی کا نکاح کیوں ہونے دیا؟ اس کا یہ اقدام ہی اس کے دعویٔ حرمتِ مصاہرہ کو باطل کر دیتا ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے: **من سعیٰ فی نقض ماتم من جهتهٖ فسعیه مردود علیه۔**

ترجمہ: جس شخص نے اس چیز کو توڑنے میں کوشش کی جو اس کی جانب سے مکمل ہوئی تو اس کا کوشش کرنا اس پر رد کیا جائے گا۔[۱]

شامی میں ہے: **فاذاکان البائع هو المستحق لاتسمع دعوٰه لتناقضه**

ترجمہ: اگر بائع ہی مستحق ہے تو اس کا دعویٰ تناقض کی وجہ سے نہیں سنا جائے گا۔[۲]

۲۔ حرمتِ مصاہرہ کے گواہ شرعاً شاہد حسبہ ہوتے ہیں یعنی حقوق اللہ کی گواہی اللہ واسطے کی گواہی ہوتی ہے اور بلا عذر اس کی تاخیر سے گواہ فاسق ہو جاتے ہیں۔ گوان کا فسق ان کی زبانی بھی معلوم ہو رہا ہے کہ غلام حسین نے فقیرا کو دروازے پر نگہبانی

۱۔(فتاویٰ شامی۔ج3 ص453، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

۲۔(فتاویٰ شامی۔ج3 ص454، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

کرتے ہوئے پایا۔ گویا زانیوں کے معاون اور محافظ بھی فاسق ہوتے ہیں۔ دوسرے گواہ نے پہلے کو فاسق ثابت کر دیا۔

فتاویٰ شامی میں ہے **متی اخر شاهد الحسبة شهادته بلا عذر فسق**

ترجمہ: جب شاہدہ حسبہ نے اپنی گواہی کو فسق والے عذر کے بغیر مؤخر کیا تو اس کی گواہی رد کی جائے گی۔[1]

فلا تقبل شهادتهما لفسقهما سيماً اذا علما انه يمسكها امساک الزوجات۔

ترجمہ: ان کی گواہی ان کے فسق کی وجہ سے قبول نہیں کی جائے گی خصوصا جس وقت کے وہ جانتے ہوں کہ اس نے عورت کو بیویوں کے روکنے کی طرح روکا ہوا ہے۔[2]

فتاویٰ شامی میں ہے: **ويجب للاداءِ بلا طلب فی حقوق الله الخ و عد الشامی منهم حرمة المصاهره۔**

ترجمہ: شہادت کی ادائیگی حقوق اللہ میں بغیر طلب کے واجب ہے اور امام شامی نے حرمت مصاہرہ کو حقوق اللہ سے شمار کیا ہے۔

درالمختار میں ہے کہ: **یاثم مقلده کقابل شهادته به یفتی۔** یعنی فاسق کی گواہی قبول کرنا بھی منع ہے۔ عداوتِ دنیا کی وجہ سے گواہی قابلِ قبول نہیں۔[3]

درالمختار میں ہے: **فلا تقبل شهادة عدو بسبب الدنيا وجعله ابن كمال عكس الفرع لاجله فتقبل له لا عليه...**

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج4 ص412، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

[2]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج4 ص412)

[3]۔ (درالمختار۔ ص312)

ترجمہ: دشمن کی گواہی عداوتِ دنیاوی وجہ سے قبول نہیں کی جائے گی اور ابن کمال نے دشمن دنیاوی کی گواہی کو مسئلہ شہادت فرع لاصلہ بالعکس قرار دیا تو اس کی گواہی اپنے دشمن کے نفع میں مقبول ہوگی اور نہ ہی نقصان میں۔[1]

هذا مختصراً القلة الباع والعلم والعذر مقبول عندکرام الناس۔

سوال ٦٧

زید نے ہندہ سے نکاح کرتے وقت یہ شرط منظور کر لی کہ میں ہندہ کے حین حیات مجھ پر سابقہ زوجہ زینب کے حقوقِ زوجیت حرام ہیں۔ اب زید اس حلف پر نادم ہے۔ کیا کسی صورت میں وہ اسے اپنے گھر آباد کر سکتا ہے؟ بینوا وتوجروا ارحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

مسئلہ محولہ بالا کو اگر غور سے ملاحظہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل امور پر غور کرنا لازم معلوم ہوتا ہے۔

١۔ حقوقِ زوجیت فقہا کے نزدیک کون کون سے ہیں؟

٢۔ حلال اللہ علی حرام، یا انتِ علی حرام، یا زن من حرام انت وغیرہ الفاظ کے ساتھ اگر قربان وغیرہ کا ذکر بھی کر دیا جائے تو ایلاء ہوگا یا طلاق؟

٣۔ حین حیات ثانیہ کے لفظ کی وجہ سے ایلاء ہوسکتا ہے یا نہیں؟

(ا)......قانیہ میں ہے: **لزوج ان یمنع المرءة من الفزل وله ان یفربها علی اربعة منها ترک الزینة اذا اراد الزوج ترک الزنیة ، الثانی ترک الاجابته**

---

[1] ۔(درمختار۔ص489،مکتبہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

والثالث ترک الصلوٰۃ اھ والرابع الخروج عن منزله بغير اذنه ليس له ان يفر بها على ترک الصلوٰۃ وترک النسل من الخباثة ۔۔۔[1]

معلوم ہوا کہ ہماری اصطلاح میں حقوقِ زوجیت عورت کو گھر میں لا کر نان ونفقہ وغیرہ جسے ''وَساون'' کہتے ہیں، سب حقوقِ زوجیت میں شامل ہے جس میں مضاجعتِ قربان وغیرہ سب داخل ہوں گے اور یہ سب چیزیں حلال اللہ میں سے ہیں اور تحریم حلال یمین ہے

(۲)...... **حلال الله على حرام يا انتِ على حرام،** الخ...... سب قسم کے الفاظ طلاق بائنہ کا باعث ہیں اور حالف نے حقوقِ زوجیت کے تمام افراد بشمول قربان اپنے اوپر حرام کیے ہیں لہٰذا ایلاء نہیں ہوگا بلکہ طلاقِ بائنہ ہوگی۔

خانیہ میں ہے: **اذا قال لامرءة انت على حرام يكون موليا وفى العرف هذا طلاق ولا يكون مولیا اھ**[2]

خانیہ میں ہے: **كذا لو قال والله لا اقربک حتى يقدم فلان لا يكون موليا لانه يتوهم قدرته فى المدة كذا لو قال والله لا اقربک حتى تموتى او يموت فلان لا يكون مولیا لاحتمال ان يموت فلان فى المدة**[3]......

مندرجہ بالا حوالہ جات سے صاف واضح ہے کہ ترکِ قربان کو اگر امر موہوم کے ساتھ معلق کر دے تو ایلاء نہیں ہوگا کیونکہ اس امر کا وقوع چار ماہ کے اندر ممکن ہے۔ اس طرح انقطاعِ حیات بھی۔ لہٰذا ایلاء نہیں ہوگا۔ جب ایلاء نہیں ہوسکتا اور تحریم حلال من الزوجہ عرف طلاق ہے تو طلاق بائنہ واحدہ واقع ہوجائے گی اور بار بار اس کا تکرار نہ ہوسکے

---

[1]۔(قانیہ۔جلد1،ص522 فصل حقوقِ زوجیت)

[2]۔(خانیہ۔جلد1 ص519)

[3]۔(خانیہ۔جلد1 ص544)

گا۔ کیونکہ تکرار پر حالف کا کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ تجدیدِ نکاح کے ذریعے زینب کو ہندہ کے ساتھ جمع کر سکتا ہے۔

واللّٰہ سبحانہٗ اعلم بحقیقۃ الحال والصلوۃ والسلام علیٰ سید البشر والہ الاطھر۔

سوال ۶۸

کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین اندریں مسئلہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بشمول علم ہر ذرۂ کائنات پر کیا دلیل ہے؟ ایک صاحب نے ہاتھ میں تنکا پکڑ کر کہا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس تنکا کو جانتے ہیں؟ ایک سنی عالم نے جو اس مجلس میں موجود تھے، فرمایا کہ یہ تنکا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جانتا ہے یا نہیں؟ تو وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کی کیا دلیل کہ یہ تنکا آنحضرت کو جانتا ہے۔ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم کلی معجزہ عطائی ہے اور معجزہ کا انکار کفر ہے جیسا کہ صاحب روح المعانی نے حدیث فتجلی لی پر لکھا ہے۔

باقی رہا تنکا کا حضرت کو جاننا تو حجۃ اللہ علی العالمین میں ہے: جس نے اپنے مالک کی شکایت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا اس نے آپ کو پہچان لیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں؟ فرمایا: **انہ لیس من شئی الا یعرف انی رسول اللّٰہ غیر کفرۃ الجن والانس**

خلاصہ عبارت: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ان دو سخت زمینوں کے درمیان ہر چیز جانتی

ہے کہ میں اللہ کا نبی ہوں لیکن کافر انسان اور کافر جنوں کو یہ علم نہیں۔[1]

اور دارمی اور ابو نعیم نے جابر بن عبداللہ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے: **قال دفعنا مع رسول اللہ ﷺ الی حائط بنی النجار فاذا فیه جمل لا یدخل الحائط احد الاشد علیه فذکر ذلک للنبی ﷺ فاتاه فدعاه فجاء واضعا مشفرة علی الارض حتی برک بین یدیه فقال هاتوا خطاما فخطمه ودفعه الی صاحبه ثم التفت فقال ما من شئی بین السماء الی الارض یعلم انی رسول اللہ ﷺ الا عاصی الجن و الانس** (الحدیث)۔

ترجمہ: سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بنو نجار کے باغ میں گئے اچانک اس میں ایک اونٹ ملا جو باغ میں داخل ہونے والے ہر شخص پر ٹوٹ پڑتا تھا۔لوگوں نے اس کا تذکرہ آپ ﷺ سے کیا آپ ﷺ اس کے پاس گئے اور اسے پکارا تو وہ اپنا ہونٹ لٹکائے آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا آپ ﷺ نے فرمایا: لگام لاؤ آپ نے اسے لگام لگا دی اور اس کے مالک کے حوالے کر دیا پھر متوجہ ہو کر فرمایا جن و انس کے نافرمانوں کے علاوہ زمین و آسمان میں کوئی ایسا نہیں جو یہ نہ جانتا ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔[2] **واللہ ولی الارشاد۔**

سوال ٦٩

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وسمہ لگانے والے کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز ہے۔

۱۔(حجۃ اللہ علی العالمین۔ چھٹا باب وہ معجزات جن میں جانور آپ کے ساتھ ہم کلام ہوئے)

۲۔(سنن دارمی۔ باب ما اکرام اللہ بھی نبیہ ﷺ من ایمان الشجر بھی والبھاوالجن)

جواب

اس مسئلہ کو کماحقہٗ سمجھنے کے لیے اس مضمون کی جملہ موافق اور مخالف احادیث پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

غیاث اللغات:" کتم بفتحتین گیا هیست که بداں خضاب کنند از منتخب و در لطائف گیا هیست که خلط کرده شود بوسمه ودا برهان نوشته که لفظ عربیت بالفتح برگ نیل که ازاں وسمه سازند و بفتحتین گیا هیست شبیه بوسمه که داخل بوسمه کنند۔"

ترجمہ: کتم وہ گھاس ہے جس کے ساتھ خضاب تیار کرتے ہیں اور لطائف میں ہے کہ یہ وہ گھاس ہے کہ جس کو وسمہ کے ساتھ ملایا جاتا ہے اور برھان میں لکھا ہے کہ یہ نیلے رنگ کے پتے کہ جن سے وسمہ بناتے ہیں

ملاحظہ ہو: **عن ابی ذر ان احسن ماغیرتم به الشیب الحناء والکتم**

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے ذریعے تم سفید بالوں کی رنگت تبدیل کرتے ہو اس میں سب سے بہتر مہندی اور وسمہ ہے۔[1]

وعن عثمان بن موهب قال دخلت علی ام سلمة رضی اللہ عنہا فاخرجت الی شعرا من شعر الرسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخضوبا بالحناء والکتم

ترجمہ: عثمان بن موہب بیان کرتے ہیں کہ میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بال نکال کر مجھے دکھایا جو مہندی

---

[1]۔(سنن ابن ماجہ۔ کتاب اللباس، باب الخضاب بالحناء، حدیث نمبر 3622)

اور وسمہ سے رنگا ہوا تھا۔[1]

ورووا حدیثاً من النبی ﷺ نھی عن تغییر الشیب وھو غیر صحیح

ترجمہ: اور ایک حدیث پاک انہوں نے روایت کی ہے کہ جس میں بڑھاپے کو تبدیل کرنے یعنی وسمہ لگانے سے منع کیا گیا ہے۔ اور وہ صحیح نہیں ہے بخاری شریف کی اُس حدیث پاک کی وجہ سے جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

قال رسول اللّٰہ ﷺ ان الیھود والنصاری لا یصبغون فخالفوھم

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہود اور عیسائی نہیں رنگتے تم ان کی مخالفت کرو۔[2]

فالتغیر مامور والازالۃ ممنوع وبینھا بون بعید۔

ترجمہ: تغیر کا حکم دیا گیا ہے اور ازالہ ممنوع ہے حالانکہ ان دونوں کے درمیان بہت دوری ہے۔

وعن اُبی وآخرین انہ ﷺ لم یغیر شیبہ وقد ذکرنا انفا حدیثا عن ابی ذر و عن عثمان وھکذا روی عن جابر قال ﷺ لا بی بکر رضی اللہ عنہ بتغیر الشیب۔

ترجمہ: ابی اور دیگر حضرات سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے سفید بالوں پر مہندی نہیں لگائی حالانکہ ہم نے ابھی ابوذر اور عثمان سے ابھی روایات بیان کی ہیں۔

وقال سیدی ووالدی رحمۃ اللّٰہ قول مسلم جنبوا لسواد شاذ منکر لحدیث ابی بکر وابی ذر بالحناء والکتم۔

۱۔ (سنن ابن ماجہ۔ کتاب اللباس، باب الخضاب بالحناء، حدیث نمبر 3623)

۲۔ (مشکوۃ شریف۔ ج2 ص380، باب الترجل)

ترجمہ: میرے والد گرامی نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت ابوذر کی روایت کی وجہ سے مسلم کا قول (جنبو السواد یعنی بالوں کو سیاہ کرنے سے بچو) یہ شاذ منکر ہے

وقال الآخرون الخضاب افضل وخضب جماعة من الصحابة والتابعين ثم اختلف هولاء كان اكثرهم يخضب بالصفرة منهم ابن عمر وابى هريرة رضی اللہ عنہ وخضب منهم بالحناء والكتم والكتم كان سببا للسواد كما مر انفا من اللغة وخضب جماعة من الصحابة رضی اللہ عنہ والتابعين رضوان الله عليهم اجمعين روى ذالك عن عثمان والحسن والحسين وعقبة بن عامر و ابن سيرين وابى بردة وآخرين فانظر ياايها الاخى فكيف ينسب بالحرمة والعذاب حال كونه مختلفافيه من المتقدمين واذا ثبت جواز تغيير الشيب فحمل كل على منشاء و رضاء وينبغى لا ينظر الى ماروى وكفى بالمرءكذبا ان يحدث لكل ماسمع۔ والحق انه لم يختضب رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لان روى عن انس رضى الله عنه لو شئت اعد شمطات كن فى راسه فعلت قال ولم يختضب فقال ما ادرى فى هذالذى يحدثون (اى بخضاب رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الا ان يكون ذالك من الطيب الذى كان يطيب به شعره لانه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كان يستعمل الطيب كثيرا وهو يزيل السواد ويحتمل انه خضب احيانا و ترك معظم الاوقات هكذا النووى والقارى رحم الله اجمعين وروى ابن ماجه عن صهيب الخير قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان احسن ما اختضبتم به لهذا السواد ارغب لنسائكم فيكم وارهب لكم فى صدور عدوكم قيل هذا الحديث ضعيف لان السدوسى لين الحديث لكن ماروى الطبرانى فى النهى والوعيد قال الحافظ ابن حجر و سنده لين واذا كان لين الاسناد فبحكم

اذا تعارضا تساقطا والاباحة اصل فلترجع الیها یا اخی لونهی صلی اللّٰہ علیه واسلم لم یخضب عمر رضی اللّٰہ عنہ ابن خطاب و عثمان رضی اللّٰہ عنہ بن عفان ماقیل فی حقهم علیکم بسنتی وسنة خلفاء الراشدین ولم یعمل بها عترت النبی قطعا وقال صلی اللّٰہ علیه وسلم لن تضلوا بعدی ما تمسکتم بهما کتاب اللّٰہ و عترتی وشهد لهما بالجنة کماروی فی الصحاح وروی ابن وهب عن مالک قال لم اسمع فی صبغ الشعر بالسواد نهیا معلوما وغیره احب الی وعن احمد فیه روایتان وروی جوازه عن ابی یوسف علیہ الرحمۃ وعن الامام ایضاً نقله عالمگیریه وقال محمد لا نری بالخضاب بالوسمه والحناء والصفرة باسا وان ترکه ابیض فلاباس کل ذالک حسن و حقق فی هذالمسئلة حق التحقیق سیدی و سندی سید العلماء العاملین و سند الصلحاء الراسخین سیدی مهر علی شاه رحمة اللّٰہ تعالیٰ علیه وانظر ثمه۔ فی فتاویٰ عالمگیریہ

ترجمہ: اور دوسروں نے کہا کہ خضاب افضل ہے اور صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے خضاب لگایا پھر ان حضرات نے مختلف قسم کے خضاب استعمال فرمائے ان میں سے اکثر زرد خضاب استعمال فرمایا کرتے تھے ان میں عبداللہ ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں اور ان میں سے بعض نے مہندی اور کتم کا خضاب استعمال کیا اور کتم یہ سیاہی کا سبب ہے جس طرح کہ لغت کے حوالے سے ابھی گزرا ہے یہ بات حضرت عثمان حسنین کریمین، عقبہ بن عامر اور حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنھم سے مروی ہے پس اے بھائی اس کو حرمت اور عذاب کے ساتھ کس طرح منسوب کیا جائے گا حالانکہ اس میں متقدمین کا اختلاف ہے اور جب سفیدی کو تبدیل کرنے کا جواز ثابت ہوگیا تو ہر ایک نے اپنی منشاہ اور مرضی کے مطابق عمل کیا اور مناسب ہے کہ اس چیز کی طرف نہ دیکھا جائے جو

مروی ہے اور مرد کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہر وہ بات بیان کرے جس کو اس نے سنا اور حق یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا۔ کیونکہ انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خضاب کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا اگر میں چاہتا کہ وہ سفید بال گنو جو آپ کے سر میں تھے تو میں کر لیتا۔[۱]

تو کہا کہ میں نہیں جانتا جو لوگ آقا علیہ الصلوۃ والسلام کے خضاب کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طیب (خوشبو دار تیل) کا استعمال زیادہ فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے کبھی کبھار خضاب استعمال فرمایا ہو اور اکثر طور پر اس کو چھوڑا ہو۔ اسی طرح امام نووی اور مُلا علی قاری رحمہا اللہ نے فرمایا اور ابن ماجہ نے صہیب الخیر سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم لوگ جس چیز کو خضاب کے طور پر استعمال کرتے ہو اس میں سب سے بہترین چیز سیاہ خضاب ہے جو تمہارے بارے میں تمہاری خواتین کو سب سے زیادہ پسند ہوگا اور اس کی وجہ سے تمہارے دشمن کے دل میں تمہاری زیادہ ہیبت ہوگی۔ (سنن ابن ماجہ۔ کتاب الباس، باب الخضاب بالسواد) اس حدیث پاک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی سدوسی لین الحدیث (کمزور) ہیں لیکن جو طبرانی نے نہی اور وعید میں جو کچھ روایت کیا ہے حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ اس کی سند کمزور ہے اور جب دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے کمزور ہیں تو (اذا تعارضا تساقطا) کے قاعدہ کے مطابق دونوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور اباحت اصل ہے تو اے بھائی اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہوتا تو عمر بن خطاب، عثمان بن عفان جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **علیکم بسنتی وسنة خلفاء الراشدین** (تم پر میرا اور خلفاء راشدین کا طریقہ لازم ہے) اور اس پر اہل بیت کرام نے

۱۔ (مشکوۃ شریف۔ ج2، حدیث 4277، باب الترجل، الفصل الثالث)

عمل نہیں کیا حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا۔

لن تضلوا بعدی ما تمسکتم بهما کتاب الله و عترتی۔

ترجمہ: (اگر تم نے اللہ تعالی کی کتاب اور میری اہل بیت کے ساتھ تعلق قائم رکھا تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے) ابن وہب نے امام مالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ میں نے سیاہ (خضاب) کے بارے میں کوئی نہی نہیں سنی حالانکہ اس کے علاوہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ امام احمد بن حنبل سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے اس کا جواز مروی ہے اور امام صاحب سے بھی اسی طرح مروی ہے جس کو عالمگیریہ نے نقل کیا امام محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم وسمہ مہندی اور زرد خضاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور بے شک بالوں کو سفید چھوڑنا اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اس مسئلہ کی تحقیق **سیدی سندی سید العلماء وسندالصلحاء الراسخین** حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے طریقہ سے تحقیق بیان فرمائی جس طرح کہ تحقیق کا حق ہے۔

سوال ۷۰

بعض احادیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خضابِ سیاہ بالوں کو لگانا درست نہیں ہے۔ شرعی طور پر کیا حکم ہے؟

جواب

اتفق المشائخ ان الخضاب بالحمرة سنة ای بمعنی انه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امر به لابی بکر رضی اللہ عنہ صدیق وانه من سیماء الصالحین وعلاماتهم وان الخضاب

بالسواد فمن فعل ذالک فی الغزو لیکون اهیب فی عین العدو فهو محمود و علیه اتفق المشائخ وان فعل لیزین نفسه للنساء ولیحبب الیهن فذالک مکروه وعلیه عامة المشائخ وبعضهم جوزوا ذالک من غیر کراهة وروی عن ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ قال کما یعجبنی ان تتزین لی یعجبها ان اتزین لها کذا فی الزخیرة وعن الامام ان الخضاب حسن لکن بالحناء والکتم والوسمة واراد به اللحیة وشعر الراس والخضاب ...... خضاب مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ بدائع میں ہے۔ جب اموات آپس میں مخلوط ہو جائیں اور مومن و کافر کا پتہ نہ چلے تو چار علامتیں مسلمان کی ہیں۔ **ختان ولبس السواد، وحلق العانة والخضاب**[1]

سوال ۷۱

قالولکم رحمکم اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں کہ آج کل بعض آئمہ نماز پڑھاتے وقت سورۃ فاتحہ میں ''غیر المغضوب والضالین'' میں بجائے ''ضاد'' کے ''ظا'' معلوم ہوتا ہے۔ اگر ان کو ''ضاد'' پڑھنے کی تلقین کی جائے تو کہتے ہیں کہ مخرج ضاد کا بہت مشکل ہے، کوئی شخص اس کو ادا نہیں کر سکتا۔ کیا ایسے شخصوں کی امامت جائز ہے؟ نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب

دراصل آج کل کے قراء استاذہ مختلف طرق اور طرز ادا کی پیروی کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ نماز رہے یا نہ رہے، ان کی بلا سے۔ تحقیق مسئلہ کے طور پر مختصراً اتنا عرض ہے کہ جو شخص تفریق اور صحیح طور پر ادائیگی نہیں کر سکتا تو نماز فاسد نہیں ہوتی اور جو شخص عمداً باوجود

۱۔(بدائع۔ ج1ص303)

قدرت کے لفظ کے صحیح تلفظ ادا نہیں کرتا، اگر اس تغیر سے حرف بدل جاتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ لفظ کا معنی بدل گیا ہے یا نہیں، اگر معنی نہیں بدلا تو نماز فاسد نہیں ہوتی اور اگر معنی بدل جاتا ہے پھر اگر وہ بغیر تکلیف کے فرق پر قادر ہے جیسے ''طا'' اور صادؔ'' کے مابین، تو سب کے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ اگر مشقت کے ساتھ فرق ہوتا ہے جیسے ''ظا'' اور ''ضادؔ'' کے مابین تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ نماز فاسد نہیں ہوئی۔

قاضی امام ابوحسن اور قاضی امام ابو عاصم کہتے ہیں کہ اگر عمداً ایسا کرے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور اگر زبان پر اتفاقاً وہ لفظ جاری ہو گیا ہے یا وہ اچھی طرح ان الفاظ میں تمیز نہیں کر سکتا تو نماز فاسد نہ ہو گی۔ اور یہی بات سب اقوال سے احوط اور انصف ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **ان ذکر حرفا وکان حرف ولم یغیر المعنی بان قرء ان المسلمون مکان الظالمون و ماءا شبه ذلک لم تفسد صلاته۔ وان غیر المعنی فان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاء فقرء الطالحات مکان الصالحات تفسد صلاته عند الکل وان کان لا یمکن الفصل الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین والتا مع الطاء اختلف المشائخ قال اکثرهم لا تفسد صلاته هکذا فی فتاویٰ قاضی خان وکثیر من المشائخ افتوا به قال القاضی الامام ابوالحسن والقاضی امام ابو عاصم ان تعمد فسدت وان جری علی لسانه او کان لا یعرف التمییز لا تفسد وهو اعدل الا قاویل والمختار هکذا فی الوجیز الکردری۔**

ترجمہ: ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف ذکر کیا مثلاً ان المسلمین کی جگہ ان المسلمون اور ان الظالمین کی جگہ ان الظالمون پڑھا تو نماز فاسد نہ ہو گی اور اگر معنیٰ بدل گئے ہیں پس اگر وہ دونوں حروف ایسے تھے کہ ان میں جدائی آسانی سے ممکن تھی جیسا کہ، ط، اور صاد پس

اگر کسی نے صالحات کی جگہ طالحات پڑھا تو سب کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اگر وہ دونوں حرف ایسے تھے کہ ان میں مشقت کے بغیر فرق نہیں ہوسکتا تھا جیسا کہ، ظا، اور، ضاد، اور، صاد، اورسین، اور، طا، اس میں مشائخ کا اختلاف ہے اکثر کا قول یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی یہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے اور اکثر مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے امام ابوالحسن، قاضی امام ابو عاصم نے کہا ہے کہ جان بوجھ کر ایسا کرے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر اتفاقاً اس کی زبان سے نکل گیا یا ان میں تمیز نہیں جانتا تو فاسد نہ ہوگی۔ اور یہی سب قولوں میں ٹھیک اور مختار ہے۔ اور یہ وجیز میں لکھا ہے جو کُردی کی تصنیف ہے۔[1]

وقال صاحب الخلاصة ۔ ولو قرء ليغيظ بالضاد او بالظاء اوقرء المغضوب بالظاء او بالذال يفسد ولو قرء الضالين بالظاء والذل لا يفسد ۔

ترجمہ: خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے کہ اگر لیغیظ کو، ضاد یا، ظا، کے ساتھ پڑھا یا مغضوب کو ظا کے ساتھ پڑھا یا ذال کے ساتھ پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر والضالین کو ظا کے ساتھ پڑھا یا ذال کے ساتھ پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔[2] واللہ اعلم بالصواب

سوال ۷۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید نے پہلے ایک قطعہ فی سبیل اللہ مسجد کے لیے دیا ہے۔ پھر صحن کی تنگی کی وجہ سے بعض طاقت ور لوگوں نے معاوضہ میں زمین دینے کا وعدہ کیا ہے اور مزید اراضی اس شخص سے حاصل کر کے مسجد کا صحن کشادہ کر لیا ہے اور اب اسے معاوضہ بھی نہیں دیتے، ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1]۔ (فتاوی عالمگیری۔ ج 1 ص 79، باب القرات)

[2]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج 1 ص 106،)

(سائل از بہاری تھل)

جواب

مسجد کی تنگی کی صورت میں پاس والے ہمسایہ کی زمین زبردستی قیمت ادا کر کے لینی بھی جائز ہے، یہاں تو اس نے رضامندی سے دی ہے۔ ہاں انہیں موعودہ معاوضہ فوری ادا کرنا چاہیے ورنہ یہ اراضی مغصوبہ ہوگی جس کی قیمت بھی ادا نہیں کی گئی اور ارضِ مغصوبہ میں نماز درست نہیں ہوتی۔ حاشیہ کنز الدقائق میں ہے: **وان جعل شی من الطریق مسجد اصح معناہ اذا بنی قوم مسجد او احتاجوا الی مکان لیتسع فادخلوا من الطریق فی المسجد وکان ذلک لا یضر باصحاب الطریق جاز وکذا اذا اضاق المسجد علی الناس وبحنببہ ارض رجل توخذ ارضہ بالقیمۃ کرھا لما روی ان الصحابۃ رضی اللہ عنہ لما ضاق المسجد الحرام اخذوا ارضین بکرہ من اصحابھا بالقیمۃ وزادوا فی المسجد الحرام اھ ک۔**

خلاصہ عبارت: اگر راستے سے کسی چیز کو مسجد بنایا گیا تو یہ صحیح ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ جب لوگوں نے مسجد بنائی اور پھر مسجد تنگ ہوگئی اور ان کو جگہ کی ضرورت ہوئی تا کہ مسجد کو وسیع کریں تو عام راستہ سے اس کو وسیع کرنا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے راستے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ اور اسی طرح جب مسجد لوگوں پر تنگ ہو جائے اور اس کے کنارے میں کسی شخص کی زمین پڑی ہے تو اس سے وہ زمین جبراً قیمت دے کر لی جائے گی۔ جس طرح کہ جب مسجد حرام شریف کی زمین کم ہوگئی تو صحابہ کرام نے آس پاس والی زمینیں قیمت کے ساتھ خریدی اور مسجد حرام شریف کے اندر اضافہ کیا۔[1]

و فعلہ مرّۃ اخری السلطان ابن سعود النجدی فی زماننا ۱۳۷۸ھ

---

[1]۔ (حاشیہ کنز الدقائق، نمبر 7، ص 257، مکتبۃ الحسن لاہور)

ووسع فی حرم المحترم وسعة بليغا۔

ترجمہ: اور دوسری مرتبہ یہ کام ہمارے زمانے یعنی 1378ھ میں سلطان ابن سعود نجدی نے کیا اور حرم شریف کے اندر کافی اضافہ کیا۔ واللہ ولی الرشاد

سوال ۷۳

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ قبور پر قبہ اور بناء جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ **لا یبنیٰ علیه** اور فقہی کتب میں ہے **لا یرفع علیه البناء۔**

جواب

کتبِ فقہ میں جہاں منع ہے وہ عوام مسلمین کے قبرستان میں بوجہ تنگی منع کیا گیا ہے۔ اگر اراضی مملوکہ ہو اور ورثا اپنی رقم سے بنائیں تو منع نہیں۔ خاص کر جب عوام میں اولیاء اللہ اوران کے پاک مسلک کی عظمت کا اظہار مقصود ہو،

روح البیان میں ہے: **فبناء القباب علی قبور العلماء والاولیاء والصلحاء امر جائز اذا کان القصد بذلک التعظیم فی اعین العامة حتی لا یحتقرو صاحب هذا القبر۔**

ترجمہ: علماء ، اولیا اور صلحا کی قبروں پر قبہ بنانا جائز ہے جب کہ یہ کام تعظیم کے ارادہ سے ہوتا کہ لوگ قبر والے کو حقیر نہ سمجھیں۔ [1]

بخاری کی حدیث میں ہے کہ دیوار حجرہ شریف گر جانے سے اور نئی بناء بنانے کا موقع

۱۔(تفسیر روح البیان۔ج2ص279)

آیا تو حضرت عمرؓ کے قدم ظاہر ہو گئے۔ بدرالدین عینی نے جوازِ بناء پر استنباط کیا ہے۔[1]

بدائع صنائع میں ہے: **ضرب عمر رضی اللہ عنہ علی قبر زینب بنت جحش ؓ** ......

بدائع کی عبارت میں حضرت ابن عباسؓ پر طائف میں محمد بن الحنیفۃؒ نے فسطاط بنوایا اور حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر بھی اسی طرح کچھ بنایا۔[2]

منتقی شرح موطا امام مالک اور کتاب الام میں امام شافعی سے بھی منع صرف عوام مسلمین پر تنگی ہو جانے کی وجہ سے مذکور ہے۔[3]

شامی میں ہے: **وقیل لا یکرہ البناء اذا کان المیت من المشائخ والعلماء والسادات** ۔ ترجمہ: جس وقت میت مشائخ، علماء اور سادات میں سے ہو تو اس وقت عمارت بنانا مکروہ نہیں ہے۔[4] شرح سفر السعادت میں بھی مفصل طور پر اس بحث کو ذکر فرمایا ہے مولوی فیض احمد صاحب گجوی بھکروی نے مفصل طور پر ایک فتویٰ شائع کیا ہے[5]

سوال ۴۷

۱۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ صبح کی نماز کے ذکرِ جہر جائز ہے یا نہیں؟ بعض مہاجرین ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اُٹھ کر بھاگ جاتے ہیں اور عذر یہ کرتے ہیں کہ جو لوگ بقایا علیحدہ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں، ان کی نماز

۱۔(بخاری شریف۔ جلد 1 ص 184 میں ھشام بن عروہ عن ابیہ)

۲۔(بدائع صنائع۔ج 1 ص 320 اور عینی شرح بخاری۔ج 4 ص 149)

۳۔(کتاب الام۔ج 1 ص 245)

۴۔(فتاویٰ شامی۔ج 1 ص 662)

۵۔(شرح سفر السعادت۔ص 272)

میں خلل واقع ہوتا ہے۔

۲۔ سورۃ الملک جمعہ کی رات پیش امام بلند آواز میں پڑھتا ہے اور تمام نمازی سنتے ہیں اسے بھی وہ اسی عذر کی بنا پر منع کرتے ہیں۔ بحوالہ کتب جواب عنایت فرمایا جاوے۔

(عارف خان از جنڈانوالہ)

جواب

نماز کے بعد اور مطلقاً دیگر اوقات میں بھی ذکرِ جہر مستحب بلکہ مسنون ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے: **يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ**

ترجمہ: جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے۔ (کنزالایمان)

جب نصِ قطعی میں ذکرِ الٰہی کرنے کی ہر حالت میں اجازت ہے، قرآن میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اگر کوئی آدمی نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرو۔ بہت سے آدمیوں کا مل کر ذکرِ جہر کرنا بھی کثرت کے ساتھ احادیث سے ثابت ہے۔

طبرانی میں ہے: **رواہ عن ابن الحنظلیة قال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما جلس قوم مجلسا یذکرون اللّٰه فیه فیقومون حتی یقال لهم قوموا قد غفر اللّٰه لهم... ورواہ احمد و لترمذی عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا قالوا یا رسول اللّٰه ما ریاض الجنة قال حلق الذکر۔**

ترجمہ: انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم جنت کی کیاریوں سے گزرو تو کچھ چر لیا کرو۔ لوگوں نے پوچھا جنت کی کیاریاں کیا ہیں؟ فرمایا ذکر کے حلقے۔[1]

۱۔(مشکوٰۃ شریف۔ص200،مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

باقی رہا صبح کی نماز کے بعد متصل ذکر کرنا تو مشکوٰۃ شریف نے اس مسئلہ کو بیان کرنے کے لیے علیحدہ باب باندھا ہے باب الذکر بعد الصلوٰۃ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے: **کنت اعرف انقضاء صلوٰۃ رسول اللہ ﷺ بالتکبیر۔**

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے نماز سے فارغ ہونے کو تکبیر (اللہ اکبر) سے پہچانتا تھا۔[1]

یعنی مجھے آنحضرت ﷺ کی نماز کے ختم ہونے کا یقین اس بات سے ہوتا تھا کہ جب سب لوگ نماز ختم کر کے بلند آواز سے تکبیر پڑھتے۔ رہ گیا یہ مغالطہ کہ نمازیوں کی نماز میں خلل احتمالی کی وجہ سے ایک قطعی اور یقینی ثواب کا کام ترک کر دیا جائے، احتمالی میں نے اس لیے کہا ہے کہ سب آدمی اس معاملہ میں ایک سے نہیں ہوتے۔ بعض لوگوں کے پاس ڈھول پٹتا ہو تو اطمینان کے ساتھ نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بعض کو بے شک خلل واقع ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے نماز پڑھنے والے کو منع کیا ہے کہ تم دوسری جگہ جا کر نماز پڑھو نہ کہ پوری جماعت ذکرِ الٰہی سے خاموش ہو جائے۔

ہدایہ شریف میں ہے: **ولا باس بان یصلی الی ظھر رجل قاعد یتحدث۔**

ترجمہ: اور کسی ایسے آدمی کی پشت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے جو بیٹھا ہو اور بات کر رہا ہو۔[2]

یعنی ایک آدمی مسجد میں بیٹھا باتیں کر رہا ہے یا پڑھ رہا ہے تو دوسرا آدمی بلا کراہت اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور حاشیہ پر ایک حدیث شریف نقل کی گئی ہے کہ حضور سرورِ کونین ﷺ فداہ ابی وامی نے اس بات سے منع کیا ہے کہ کوئی شخص ایسی جگہ

---

[1] ۔ (مشکوٰۃ شریف۔ ص 89۔ باب الذکر بعد الصلوٰۃ)

[2] ۔ (ہدایہ شریف۔ ج 1 ص 120)

نماز پڑھے جہاں لوگ باتیں کر رہے ہیں یا سو رہے ہوں ...... معلوم ہوا اگر اس کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے تو اسے مسجد میں علیحدہ جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چاہیے نہ کہ اللہ کا ذکر کرنے والے چپ سادھ لیں۔ بعینہٖ یہی جواب دوسرے سوال کا ہے۔ ہاں سورۃ الملک کا عشاء کے بعد پڑھنا مسنون طریقہ ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے: جابر سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنے تک نہیں سوتے تھے۔[1] جب تک الم تنزیل اور سورۃ الملک نہ پڑھ لیتے تھے...... اور آپؐ نے فرمایا کہ یہ عذابِ الٰہی سے نجات دلانے والی ہے۔ باقی یہ مروجہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے تا کہ وہ لوگ بھی اس ثواب میں شامل ہو جائیں جنہیں یہ سورۃ یاد نہیں کیونکہ قرآن کریم جس طرح پڑھنا ثواب ہے، اس طرح سننا بھی، مختصراً اتنا عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کا مالک ...... ضد اور ہٹ دھرمی کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (۲ شعبان ۱۳۷۹ھ)

سوال ۷۵

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ آج کل لوگ سرکاری زمین ٹینڈر (ٹھیکہ) ایک سال کے لیے پیشگی رقم ادا کر کے زراعت کے لیے خریدتے ہیں۔ اس پیداوار کا عشر یا بیسواں سرکار پر لازم ہے یا مستاجر پر؟ بینوا و توجروا ارحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از آہیرانوالہ)

جواب

یہ مسئلہ حضرت امام اور صاحبین کے مابین مختلف ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ

---

[1]۔ (مشکوٰۃ شریف۔ ص 190،)

موجر یعنی مالک پر لازم ہوگا اور صاحبین فرماتے ہیں کہ مستاجر پر۔ امام صاحب کے مسلک پر اکثر متاخرین نے فتویٰ دیا ہے جن میں خیر ارملی، شیخ المعین مفتی دمشق حامد آفندی حاوی القدسی قاضی خان صاحب الترجیم زکریہ آفندی شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی شیخ الاسلام وغیرہ حضرات ہیں۔ علامہ شامی کا خیال ہے کہ مستاجر پر ہونا چاہیے۔

فتاویٰ شامی میں ہے: **فلا ینبغی العدول عن الافتاء بقولهما فی زماننا** الخ

ترجمہ: ہمارے زمانے میں صاحبین کے قول پر فتویٰ دینے سے عدول مناسب نہیں ہے۔[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں: **فان امکن اخذ الاجرة کاملة یفتی بقول الامام والا بقولهما یلزم علیه من الضرر الواضح الذی لا یقول به احدٌ** الخ......

ترجمہ: اگر اجرت کا مکمل طور پر لینا ممکن ہو تو امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا و گرنہ صاحبین کے قول پر اس ضرر کی وجہ سے فتویٰ دیا جائے گا جو اس پر لازم آرہا ہے جس کا کوئی شخص بھی قائل نہیں۔[2]

یہاں بھی مابعد آبیانہ ٹیکس وغیرہ سب مستاجر پر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ٹھیکہ کی رقم بھی وصول نہیں ہوتی۔ لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ اجارہ کی رقم پیداوار سے منہا کر کے بقایا کا عشر ادا کرے۔ واللہ اعلم بالصواب (۱۶ محرم ۱۳۷۴ھ)

سوال ۷۶

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ میں نے اپنی عورت کو جھگڑے کی

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص60)

[2]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص60)

حالت میں کہا ہے کہ میں نے تمہیں طلاق دی ہے۔ یہ لفظ صرف ایک دفعہ کہا ہے اور میں نے یہی بیان اپنے پیش امام حافظ محمد بکر کے سامنے بھی دیے ہیں لیکن اس نے تمام لوگوں کو بتلا دیا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری بیوی مطلقہ ہو چکی ہے۔ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از چک ٹی ڈی دے مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۶۰ء)

جواب

بعد تصدیق از امام صاحب یہ طلاق رجعی ہے اور رجوع قولاً اور فعلاً دونوں طرح سے ہوسکتا ہے۔ بقول سائل اس کی بیوی ابھی تک سائل کے گھر میں آباد ہے تو رجوع فعلی سے طلاق مرتفع ہو جائے گی۔ ہاں اگر پھر کبھی ایک طلاق منہ سے نکلی تو یہ دونوں مل جائیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۷۷

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ میں نے تمہیں چھوڑا ہے، تم گھر (میکے) چلی جاؤ۔ پھر ہاتھ میں جو جست کا لوٹا تھا، اسے پھینک دیا اور کہا کہ لوگ تو ایک بار چھوڑتے ہیں میں نے تمہیں سو مرتبہ چھوڑا ہے۔ میری بیوی میرے گھر میں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مغلظہ ہوگئی ہے، بغیر تحلیل گھر میں نہیں رہ سکتی اور تحلیل تو سخت قابلِ نفرت عمل ہے۔ بینوا ارحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از بلوخیل، میانوالی)

جواب

یہ مسئلہ گو مختلف فیہ ہے کہ لفظ چھوڑی صریح ہے یا بائن جیسا کہ سائل کے پاس بے

شمار جوابات کا پلندہ موجود ہے اور سب جوابات مختلف ہیں۔ بعض نے صریح بتایا ہے، بعض نے بائن۔ عاجز ناقص الخیال اور اس کے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ بائن ہے۔ یہ سرختک کا ترجمہ ہے، کما صرح بہ صاحب الخلاصۃ و عالمگیریہ و علامہ الشامی، یہ طلاق کا ترجمہ نہیں ہے جیسا کہ مولوی عبدالحیی صاحب لکھنوی اور ان کے متبعین نے لکھا ہے کیونکہ اگر اس کا ترجمہ ہوتا تو پھر عرفاً اس کے آگے لفظ طلاق نہ کہتے۔ ہماری عام عرف یہ ہے کہ لوگ قطعی طلاق دیتے وقت کہتے ہیں کہ میں نے تجھے تین طلاق سے چھوڑا ہے۔ ہاں بقول شامیؒ یہ وقوعاً صریح ہے یعنی عرف کی وجہ سے بعض الفاظ کنائی ہونے کے باوجود صریح بن جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیت کی ضرورت نہ ہوگی۔ طلاق واقع ہو جائے گی اور معنیٰ کنائی ہے یعنی مفہوماً بائن واقع ہوگی۔ بعض لوگوں کو فقہا کی ان عبارتوں سے دھوکا ہوا ہے کہ عرف عام کی وجہ سے یہ لفظ صریح بن گیا ہے گو دراصل کنائی تھا۔ یعنی وہ نیت کا محتاج نہ ہوگا۔ اگر حالف کہے کہ میری نیت طلاق دینے کی نہ تھی تو یہ بات تسلیم نہ کی جائے گی۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے ساتھ صریح واقع ہوگی۔ سائل کے پاس جو جوابات مغربی پاکستان کے مختلف فتویٰ گاہوں سے آئے ہیں اور جنہیں اس لفظ کو صریح بتلایا گیا ہے، انہیں اس کے صریح ہونے پر کوئی قوی دلیل پیش نہیں فرمائی گئی۔ بعض اصحاب نے تو اتنے تک کہا ہے کہ چونکہ بعض علمائے دیوبند اسے کنائی کہہ رہے ہیں، اس لیے ہم اپنے ٹھوس اختلافات کی بنا پر اسے صریح کہیں گے۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ**۔ ہمارا اختلاف ان کے ساتھ عقائد میں ہے۔ یہ مسئلہ فروعات کا ہے۔ فقہی اختلاف کی دلیل کسی معتبر فتاویٰ یا کتبِ مقلدین سے پیش کی جانی چاہیے۔ بندہ نے اس کے کنائی ہونے کے دلائل ''عین الفقہ'' جلد اول میں ذکر کیے ہیں۔ وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ بعض حضرات نے اسے صریح بتانے میں فقہ حنفیہ کی تعریف صریح میں یہ قید لگائی ہے کہ صریح وہ ہے جسے عورتوں کے متعلق طلاق کے سوا

دوسرے معنوں میں استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ گو یہ تعریف متون ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے لیکن پھر بھی مضر نہیں ہے کیونکہ ہماری عرف سے لوگ کہتے ہیں کہ میں نے عورت کو مع سامان اسٹیشن پر چھوڑا ہے، یا بیوی کو ملتان چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ حاشا وکلا ان الفاظ سے ان کی مراد طلاق نہیں ہوتی۔ اب اگر یہ لفظ صریح ہے تو پھر اس کے دوسرے معنی کیوں لیے جا رہے ہیں؟ حوالہء کتب اور تفصیل ماقبل پیش کی جا چکی ہے۔ بعض حضرات نے یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ جب حلت وحرمت میں اختلاف ہو تو حرمت کو ترجیح ہونی چاہیے۔ یہ قاعدہ طلاق میں جاری نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ابغض الحلال ہے اور اس میں عدم وقوع کو ترجیح دینی چاہیے جیسا کہ درالمختار اور دیگر کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔ بلکہ صاحب ہدایہ نے تو تصریح کی ہے کہ جب شک واقع ہو کہ اس لفظ سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہ تو شک کی وجہ سے قطعاً طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ وقوع کے لیے یقین چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

درالمختار میں ہے: **انت علی حرام الف مرۃ تقع واحدۃ**

ترجمہ: تو مجھ پر ہزار مرتبہ حرام ہے تو ایک طلاق واقع ہوگی۔ [1]

ثم قال انت علی حرام ناویاً ثنتین تقع واحدۃ اھ ک

ترجمہ: پھر کہا کہ تو مجھ پر حرام ہے اس حال میں کہ اس کی نیت دو طلاقوں کی تھی تو ایک طلاق واقع ہوگی۔ [2]

سوال ۷۸

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر ناظر

۱۔(درمختار۔باب ایلاء۔ص 233، مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

۲۔(فتاویٰ شامی۔ج 2 ص 603)

اعتقاد رکھنا شرک و کفر ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ صفات خاصۃ اللہ میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی دوسرے کو شریک کرنا قطعاً کفر ہے۔

جواب

درونِ سینۂ آدم چہ نور است!

چہ نور است ایں کہ غیبِ اُو حُضور است!

بخاک آلودہ و پاک از مکان است

نہ بندِ روز و شب پاک از زمان است

اولاً یہ صغریٰ ممنوع ہے کیونکہ اس لفظ کا حقیقتاً اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنا ناجائز ہے۔

درالمختار و شامی میں ہے۔ **یا حاضر یا ناظر لیس بکفر**......[1]

علامہ شامی علت لا یکفر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حاضر بمعنی عالم و ناظر بمعنی رائی ہے تو معلوم ہوا کہ حقیقی معنوں میں اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کفر ہے کیونکہ حاضر کا حقیقی معنی حاضر بہذا الجسم اور ناظر کا معنی ناظر بہذا العین ہے اور اس کا اطلاق یقیناً ناجائز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ پر اطلاق جائز نہ ہو تو خاصہ کس طرح ہوگا؟ پھر کبریٰ ظاہر ہے کہ جب خاصہ نہ ہو تو اس کا اطلاق دوسرے پر شرک نہ ہوگا۔ ثانیاً اسماء الٰہیہ توقیفیہ ہیں اور قرآن و حدیث کتب اور وظائف میں کہیں بھی یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ذکر نہیں کیے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ حاضر ناظر اسمائے الٰھیہ میں سے ہر گز نہیں ہیں۔

سوال: حاضر و ناظر کے مرادف الفاظ شہید و بصیر کا اطلاق جو حقیقتاً جائز ہے، تو ان کا اطلاق بھی جائز ہوگا۔

---

[1]۔(درالمختار و شامی ۔ج 3 ص 317)

جواب: ممکن ہے جس چیز کو ہم مرادف سمجھتے ہیں، واقع میں مرادف نہ ہو۔[1] **وایضاً لانسلم ان الاذن بالشئی اذن بمرادفه ولازمه کیف لا وقد یکونان موهمنین للنقص ولاشک فی صحة اطلاق خال کل شئی ویلزمه خالق القردة والخنازیر مع عدم جواز اطلاق اللازم هکذا فی شرح عقائد نسفی**[2]۔ حق تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ خواص کا ہے بلکہ اخص الخواص کا ہے، عوام کے سامنے منابر پر اس کا بیان کرنا یا اسے میدانِ مناظرہ کے سپرد کرنا غلط ہے۔

در راہِ عشق مرحلۂ قُرب وبُعد نیست

می بینمت عیان ودُعامی فرستمت

(حافظ شیرازی)

بزازیہ میں ہے: **تواتر فی رساتیق آذر بیجان ان قولهم اله تعالیٰ یا حاضر یا ناظر کفر لیس بصحیح فان الحضور بمعنی العلم سائغ و شائع ومایکون من نجوی ثلثة الاهو رابعهم والنظر بمعنی الروئیة الم تعلم بان اللّٰه یریٰ قد ورد فیکون المعنی یا عالم یا من یریٰ فلا یکون کفرا وان لم یصح قول من قال ان اللّٰه لکل مکان بالعلم کما عرف فی الکلام**......[3] گویا حضراتِ فقہا کی کوشش کے باوجود انہیں تاویل کے بغیر حقیقی اطلاق جائز نظر نہیں آیا۔

ثالثاً خاصہ ثابت کرنے کے لیے نص قطعی الدلالۃ قطعی الثبوت بالفاظ حصر حقیقی ضروری ہے تاکہ صفاتِ ذاتیہ الٰھیہ سے ہو جائے اور یہ عنقا ہے۔ سند منع کے طور پر مسئلہ

۱۔(خیالی۔ص 72)

۲۔(شرح عقائد نسفی۔ص 31)

۳۔(بزازیہ۔ج 3 ص 317)

التحیات اور حدیثِ قبر اور حدیثِ حوض اور آیات قرآنیہ اس پر دال اور شاہد عادل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ وقولہ تعالیٰ: اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا۔[1] قال مجاهد قال جعلت الارض لملك الموت مثل الطست يتناول من حيث شاء ومعالم التنزيل ص ١١٧، وجاء فى الاخبار ان اللّٰه تعالىٰ جعل الدنيا بين يدى ملك الموت كالمائده الصغيرة فيقبض من ههنا ومن ههنا فاذا كثرت الارواح يدعو الارواح فتجيب له ۔ جمل ج ٢ ص ٤٠؛ قال الكر خى والدنيا بين ركبتى ملك الموت جميع الخلائق بين عينيه ويداه يبلغان المشرق و المغرب هكذا فى التفسير الطبرى ج ٧ ص ١٢٩؛ و جمع الروايات الكثيرة موافقة لهٰذا المعنى صاحب الصاوى رحمته اللّٰه تعالىٰ روى ان الدنيا لملك الموت جعلت مثل راحة اليد فياخذ منها من شاء اخذه من غير مشقة فهو يقبض الارواح الخلق من مشارقها و مغاربها وفى روايته ما من اهلِ بيت الاو ملك الموت يطوف بهم فى كل يوم مرتين الخ

سوال: بروایت امام نووی شارح مسلم ج ٢ ص ٣٤٢ اسماء الٰھیہ ننانوے (٩٩) میں بند نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ حاضر ناظر اسمائے الٰھیہ میں مذکور نہیں، قابلِ توجہ نہیں۔

جواب: بلا شک اسمائے الٰھیہ ننانوے میں بند نہیں ہیں لیکن کیا ان غیر معروف اسماء کا اطلاق بھی جائز ہے؟

اگر جائز ہے تو پھر علمائے عقائد کا ننانوے اسماء کو توقیفی کہنا اور غیر توقیفی اسماء کا اطلاق ناجائز کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا الفاظ مشتقہ میں سے بذریعہ اشتقاق اطلاق اسماء جائز ہے

---

[1]۔(خازن۔ص 117 سورۃ انعام)

یعنی مُخرِب مُبَدِّل مُنْقَلِبْ وغیرہ؟ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللهِ۔

سوال: حاضر ناظر شہید اور بصیر کا معنی ہے جیسا کہ خدا، مالک اور رب کا معنی ہے۔

جواب: دیکھو نبر اس، خدا کا اطلاق معنی کی وجہ سے نہیں، بلکہ توارث اور شہرت کی وجہ سے ہے۔

سوال: شہرت تو ان اسماء کو بھی ہے، ہر گواہ کو کہا جاتا ہے کہ "خداوند کو حاضر ناظر جان کر سچ سچ کہو"

جواب: یہ شہرت بذریعہ اطلاق اسماء الٰہیہ نہیں ہے بلکہ بذریعہ مفہوم ہے، اس کا قطعاً مطلب یہ نہیں ہوتا کہ حاضر ناظر خدا کے نام ہیں بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسا خیال کرو کہ خدا تعالیٰ کے روبرو ہو یا خداوند کریم تمہیں دیکھ رہے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ تم نماز اس طرح پڑھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں (الحدیث)۔ بالفرض والمحال تسلیم کر لیا جائے کہ یہ اطلاق بطور اسم جائز ہے (یعنی مرادف شہید سمجھ کر) جیسا کہ شہید بمعنیٰ حاضر بروایت مشکوٰۃ شریف اور صراح میں موجود ہے تو پھر جس طرح سمیع، بصیر، موجود، علیم، رؤف، رحیم، اسماء مشترکہ میں سمع و بصر میں وہی مراد لی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے شان کے مناسب ہوتی ہے[1] اسی طرح یہاں بھی وہ حضور مراد ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے شانِ رفیع کے مناسب ہوگا اور حضور حضور میں کوسوں کا فرق ہے۔ کما سیاتی۔

سوال: ناظر بمعنی رائی بالعین قرآن وحدیث میں کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے۔ وإن الله نظر إلى اهل الارض۔[2]

۱۔(مشکوٰۃ شریف۔ ج1 ص196 / صراح۔ص134)

۲۔(مشکوٰۃ شریف۔ ص460)

قرآن کریم میں ہے: **ثمّ جعلنکم خلٰئف فی الْارض منۢ بَعدھم لننظر کیف تعملون** (یونس: ۱۴) اسی طرح حدیث شریف میں ہے: **لا تدْعون اصمّ ولا غائبا**...... معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، آپ کس طرح کہتے ہیں کہ مفہوماً ان کا اطلاق ناجائز ہے؟

جواب: ولا غائب کا معنی ای غائب عنکم ہے، یعنی یعلمکم اور یہی معنی آیات نظر کا ہے۔ چونکہ رویت اور نظر دونوں دو قسم ہیں، علمی اور بصری، جسمانی اور علمی۔ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ ان آیات و احادیث میں نظر بمعنی ناظر بہذا العین ہے جو ان کا مشہور اور متعارف معنی ہیں اور حاضر بہذا الجسم ہے جو ممنوع اور زیرِ بحث۔ **لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ** مابعد مکتوب حضرت مجددؒ اور مکتبوب میں ہے، ہم ایمان لائے ہیں کہ حق تعالیٰ اشیاء کو محیط ہے، ان کے قریب اور ساتھ۔[1]

تنبیہ: بعض جہال خلط مبحث کے طور پر مسئلہ حاظر ناظر اور مسئلہ علم غیب رسول اللہ ﷺ میں فرق نہیں کرتے اور دونوں کو ایک مسئلہ سمجھ کر نفی علم کے دلائل پیش کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ مسئلے ہیں۔

بنا بریں ایک صاحب نے کتاب تو لکھی مسئلہ حاضر ناظر کے رد میں اور دلائل نفی علم غیب کے بیان کرنے شروع کر دیے۔ ملاحظہ فرمایئے

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتوں کا علم نہ ہوا اور بچھڑا بھون کر لے آئے۔

(۲) اور مکہ شریف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی خبر گیری کے لیے آتے جاتے رہے

(۳) اگر حاضر ناظر کا اعتقاد رکھا جائے تو آنحضرت ﷺ کی ہجرت اور جہاد معراج شریف وغیرہ یہ سب ضائع ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے قرب اور احاطہ اور معیت

۱۔ (حضرت مجدد۔ ص 503 / مکتوب 366)

کی حقیقت کونہیں جانتے کہ کس طرح ہے اس کو احاطہ اور قرب علمی کہنا بھی متشابہ تاویلوں سے ہے لیکن ہم ان کی تاویلوں کے قائل نہیں ہیں۔ اھ ک...... حضرت یعقوب علیہ السلام کیوں فراق میں روتے رہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیوں فرمایا: **مَالِیَ لَا اَرَی الْهُدْهُدَ** ... اگر حاضر ناظر ہوتے تو ایسا کیوں فرماتے؟...... سبحان اللہ ناطقہ سر بر گریباں ہے۔اسے کیا کہیے

جواب:

ان بوجھ بجھکڑ قسم کے علامہ صاحب سے ذرا دریافت فرمایئے، پھر اللہ تعالیٰ پچھلی رات آسمان دنیا پر کیوں اُتر آتے ہیں، فرمایا: **ینزل الی السماء الدنیا** (الحدیث)...... آپ کے زعمِ باطل میں پھر خدائی بھی رخصت ہو جاتی ہوگی۔ حدیث شریف مشکوٰۃ کتاب المناقب میں ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں پڑے ''**یارب امی**'' فرمارہے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا مقصد جانتے ہیں لیکن پوچھتے ہیں کہ آپ کیا مانگتے ہیں؟ الخ...... ملاحظہ فرمایئے اللہ تعالیٰ کا دریافت فرمانا بھی عدم علم کی بنا پر ہوگا العیاذ باللہ...... حضور روحانی اور فضائی مثال کے لیے سفر اور جہاد مضر نہیں، عقل سے کام لیجئے اور اس شدید زکام کی دوا کیجئے۔

جواب ۲:

طبعی محبت اور انسانی جذباتِ انسیت اپنے محبوب کو ان آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کبھی کسی بیوہ کے لڑکے کو چند میل کے فاصلہ پر کسی اسکول میں داخل کرا دو اور پھر روزانہ اسے خط یا تار کے ذریعہ صحت اور تندرستی کی خبر بھی دیتے رہو، کیا یہ علم اس کی تسلی کر دے گا؟ اس کے دل میں دیکھنے کی تڑپ پیدا نہ ہوگی؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے سینے کے اندر ایک انسانی دل نہیں رکھتے یا عداوت الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے آپ کے تاریک

قلوب جذباتِ محبت وشفقت سے محروم ہو چکے ہیں۔ کیا آپ نے سورہ یوسف کی ابتدا میں **وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ... اور وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** ...... یہ آیات نہیں پڑھیں؟ جب آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ نعمت کا علم تھا اور دونوں کے بخیریت واپس آنے کا بھی تو پھر آپ کا تاسف یقیناً طبعی مجبوری اور ظاہری فراق کی وجہ سے تھا نہ کہ بے خبری کی وجہ سے......

جواب ۳:

ہماری گفتگو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے میں ہو رہی ہے اور اب بیچ میں ہر ولی اور ہر نبی کو زبردستی لا رہے ہیں، میرے کرم فرماؤ! یہ تنکوں کا سہارا چھوڑ دو۔ تنکوں نے کبھی غرق ہونے والے کو نہیں بچایا۔ اگر حضرت سلیمانؑ کا **مَالِيَ لَا اَرَى الْهُدْهُدَ** فرمانا باعث عدم حضور ہے تو پھر اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کا فرمان **لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا** کے متعلق اپ کیا رائے قائم کریں گے؟

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر حاضر وناظر ہیں اور شاہد وشہید کا معنی حاضر ناظر ہے تو پھر وَمَاكُنْتَ لَدَيْهِمْ اور اس قسم کی دیگر آیات اس حضور کی نفی کر رہے ہیں۔ اگر یہ معنی ہے کہ آپ ہر انسان کے باطن اور حال سے واقف ہیں تو پھر مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ - لَا تَعْلَمُهُمْ - نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ میں کیوں علم کی نفی فرمائی گئی ہے؟

جواب: آیت **وَمَاكُنْتَ لَدَيْهِم** میں ظاہری اسبابِ علم کی نفی کی گئی ہے یعنی آپ کو ان حالات کا علم عطا کیا گیا ہے اور حصولِ علم کا ذریعہ وہاں موجود ہونا بھی ہوتا ہے حالانکہ آپ ہزارہا سال بعد تشریف لائے ہیں۔ تفسیر صاوی میں ہے۔ **وھذا بادی النظر الی**

العالم الجسمانی لاقامة الحجة علی الخصم واما بالنظر الی العالم الروحانی فهو حاضر رسالة کل رسول وما واقع له من لدن آدم الی ان ظهر جسمه الشریف ولکن لا یخاطب به اهل العناد وله درۂ۔[1]

حاضر ناظر ہونے کا تعلق تو امت وسط یا امت دعوت کے ساتھ ہے۔ بعثت شریف سے اممِ سابقہ کے ساتھ نہیں۔ ورنہ اکثر آیات کے اول میں ''واذکر'' کا لفظ ہر واقعہ کے وقت موجودگی پر دلالت کر رہا ہے۔ کیا خیال ہے جناب کا؟ ثانیاً **وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ** کے ساتھ تمام منافقینِ مدینہ کا علم اور پہچان بیان فرما دی گئی ہے۔ جس کو آپ کی آنکھ ہرگز نہیں دیکھ سکتی۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و فضائل کا اخفا یہود و نصاریٰ کی طرح آپ کو نہایت ہی مرغوب ہے اور فضائل کے باب میں تو اگر دلائل نہ بھی ہوں پھر بھی چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔

سوال: شہادت کے معنی گواہ بھی ہیں اور گواہی سننے سے بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہو رہا ہے۔

جواب: لیکن آپ اپنی امت کا حال کس سے سن کر گواہی دیں گے؟ کاش ان کھوپڑیوں میں مغز ہوتا اور اس مغز میں سوچنے کی طاقت ہوتی۔ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا**

تمام سابقہ طویل بحث کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ قرآن کریم میں شہیدؔ شاہدؔ رقیبؔ کا اطلاق اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امت وسط پر آیا ہے۔ لہٰذا معنی ایک ہی ہوگا لیکن اشخاص اور مراتب کا فرق کرنا لازم ہوگا۔

ع گر فرق مراتب نکنی زندیقی

---

[1] (تفسیر صاوی۔ ج4 ص153)

منکرین نے حدیث "ماتقول فی حق ہذا الرجل" پر سینکڑوں حوالہ جات اس چیز کے ثابت کرنے کیلئے نقل کر دیے ہیں کہ ھذا حاضر فی الذہن پر اطلاق ہوسکتا ہے۔ بالکل بجا، درست، لیکن "ھذا" موضوع ہے محسوس مبصر کے لیے اور حاضر فی الذہن کے لیے استعمال کرنے کیلئے قرینہ ضروری ہے۔ جیسا کہ ان سب پیش کردہ عبارتوں سے صاف طور پر ظاہر ہورہا ہے۔ معنی موضوع لہ سے انحراف صرف آپ کے زعمِ باطل کے لیے تو نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ اور تو کوئی قرینہ عبارت میں موجود نہیں۔ ثانیاً مومن کے لیے تو ممکن تھا کہ حاضر فی الذہن کے متعلق استفسار کیا جاتا لیکن کفار سے بھی یہی سوال ہوتا ہے۔ کفار کے ذہن میں آپ کس طرح حاضر ہوتے ہیں؟ حالانکہ ہزاروں لاکھوں کفار ابھی غیر آباد اور غیر متمدن علاقوں میں، افریقہ کے جنگلوں میں بت پرست حبشی دور افتادہ جزائر میں وحشی انسان موجود ہیں جو اسلام کے نام سے بھی نا آشنا ہیں۔ ان سے حاضر فی الذہن کے طور پر کس طرح سوال کیا جاسکتا ہے؟ باقی رہا شبیہ کا معاملہ وہ اس لیے غلط ہے کہ وہ شبیہ آپ کی نہیں ہوگی یا غیر اگر نہیں ہے تو پھر وہی محسوس البصر والا پھندا آپ کے گلے میں پڑ جائے گا۔ اگر غیر ہے تو پھر اس شخص کو عذاب کیوں شروع ہوجاتا ہے؟ اس نے آنحضرت ﷺ کا انکار تو نہیں کیا، شبیہ کا انکار کیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ احادیث جن میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے تم نے فلاں عورت یا فلاں صحابی کی وفات کی اطلاع کیوں نہیں دی اور اس سے یہ ثابت کرنا کہ اگر آپ ہر جگہ حاضر ہیں تو پھر جنازہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اولاً تو یہ سوال احکامِ شرعی کی حقیقت سے بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ خود بنفسِ نفیس ان اعمال کی تعلیم و تلقین فرماتے تھے اور آپ کے حضور روحانی یا علمی سے عوام قطعاً واقف نہیں ہوسکتے تھے۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ** فرمایا:

تم ان کے حق میں دعا فرمایا کرو، ان کے دل اس سے مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس قبر کا حضور تو ہر مومن و کافر کے لیے آنی اور امتحانی ہوتا ہے۔ دعاؤں اور نمازوں کے لیے نہیں۔ فرمایا: **مَادمت بین اظهركم الا آذنمتونی** جب میں تمہاری پیٹھ پیچھے موجود ہوں مجھے ضرور اطلاع دیا کرو۔

یہ سب لے دے تو منکرین کے ان سنگین دلائل پر عرض کی گئی ہے جو انہوں نے ایک کتابچہ میں پیش کر کے اپنے خیال میں سد سکندری کھڑی کر دی تھی۔ نہایت مختصر طور پر یہ بھی عرض کر دینا لازم ہے کہ ہم حاضر ناظر کا کیا معنی لیتے ہیں۔ اس کی بالتفصیل وضاحت سے قبل میرے حضرت قبلہ و کعبہ شیخ الشیوخ پیر مہر علی شاہ قدس اللہ سرہٗ کا ایک مختصر خط نقل کر دینا انسب معلوم ہوتا ہے۔ بفحوائے کلام الملوک ملوک الکلام، ذرا تعصب سے دور ہو کر غور کیجئے اور داد دیجئے۔

فرماتے ہیں: ''رہا'' آنحضرت ﷺ کا **بجسدہٖ العنصری** ہر زمان و مکان میں حاضر و ناظر ہونا تو یہ امر مختلف فیہ ہے، **فقائل و منکر ولکل وجهة** میرے خیال میں ظہور حقیقت احمدیہ ﷺ ہر عالم اور ہر مرتبہ اور ہر ذرہ میں عند المحققین من الصوفیہ ثابت ہے جسے وہ حقیقت الحقائق کہتے اور لکھتے رہے۔ **فهو نوره** ﷺ۔ اولاً جو بصورت قلب تقی نقی اور جسد شریف عنصری ظاہر ہوا۔ ثانیاً ظہور بصورۃ مثالیہ شریفہ علی صاحبہا الصلوٰۃ ہر زمان و ہر مکان میں احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے جس کا اقرار واقعی آنحضرت ﷺ کا اقرار اور اس کا انکار آپ کا انکار مانا گیا۔ کما فی حدیث البخاری کتاب الایمان، اہلِ تجربہ کو ظہور کذائی مثالی کا کراتاً مراتاً اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ البتہ ثالثاً **ظهور بجسده العنصری الحقیقی** کا پتہ بعض اہلِ مشاہدہ کے ہاں ملتا ہے اور بلحاظ واقعہءِ معراج شریف و خصائص ولوازم مختصہ جسم شریف علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے مستبعد بھی نہیں۔ اھ ک ...... **الملتجی**

والمشتکی الی اللّٰہ المدعو بمہر علی شاہ عفی اللّٰہ عنہ۔[1]

از گولڑہ شریف ۸ شعبان ۱۳۴۱ھ

کہنے کو تو یہ چند سطریں ہیں لیکن مسئلہ زیرِ بحث کے ابواب وفصول آغاز وانجام کے دریائی ناپیدا کنار کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضور وظہور کئی قسم ہے۔ اولاً حضور حقیقت محمدیہ جسے شیخ عبدالحق دہلویؒ نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا ہے، **مسک الختام شرح بلوغ المرام ۲۴۴**: ''نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ نصب العین مومناں وقرۃ العیون عابداں است در جمیع احوال واوقات خصوصاً در حالت عبادات کہ نورانیت وانکشاف دریں محل بیشتر وقوی تر است وبعضے از عرفا گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است علیہ الصلوٰۃ والسلام در ذرائر موجودات و افراد ممکنات پس آنحضرت در ذوات موجود وحاضر است۔ پس مصلی بدید کہ رزین معنی آگاہ باشد وازین شہود وغافل نباشد۔'' اسی مسئلہ کہ شرح مشکوٰۃ میں اس طرح ذکر فریایا ہے، ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنور نبوت در ذوات مصلیاں ساریست۔''

''السلام علیک'' کا کاف خطاب باتفاق جمیع نحاۃ بلا تاویل حاضر کے لیے نص ہے۔ ہاں اس حضور کے مشاہدہ کے لیے منکرین کی آنکھ بالکل بے بصر اور بے نور ہے اور نور کو نور میں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ دیکھ سکنا، یہ ہماری آنکھ کا قصور ہے، نہ نور حضور پرنور کے جمال جہاں تاب کا۔ یہ اس خطاب کا انشاء مسلمانوں پر لازم ہے نہ کہ حکایت کے طور پر جیسا کہ درالمختار میں ہے : **ویقصد بالفاظ التشهد معانیها مرادة له علی وجه الانشاء لا الاخبار عن ذلک۔ ذکره فی المجتبیٰ۔**[2]

---

[1]۔ (فتاویٰ مہریہ۔ ص 6)

[2]۔ (درالمختار۔ ص 77۔ باب صفۃ الصلوٰۃ)

مواہب لدنیہ میں ہے: **ولا ریب ان حاله ﷺ فی البرزخ افضل و اکمل من حال الملائکة هذا وسیدنا عزرائیل علیه السلام یقبض مائة الف روح فی آن واحد ولا یشغله قبض عن قبض وهو مع ذلک مشغول لعبادة الله تعالی مقبل علی التسبیح و التقدیس** اھ......[1]

اس سے حضور صورۃ مثالیہ برزخیہ مراد ہے اور یہ حضور حوض میں مذکور ہے۔ فرمایا: **كَاَنِّمَا اَنْظُرُ اِلٰی كَفِّیْ هٰذِهٖ**...... یہ جملہ اسمیہ ہے۔ معدولہ عن الجملۃ الفعلیۃ، جو نص ہے دوام پر کیونکہ سیاق حدیث چاہتا تھا کہ "**فنظرت الیها**" فرماتے، بجائے اس کے "**انا انظر الیها**" فرمایا۔ بعض جہال کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہتھیلی کے باریک خطوط نظر نہیں آتے، تو اسی طرح آنحضرت ﷺ کو بھی تمام اشخاص نظر نہ آتے ہوں گے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سب بیماریوں کی جڑ یہی شیطانی وسوسہ ہے۔ "**ان انتم بشر مثلنا**" آنحضرت ﷺ کی نظرِ رحمت کو اپنی بے نور نظر پر قیاس کرنا کفر صریح ہے۔

یہ چند باتیں یکے از ہزار اور مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ دیدۂ وبینا اور قلب آشنا کے لیے ایک دلیل ہی کافی ہے اور بے انصاف کیلئے دلائل کے انبار بھی ناکافی ہیں۔ **وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ**

سوال ۷۹

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ مسماۃ غلام عائشہ کا نکاح والد نے نابالغی کی حالت میں سوء خیار کے طور پر عداوت ختم کرنے کیلئے دشمنوں کو کر دیا تھا۔ مسماۃ مذکورہ نے بالغ

---

[1] (مواہب لدنیہ۔ جلد 2 صفحہ 389)

ہوتے ہی شرعی طریقہ پر فوراً انکار کیا اور عدالتِ قانونی سے تنسیخ کا فیصلہ بھی حاصل کرلیا۔ اب وہ دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے یا نہیں؟ مسماۃ مذکورہ کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ بینوا رحمکم اللہ تعالی۔ (سائل از موچھ)

جواب

۱: صورتِ مسئولہ مذکورہ فی الکاغذات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسماۃ عائشہ اس معاملہ میں سخت مظلوم ہے۔ ایسی نابالغ لڑکیوں کے نکاح جو ان کے والدین بلا سوچے سمجھے صرف اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر پڑھا دیتے ہیں، اور ان کی بنا شفقت پر ہرگز نہیں ہوتی۔ ماں باپ کی ولایت نظری ہے اور عدم نظر کا تحقق جہاں بھی ہوجائے، وہاں اس نابالغہ لڑکی کو بطور خیار بلوغ فسخ نکاح کا شرعاً اختیار ہوتا ہے جو کتبِ فقہ حنفیہ میں مصرح ہے۔

۲: حسبِ ارشاد فقہا ایسے نکاحوں کا فسخ جو خیارِ بلوغ کے حق کو استعمال کرتے ہوئے کیا جائے، اس کے لیے قضا لازم ہے اور فی زماننا قضا اور قاضی دونوں معدوم ہیں اور بصورت عدم قضا تحکیم بھی ناممکن ہے کیونکہ ایسی صورتوں میں جس فریق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، وہ کسی تحکیمِ شرعی پر راضی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسی صورتوں میں عدالتِ قانونی ہی یہ طاقت رکھتی ہے کہ وہ فریقین کو جبراً بلا کر فریقین کے بیانات سن کر عدل و انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے تنسیخ یا عدم تنسیخ کا فیصلہ کرے اور اس کے فیصلہ کو شرعاً قضا کا درجہ دیا جائے گا۔

۳۔ آج کل حکومت مسلمانوں کی ہے اور حاکم بھی مسلمان ہیں، لہٰذا مطلقاً یہ وہم ہے کہ وہ غیر متشرع اور حاکم بے انصاف ہوتے ہیں، بالکل بے انصافی پر مبنی ہے۔ آج کتنے عالمِ دین ہیں جو شریعتِ اسلامیہ پر کماحقہٗ عمل کرتے ہیں؟ لہٰذا جب تک

عدالت قانونی صراحتاً اصولِ شرع محمدیہ کے خلاف فیصلہ صادر نہ کرے، اس کے فیصلہ کو قضا تصور کیا جائے گا۔ اس کے سوا مظلوم کی دادرسی کا کوئی چارہ نہیں ہے۔

۴۔ مندرجہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسماۃ غلام عائشہ نے خیارِ بلوغ کے طور پر بچپن کے جس نکاح کا انکار کیا ہے، وہ شرعاً درست کیا ہے۔ مزید براں عدالت قانونی کے مسلمان جج نے ازروئے تحقیق وتفتیش جو تنسیخ کا فیصلہ کیا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ اس میں کسی اصول شرعی کی مخالفت موجود نہیں۔

۵۔ ان حالات پر غور کرنے سے یہی حق نظر آتا ہے کہ مسماۃ غلام عائشہ کا نکاح شرعاً فسخ ہو چکا ہے، اسے دوسرا نکاح کر لینے کی شرعاً اجازت ہے۔ بوجہ غیر مدخولہ (غیر شادی شدہ) ہونے کے کوئی عدت وغیرہ لازم نہ ہوگی۔

سوال ۸۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ شہادتِ شرعیہ کے ساتھ ایک خالی میدان (صحرا) میں ایک بیوہ عورت کے ساتھ نکاح پڑھا گیا، گواہ چلے گئے، خاوند بیوی کچھ دیر تک تنہا رہے، پھر مرد گواہوں سے جاملا اور اس نے ایک گواہ کے دریافت کرنے پر بتلایا کہ میں نے وطی کی ہے۔ پھر اس شخص سے عورت کے ورثا نے زبردستی طلاق لے لی اور غیر مدخولہ سمجھ کر اس عورت کا زبردستی دوسری جگہ نکاح کر دیا۔ چند دنوں کے بعد عورت پھر بھاگ کر اس پہلے شخص کے پاس چلی گئی اور اب بھی اس کے پاس ہے۔ اس نے حیلہء تحلیل کے بعد اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کر لیا ہے۔ کیا اس خلوت سابقہ سے عدت لازم ہوتی تھی یا نہیں؟

خلوت صحیحہ ہو یا غیر صحیحہ، دونوں صورتوں میں طلاق کی عدت لازم ہوگی یا نہیں؟

مرد عورت اس خلوت میں وطی کا اقرار کرتے ہیں، یہ اقرار صحیح سمجھا جائے گا یا شہادت

لازم ہے؟ (سائل از آہیرانوالہ)

جواب

جیسے دوسرے کی منکوحہ سے نکاح نہیں ہوتا، عدت عام ہے، نکاح کی ہو یا وفات کی، اس کی موجودگی میں بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **لایجوز للرجل ان یتزوج زوجة غیر وکذلک المعتدة** اھ ......ترجمہ: کسی مرد کو دوسرے کی منکوحہ یا دوسرے کی معتدہ سے نکاح کرنا جائز نہیں۔[1]

خلوتِ صحیحہ کے بعد بھی عدت لازم ہوتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ **رجل تزوج امرءة نکاحا جائز افطلقها بعد الدخول او بعد الخلوة الصحیحة کان علیها العدة،**

ترجمہ: ایک مرد نے ایک عورت سے جائز طریقہ سے نکاح کیا پھر بعد دخول یا بعد خلوت صحیحہ کے اس کو طلاق دی تو عورت پر عدت واجب ہوگی۔[2]

مرد جب کہتا ہے کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ شیبہ کے ساتھ نکاح نہ کروں گا اور میں نے شادی کے بعد اپنی بیوی سے دخول کیا ہے لیکن مجھے اس کے شیبہ ہونے کا علم نہیں تو فرمایا: **یقع الطلاق باقراره** ......

اگر میدان یا طریقِ عامہ یا مسجد میں تنہا ہونے کا اقرار کریں تو خلوتِ صحیحہ کا تحقق نہیں ہوگا۔[3]

---

[1]۔(فتاوی عالمگیری۔ج 1 ص 309،)

[2]۔(فتاویٰ عالمگیری۔ج 1 ص 552)

[3]۔(درالمختار۔ باب المہر)

سوال ۸۱

ایک شخص سکنہ جھمٹاں والا داخلی ہرنولی بلفظ اشہد بیان کرتا ہے کہ میں نے ایک سودا اونٹ کا کیا ہے اور میری عورت نے جھگڑا شروع کیا ہے۔ میں نے کہا ایک دو تین زن طلاق زن طلاق ہے، تیسری دفعہ کہنے سے پہلے ایک آدمی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور حلفاً بیان کیا کہ ایک دو تین سے میری مراد طلاق نہیں تھی بلکہ سودے تھے جو جب بھی میں کرتا تھا، یہ عورت اسی طرح مجھے بدمزہ کرتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ تیسرا سودا ہے اور تم میرے ساتھ اسی طرح جھگڑا کرتی ہو لیکن تیزی کی وجہ سے وہ بات مکمل نہیں کر سکا اور طلاق کہنے لگ گیا۔ بینوا و توجروا (سائل از ہرنولی)

جواب

وہ الفاظ جو عدد پر دال ہیں اور مخفی المراد ہیں اور ان کے بیان میں حالف کی نیت معتبر ہے جو اس نے حلفاً اوپر بیان کر دیے۔ لہٰذا بفحوائے قولہ تعالیٰ **الطلاق مرتان فامساک بالمعروف**، رجوع لازم ہے، احتیاطاً تجدیدِ نکاح کر لیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۸۲

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک شخص نے کہا کہ اگر میں اس (عورت) کو وساواں (یعنی آباد کروں) تو مجھ پر طلاق ہے اور یہی الفاظ تین دفعہ دہرائے۔ دو سال سے میں گھر نہیں گیا اور پھر تھوڑے عرصہ سے میری بیوی خود بخود والدین کی مرضی کے خلاف بچوں میں واپس آ گئی لیکن میں نہ گھر گیا ہوں اور نہ کچھ دیا لیا ہے۔ میرا بھائی اس کی خبر گیری کرتا ہے۔ حکم شرعی سے مطلع فرماویں۔ (سائل از کندیاں)

جواب

''وساون'' ہماری عرف میں نان ونفقہ اور دیگر حقوقِ زوجیت کو پورا کرنے پر صادق آتا ہے اور عدم قربان کی حلف متضمن ہے۔ لہٰذا ایلاء موبد ہونے کی وجہ سے چار ماہ کے بعد وہ خود بخود بائن ہو چکی ہے۔ لہٰذا اُسے گھر لا کر اپنے ہاتھ سے تمام خرچ وغیرہ اور دیگر ضروریات پورا کرے لیکن وطی نہ کرے کیونکہ وہ اجنبیہ ہو چکی ہے لہٰذا معلق طلاق واقع ہو گی کیونکہ ملک ختم ہو جائے تو بھی **یمین معلق بالفعل** اس فعل کے واقعہ ہونے پر منحل ہو گی۔ اور جب یمین منحل ہوئی ہے، وہ محل طلاق نہیں رہی کیونکہ اس سے پہلے مدت ایلاء گزرنے سے بائن ہو چکی ہے۔ اس کی عدت بھی گزر چکی ہے، لہٰذا بعد میں تجدیدِ نکاح کرے۔ واللہ اعلم بالصواب (۲۱ ستمبر ۱۹۶۰ء)

سوال ۸۳

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی، اسکی بہن، یعنی مرضعہ کی جو اڑھائی سال سے کچھ زائد عمر کی تھی اور اس کا دودھ چھٹا ہوا تھا، نے آ کر بڑی بہن کا دودھ پینا شروع کر دیا۔ مسماۃ مذکورہ نے اسے فوراً علیحدہ کر دیا لیکن اس نے چند گھونٹ پی لیے۔ اب اسی دودھ پینے والی بہن کی لڑکی سے اور مرضعہ کا ایک دوسرا لڑکا ہے، ان کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از لیہ، ۲۳ اپریل ۱۹۸۰ء)

جواب

در المختار میں ہے: **ویثبت فی المدۃ فقط ولو بعد الفطام والاستغناء**

بالطعام وهی ظاهر الروایت وعلیه الفتویٰ فتح ......

ترجمہ: صرف مدت رضاع میں حرمت ثابت ہوتی ہے اگر چہ وہ دودھ چھوڑانے کے بعد ہو اور کھانے کے ساتھ استغنائی وجہ سے ہو۔[1]

معلوم ہوا کہ اڑھائی سال کی مدت کے اندر اگر لڑکی نے دودھ پیا ہے تو حرمت ثابت ہوگی، خواہ اس کا دودھ چھٹا ہوا ہے یا صرف طعام پر ہی اکتفاء کرتی ہے۔ اگر اڑھائی سال سے زائد کی ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ **واللّٰہ تعالی اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب**

سوال ۸۴

مسماۃ زینب دختر لعل قوم بھچر کا نکاح باپ نے صغرسنی میں جس وقت چھ ماہ کی ماں کی گود میں تھی، مسمی سید احمد میکن کو کر دیا۔ لعل مذکور سخت جوا باز تھا اور اس نے سید احمد کا دو صد روپیہ اسی سلسلے کا دینا تھا جو اس کا ساتھ تھا سید احمد نے اسے مجبور کیا کہ یا مجھے رقم دے دو یا لڑکی کا نکاح کر دو۔ رقم اس کے پاس نہیں تھی، اس نے لڑکی کا نکاح کر کے دے دیا۔ باپ اور بھائی نے اسے سخت منع کیا، اس نے کہا کہ تم رقم ادا کر دو۔ ان کے پاس رقم تھی نہیں یا ناراضی کی وجہ سے انہوں نے انکار کر دیا۔ لڑکی نے بالغہ ہونے پر عدالتِ قانونی سے نکاح فسخ کی ڈگری حاصل کر لی کیونکہ سید احمد مذکور کی عمر نکاح کے وقت پینتیس سال سے اوپر تھی، اس وقت وہ ساٹھ سال سے اوپر ہے اور کئی بچوں کا باپ ہے۔ عدالت نے اس غیر موزونیت کو مدنظر رکھتے ہوئے نکاح فسخ کر دیا اور مدعی علیہ کسی حکمِ شرعی کے حاضر نہیں ہوتا

---

[1]۔ (درمختار۔ باب الرضاع)

اورلڑکی نوجوان ہے۔وہ اس عقد پرراضی نہیں تھی۔اب کیا کیا جائے؟ بینوا وتوجروا رحمکم اللہ تعالی۔

(سائل از پکہ کراڑ متصل واں بھچر اں، ۳ مئی ۱۹۸۰ء)

جواب

شرعاً ایسا باپ جو ماجن ہو، یعنی بے پرواہ اور نفع ونقصان کو نہ سمجھنے والا اور کسی لالچ اور طمع کی بنا پر نابالغہ لڑکی کا نکاح ایسے شخص کے ساتھ پڑھا دے جو قطعاً غیر موزوں یعنی فاسق مدمن الشراب یا غیر کفو، معمر وغیرہ ہوتو وہ نکاح شرعاً ابتدا ہی سے لازم ہی نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ اسے عدالتِ قانونیہ سے کسی شرعی وجہ کے ماتحت تنسیخ کی ڈگری حاصل ہو چکی ہوتو اسے اندریں حالات دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت ہے۔علامہ شامی علی ھامش البحر میں ہے: **و فی شرح المجمع لابن الملک حتی لو عرف من الاب سوء الاختیار السفهه و طمعه لایجوز عقده اتفاقاً**......

ترجمہ: اگر باپ سے بداختیاری اس کی بیوقوفی اور لالچ کی وجہ سے مشہور ہوتو اس کا عقد بلا تفاق جائز نہیں ہے۔[1]

اور اسی صفحہ پر صاحبِ بحر نے تحریر فرمایا ہے:

لو کان معروفا بذلک فسقا ومجانة فالعقد باطل علی الصحیح وهکذا فی الفتح والدرالمختار والهندیه

ترجمہ: اگر وہ فسق اور مجانت میں مشہور ہوتو اس کا عقد صحیح قول پر باطل ہے۔[2]

اور بحر میں ہے: **نعم اذا کان متهتکا لاینفد تزویجه ایاها، وکذا فی الفتح**

۱۔(البحر۔ج 3 ص 135)

۲۔(البحر۔ج 3 ص 135، فصل فی الاکفاء)

ترجمہ: ہاں جس وقت وہ متھتک (ھتک کرنے والا) تو اس کا نکاح کر دینا جائز نہیں

عام کتبِ فقہ میں معروف بالیقین کی جو قید ہے، اس کا مقصد بھی تحقق سفہہ سے ہے کیونکہ شفقت مظنونہ ابویہ کا عدم اسی نکاح سے معلوم ہو جاتا ہے اور نابالغہ کے نکاح کی اجازت باپ اور دادے کی صرف اس شفقت مظنونہ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

هُو الحقُّ والحقُّ أحَقُّ أنْ يُتَّبَعَ۔ والسلام (۳ مئی ۱۹۸۰ء)

سوال ۸۵

میرے ایک دوست کو کسی بے دین نے کوئی پمفلٹ پکڑا دیا ہے جس میں عذابِ قبر سے بالکل انکار کیا گیا ہے جس سے اس اچھے بھلے سمجھ دار آدمی کا ایمان ڈانواں ڈول ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی عالمِ دین سے یہ مسئلہ مدلل طور پر تحریر کروا دو۔ لہٰذا عرض ہے کہ اس مسئلہ پر کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے گراں قدر خیالات سے ضرور مستفید فرماویں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ انہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت نصیب فرما دے۔

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

جواب

نَحْمَدُهُ وَ نُصَلِّي عَلٰى رَسُولِهِ الْكَرِيْمِ اَمَّا بَعْدُ عذاب وثوابِ قبر کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جس کی صحت اور حقیقت پر قرآن کریم، حدیث شریف، ائمہ متقدمین اور تمام علماء اہلسنت والجماعت متفق ہیں سوائے معتزلہ اور روافض کے۔ خذلہم اللہ فی الدارین۔ شرح عقائد نسفی جو اہل سنت والجماعت کی متفق علیہ عقائد کی کتاب ہے۔ **وعذاب القبر للكفرين ولبعض عصاة المومنين و خص البعض لان منهم من لا يريد الله تعالىٰ تعذيبهٗ فلا يعذب وينعم اهل الطاعة فى القبر بما يعلمه الله تعالىٰ**

ویریدۂ وسوال منکر ونکیر ثابت بالدلائل السمعیہ......[1]

یعنی کفار اور بعض گناہ گار مومنین کے لیے قبر میں عذاب کا ہونا اور اہلِ طاعت کے لیے قبر میں ثواب کا ملنا اور ان نعمتوں کا وصول جو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور ارادہ فرماتے ہیں اور منکر نکیر کا سوال کرنا یہ سب باتیں حق اور دلائل کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور ان کا منکر اجماع قیاس کتاب اللہ اور دلائل کتاب اللہ وسنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منکر ہے اور ان کا منکر بدمذہب، بدعتی اور بے دین ہے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ اَدۡخِلُوۡا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ**۔ترجمہ: ''آگ پر انہیں صبح وشام پیش کیا جاتا ہے اور قیامت کے دن اس سے بھی زیادہ سخت عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔'' معلوم ہوا کہ کفار کو یہ عذاب قیامت سے پہلے ہوتا رہے گا اور وہ قبر ہی میں ہوسکتا ہے۔دوسری آیۃ میں ہے: **مِّمَّا خَطِیۡٓـٰٔتِهِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا**۔ترجمہ: ''فرعونی دریا میں غرق کیے گئے اور اس کے بعد آگ میں داخل کر دیے گئے۔

فا تعقیب کو چاہتی ہے اور دخولِ نار سے مراد مطلق عذابِ نار ہے، خواہ وہ جہنم کے دیکھنے سے ہو یا اس کی گرمی اور متعفن ہوا کے پہنچنے سے ہو جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے،تفسیر کبیر میں ہے: **فاذا ثبت عذاب القبر وجب القول بثوابها**۔[2]

یعنی جب عذابِ قبر قرآن کریم سے ثابت ہوگیا تو ثوابِ قبر کا اقرار بھی لازم ہوگا۔

جب جرم وگناہ پر سزا ملتی ہے تو نیکی پر ثواب بھی لازم ہے۔یعنی دنیاوی اعمال کا پس منظر خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، عالمِ برزخ میں ہر انسان کو اچھی طرح نظر آجائے گا تاکہ

---

[1]۔(شرح عقائد۔ص72۔بحث عذاب القبر وثوابہ)

[2]۔(تفسیر کبیر۔ج3ص36)

اسے روزِ محشر کی باز پرس کا احساس تلخ ہو یا شیریں، قبر میں پہلے سے ہوتا رہے۔

تیسری آیۃ: **قَالُوا رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ** ۔(سورۃ مومن) میں کہیں گے کہ اے رب تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندگی۔ تفسیر کبیر میں ہے: الموتتان لاتحصل الا عند حصولِ الحیوۃ فی القبر۔ یعنی دو موتیں حیات فی القبر کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتیں۔

چوتھی آیۃ: **وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ** ۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہو گئے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں۔ یقیناً، جیسا کہ دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیوۃ قبر ہی میں حاصل ہوگی، اور یہ زندگی اور راحت خوشی اور مسرت صرف اعتباری اور فرضی وہمی اور خیالی نہیں ہوگی بلکہ حقیقی۔

پانچویں آیۃ شریف سے ظاہر ہے: **وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۔ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ** ۔ ترجمہ: ''انہیں مردہ گمان نہ کرو، وہ تو زندہ ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور انہیں کھانا دیا جاتا ہے۔

اور وہ اللہ تعالیٰ کے انعام پر مسرور ہیں۔

چھٹی آیۃ مبارکہ میں ہے: **وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** ۔

ترجمہ: ''وہ خوش خبری پہنچانا چاہتے ہیں ان لوگوں کو جو ابھی تک ان کے پاس نہیں پہنچے اس بات کی کہ انہیں کوئی خوف نہیں اور وہ کبھی غمگین نہ ہوں گے۔''

مندرجہ بالا شواہد سے صاف ظاہر ہے کہ یہ زندگی ایسی نہیں کہ ظاہری آنکھ سے دیکھی جا سکے یا مادی ادراک وشعور اس کی حقیقت و ماہیت پر مطلع ہو سکے۔ چونکہ محض ظن وگمان کی

بنا پر کسی چیز کی حقیقت کا منکر ہونا اور اس کے عدم پر فتویٰ دینا عقل وخرد کی شریعت میں ناجائز ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ محض گمان اور ظن تو بعض اوقات بالکل گناہ ہوتا ہے: اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ۔ بلکہ انہیں تو وہ ابدی حیات حاصل ہوئی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ؎

تشنگانِ خنجر تسلیم را

ہر زمان از غیب جان دیگر است

علامہ اقبال صاحبؒ فرماتے ہیں: ؎

سر شیری رانفہمد گاؤ ومیش

جز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش

یہ روح اور برزخ کے مسائل مادی حواس سے دیکھے نہیں جا سکتے۔ اگر شیروں کا راز کوئی بھینس کو سمجھانے لگ جائے تو یقیناً وہ نہیں سمجھ سکے گی۔ ؎

چوں شود اندیشہ قومے خراب

ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

میرد اندر سینہ اش قلب سلیم

در نگاہ او کج آید مستقیم

جب کسی قوم کا فکر اور اندیشہ خراب ہو جائے تو اسے خالص چاندی پر ٹھیکریوں کا گمان ہوتا ہے اور سینہ کے اندر جب دل بیمار ہو جائے تو اس کی نظر میں سیدھی چیز بھی ٹیڑھی نظر آنے لگ جاتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے:(۱) **استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه**۔ ترجمہ: پیشاب کے چھینٹوں سے بچو کیونکہ اکثر عذابِ قبر انہی معمولی چیزوں سے ہو

گا۔

(۲) فرمایا حضور علیہ السلام نے: **ان القبر روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النیران** ۔قبر بہشت کا باغ ہے یا دوزخ کا ایک گڑھا ہے۔ الغرض اس مسئلہ میں احادیث بے شمار اور متواترۃ المعنی ہیں اگرچہ ان کے احاد متواتر نہیں۔ اس کا انکار صرف معتزلہ اور رافضیوں نے کیا ہے اور وہ بھی صرف عقل کی بنا پر کہ مردہ پتھر کی طرح ہو جاتا ہے، نہ اس میں زندگی ہوتی ہے، نہ ادراک، اور جب روح نکل جاتی ہے تو پھر عذاب صرف جسم کو ہوگا یا روح کو یہ، یہ سب غلط وہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسم کو کھانے پینے اور دیگر لوازمات کے بغیر بھی زندہ رکھ سکتا ہے اور روح کا اثر جب جسم کے ہزارویں حصے پر بھی پڑ رہا ہو تو راحت اور تکلیف کا احساس ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بعض مرنے والوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ سانس گلے میں اٹکی ہوئی ہوتی ہے، بدن تمام سرد ہوتا ہے اور ہوش و حواس بالکل بجا ہوتے ہیں اور وہ جواب وسوال کر رہا ہوتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے جو وہابیت کے بانیوں میں سے ہیں، نے بھی اپنی کتاب الروح میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عذاب وثوابِ قبر برحق ہے اور عذاب جسم اور روح دونوں کو ہوتا ہے اور روح بالکلیہ جسم میں داخل نہیں ہوتی بلکہ اس کا صرف ایک تعلق ہوتا ہے، جس طرح سونے والے آدمی کا روح کے ساتھ ایک علاقہ قائم ہوتا ہے،

کتاب الروح میں ہے: **فلتعلم ان مذهب سلف الامة وائمتها ان المیت اذا مات یكون فی نعیم او عذاب وان ذلك یحصل لروحه وبدنه وان الروح تبقی بعد مفارقة البدن منعمة او معذبة وانها تتصل بالبدن احیاناً ویحصل معها النعیم او العذاب ثم اذا كان یوم القیامة الكبری اعیدت الاروح الی الاجساد وقاموا من قبورهم لرب العالمین والحمد لله رب العالمین علی ذلك**

واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر۔ ترجمہ: جان تو کہ علماء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قبر میں عذاب وثواب سچ ہے اور یہ روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے روح جسم سے علیحدہ ہو کر باقی رہتی ہے اور عذاب یا ثواب میں پڑی رہتی ہے کبھی جسم سے مل بھی جاتی ہے اور جسم کو اس کے ساتھ عذاب یا ثواب ہوتا ہے قیامت کے دن روحیں جسموں میں لوٹا دی جائیں گی اور قبروں سے اٹھ کر لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ [۱]

سوال ۸٦

حضرت مکرم! ایک غلام ذہنیت کے مولوی نے اپنے وعظ میں ایک مسئلہ بیان کیا ہے کہ سنی علماء جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسل سے حاصل ہوتی ہے، یہ غلط ہے اور **فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ** سے مراد **رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا**، الخ...... ہے۔ براہِ کرم اس اعتراض کی حقیقت سے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسلام!

جواب

اخی فی اللہ ھدا کم اللہ تعالیٰ عرض یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کی آیات بینات پر ایمان کی روشنی میں نگاہ کی جائے تو یہ مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب جنت میں حضرت آدمؑ سے شجرہ کے معاملے میں لغزش ظاہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا** [۲]......

۱۔ (کتاب الروح۔ ص73، 74، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

۲۔ (سورۃ الاعراف۔ پارہ ۸۔ رکوع ۱)

ملاحظہ فرمایئے''**ربنا ظلمنا**'' حضرت آدمؑ بہشت میں عرض کر رہے ہیں اور'' **فتلقی آدم من ربه**'' کلمات ''**فقلنا اهبطوا**'' کے بعد زمین میں آباد ہونے اور مدت دراز تک گریہ وزاری کرنے کے بعد وہ کلمات تلقین کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا یقیناً ''فتلقی'' سے ''ربنا ظلمنا'' ہرگز مراد نہیں ہوسکتی اور باقی تمام مفسرین کی رائے بھی یہی ہے۔ تفسیر عزیزی اور طبرانی در معجم کبیر صغیر و حاکم و ابونعیم و بیہقی از حضرت امیر المومنین عمرؓ ابن خطاب روایت کردہ اند۔[1] اس طویل روایت کے آخر میں فرمایا پھر انہوں نے دعا کی: **أسألک بحقِ محمدٍ** ﷺ **لما غفرت لی** ، الخ...... اس روایت کو مواہبِ لدنیہ نے بھی نقل کیا ہے اور آگے چل کر شاہ صاحب نے ابن المنذر کی روایت امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی کچھ زیادتی کے ساتھ اس طرح نقل کیا ہے: **اللهم! إني أسألک بجاهِ محمدٍ عبدکَ و کرامته علیك أن تَغفرلی خَطیئتی**...... دعا کے الفاظ اس کے علاوہ اور بھی نقل کیے گئے ہیں لیکن سیاقِ قرآن کریم اس بات پر دال ہے کہ وہ الفاظ ''ربنا ظلمنا'' نہیں تھے۔ یہ الفاظ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں نقل کیے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے معصیت کی وجہ دریافت فرمائی اور شیطان سے بھی تو شیطان نے کہا ''رب بما أغویتني''، الٰہی تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ اور آدم علیہ السلام نے اس گناہ کو اپنی طرف نسبت کیا خداوندا ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے، گناہ گرچہ بنور اختیار ما حافظ تو در طریقِ ادب کوش گو گناہ نیست۔

سوال: اسی آیۃ میں ''اِنَّـه هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ'' کے بعد پھر ''قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا'' موجود ہے۔ لہٰذا یہ معنیٰ کہ ''فتلقی'' زمین پر آکر ہوئی، مخدوش ہو جاتا ہے؟

جواب: حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اسی لیے ترجمہ فرمایا ہے کہ: گفتیم ما ہنوز

---

[1]۔ (تفسیر عزیزی۔ ج1 ص233)

مستقر باشید در مکان ہبوط منہا......یعنی از بہشت دور افتادہ جمیعا یعنی مجتمع شدہ اگر شمارا ایں وقت در بہشت بردار ہم دراولا دشما تفرقہ لازم آید نیکان را کہ پیروی آدم علیہ السلام مستحق بہشت شدہ باشند بہ بہشت رسایندہ شود و بدان را کہ خلاف طریقہء آدم مسلوک نمودہ باشند در دنیا گزاشتہ شود یا در دوزخ و این تفرقہ منافی غرض اہباط است زہرا کہ مقصود از اہباط ابتلا بتکلیف است و امتحان با مرونہی اھ ک...... گویا یہ لفظ دوبارہ دہرائے گئے جب حضرت آدم علیہ السلام کا قصور معاف ہو گیا تو ان کے دل میں خیال وارد ہوا ہو گا کہ جب خطا معاف ہو گئی تو ہمیں سابقہ منزل واپس مل جائے گی تو اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ نے ان کے طمع منقطع فرمانے کے لیے اور ہبوط کی حکمت یاد دلانے کے لیے جیسا کہ **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى** سے واضح ہو رہا ہے۔ فرمایا اب تم کو یہاں زمین پر ہی ٹھہرنا ہو گا بہشت سے بہت دور اور آخرت میں جزائے اعمال کے طور پر بہشت میں تمہاری اولاد جا سکے گی۔ گویا پہلا ''اھبطوا'' کا حکم بہشت سے نکال دینے کیلئے ملا اور دوسرا توبہ کے بعد زمین پر استقرار اور ہمیشگی کی اطلاع کے لیے۔

سوال: قرآن کریم میں ایسا بہت سی سورتوں میں وارد ہے، ایک پہلے کی بات قصہ کے طور پر بعد میں ذکر کر دی گئی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی گائے والا قصہ میں ''فذبحوہا'' کے بعد ''فادأرتم'' کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ تدافع پہلے کا واقع ہے اور اسی طرح سورۃ ھود میں وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ اس درخواست کا ذکر بعد میں ہے اور كَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ پہلے مذکور ہے حالانکہ غرق ہونے کے بعد یہ درخواست بالکل بے سود تھی۔

جواب: سورۃ ھود میں ''واؤ'' ہے جو محض جمع کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہو

سکتا ہے کہ یہ واقعہ پہلے ہوا ہو لیکن ذکر بعد میں کیا گیا ہو اور وہاں ''فتلقی'' میں ''فاء'' ہے جو تعقیب کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ قیاس مع الفارق ہے۔ ثانیاً خود سورۃ ھود میں **وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ** کو پہلے کا واقعہ بنانے میں جس طرح عام مفسرین نے کیا ہے، بہت سی خرابیاں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی کہ وہ تمہاری اھل میں سے نہیں ہے اور آپ اس درخواست سے توبہ کا اظہار کر چکے ہیں تو پھر اپنے لڑکے کو کہنا کہ تم کشتی پر سوار ہو جاؤ اور کافر نہ بنو۔ یہ کم از کم پیغمبر کی شان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اگر یہ کہا جائے کہ جب ہر کوئی غرق ہو گیا تو طبعاً حضرت نوح علیہ السلام کو دل میں رنج پیدا ہوا کہ خداوندا! اس کے غرق ہو جانے میں کیا حکمت ہے؟ حالانکہ تیرا وعدہ نجاتِ اھل کا تھا۔ جواب ملا وہ تمہارے اھل میں سے نہیں تھا کیونکہ اس کے عمل درست نہیں تھے۔ اور تنبیہ کی گئی جب وہ غرق ہو چکا ہے تو اب یہ جھگڑا بالکل بے سود ہے۔ اور بے فائدہ درخواستیں جن کے ظاہر ہونے پر الٹا رسوائی ہو، درست نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ اس درخواست کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بے فرمان اور غیر صالح تھا۔ تمہاری اھل میں سے نہیں تھا۔ یہ اضافہءِ معلومات کچھ اچھا نہیں ہے۔

مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ سے مراد بے خبری نہیں ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: **شِفَاءُ العِيِّ السؤال** ۔ پوچھی وہی بات جاتی ہے جس کا علم نہ ہو اور کوئی سوال اضافہ معلومات کے لیے منع نہیں ہے۔ **مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** کا معنی ہے بے نتیجہ درخواست اور بے سود سوال جہال کا کام ہے تو حضرت نوح علیہ السلام نے اس سے پناہ مانگ لی۔ مختصراً یہ معروضات پیش کیے گئے ہیں، ممکن ہے ان خیالات میں غلطی ہو تو وہ میری طرف نسبت کی جائے، میں خطاوار انسان ہوں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

سوال ۸۷

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسائل کہ:

۱۔ موجودہ دور میں موٹروں کی شرکت میں جو روپیہ لگایا جاتا ہے، اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا سالانہ منافع پر؟

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ جو ہر سرکاری ملازم کی ماہانہ تنخواہ سے کاٹ لیا جاتا ہے اور ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اکٹھا دیا جاتا ہے، کیا اس وقت یعنی ملازمت کے دوران میں وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں کرے؟

۳۔ گھر کا سامان، ریشمی کپڑے، گائے، بھینس، مکان وغیرہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ (سائل از شیخوپورہ)

جواب

۱۔ جو رقم اصل شرکت میں لگائی گئی ہے اس پر سال کے زائد منافع کو شامل کر کے زکوٰۃ لازم ہوگی اور سال میں اصل رقم سے موٹروں کی قیمت میں جو کمی آ جاتی ہے، اس کو منہا کر لیا جائے گا۔ کیونکہ استعمال کی وجہ سے اکثر ان کی قیمت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات خرید کی قیمت سے بڑھ بھی جاتی ہے، **القلیل کالمعدوم**...... یعنی یہ قلیل ہے۔

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ میرے خیال میں دَین قوی یا مدفون خزانہ کا حکم رکھتا ہے جس کے ہونے کا یقین تو ہو لیکن ملتا نہ ہو۔ بعض اوقات اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی اولاد کو وصول ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ملنے کے وقت زکوٰۃ ادا کی جائے گی لیکن اس سے پہلے بھی وہ زکوٰۃ لینے کا حقدار نہیں ہوگا۔ بعض فقہا کا خیال ہے کہ سالانہ زکوٰۃ

اکٹھی کر کے ادا کرے لیکن جب سالانہ اس کی مقدار یعنی اصل رقم فنڈ کی مجموعی تعداد معلوم نہیں ہوتی تو زکوٰۃ کس طرح ادا کرے گا، ہاں اگر معلوم ہو تو احتیاط اسی میں ہوگی کہ اس کی مقدار سالانہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔

۳۔ گھر کا سامان خواہ کتنی قیمت کیوں نہ رکھتا ہو، اور ضرورتِ اصلی کی چیزیں یعنی گائے بھینس بیلوں کا جوڑا وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ریشمی کپڑے جو استعمال نہیں ہوتے، انہیں تمول کے لیے تو شمار کیا جائے گا لیکن ان کی موجودگی میں زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں رہے گا۔ ان پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۸۸

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ نابالغ لڑکا بنفسہ ایقاع طلاق کرسکتا ہے یا نہ یا اس کی طرف سے اس کا کوئی ولی طلاق دے سکتا ہے یا نہیں؟ لیکن امام شمس الائمہ سرخسیؒ کا قول ایقاع پر دلالت کرتا ہے: **قال ان طلاق الصبی واقع اذا دعت الیه حاجته** ...... پھر فرماتے ہیں: **ان حکم الطلاق ثابت فی حقه عند الحاجة**۔ اس صورت کے مطابق اگر لڑکی جوان ہوگئی ہو اور زنا یا فرار کا خوف ہو اور لڑکا ابھی تک نابالغ ہو تو کیا اس کی طلاق واقع ہوسکتی ہے یا نہیں؟ (سائل از بھکر)

جواب

میرے عقلِ ناقص کی رسائی تک تو نابالغ لڑکے کی طلاق ناجائز ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ شریف۔ فرماتے ہیں: **لایقع طلاق الصبی والمجنون لقوله علیه السلام کل طلاق جائز الا طلاق الصبی والمجنون**......

ترجمہ: بچے اور پاگل کی طلاق جائز نہیں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان عالی شان کی وجہ سے کہ ہر طلاق جائز ہے مگر بچے اور پاگل کی طلاق جائز نہیں ہے

اور صاحب فتح القدیر پر فرماتے ہیں: **ھکذا روی عن ابی عباس و علی و عثمان رضی اللّٰہ عنھم اجمعین قال ولکن من الکلیات الشریعة عن التصرفات لاتنفذ الا ممن له اھلیة التصرف و ادرناھا بالعقل والبلوغ خصوصاً ماھو دائربین الضرر والنفع خصوصاً مالایحل الالانتفاء مصلحة ضده القائم کالطلاق... وبھذا یبعد مانقل عن ابن المسیب و ابن عمر رضی اللّٰہ عنھما و جوازہ عن امام احمد رحمہ اللّٰہ مسئله و اللّٰہ اعلم بصحة النقل** اھ ک......

ترجمہ: فتح القدیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت علی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنھم سے اسی طرح مروی ہے اور فرمایا کہ کلیات شریعہ سے ہے۔ کہ اس شخص کا تصرف نافذ ہوگا جس میں تصرف کی اہلیت ہو اور اس کا دارومدار عقل اور بلوغت پر ہے۔ خصوصاً وہ چیز جو مصلحت کے بغیر حلال نہ ہو۔

اور جس کی ضد موجود ہو اور جو ابن مسیب اور حضرت عبداللہ ابن عمر سے طلاق کا جواز مروی ہے وہ بعید ہے یعنی ان حضرات سے مروی ہے کہ بچے کی طلاق جائز ہے۔[1]

گویا محقق ؒ کے نزدیک بھی ان روایات کی صحت مخدوش ہے کیونکہ صحیح احادیث اور مذہب المیتنا امثلثہ اور کلیات شریعت محمدیہ علیہ التحیۃ والتسلیم کے خلاف ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے: **الا اذاکان مجبوبا و فرق بینھما او اسلمت زوجته فعرض علیه الاسلام ممیزافابی وقع الطلاق۔**

---

[1]۔(فتح القدیر، ج3 ص38)

ترجمہ: مگر جب وہ مجبوب (ذکر کٹا ہوا) ہوتو قاضی میاں بیوی کے درمیان جدائی کرے گا یا عورت اسلام لائی تو پھر مرد پر عورت اسلام کو پیش کرے اگر انکار کرے حالانکہ وہ سمجھ دار تھا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔[1]

صورتِ مسئولہ میں امام سرخسیؒ کے قول کے مطابق بھی بشرطِ صحت نقل طلاق واقع نہ ہو سکے گی کیونکہ یہاں زنا کا فرضی خوف وغیرہ عورت کی حاجت ہے، مرد کی نہیں اور یہی علماء احناف کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ **رحمهم الله تعالیٰ اجمعین وارزقنا اتباعهم۔**

(۱۴ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ)

سوال ۸۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندرین مسئلہ کہ زید نے عمر کے ساتھ جھگڑے کے دوران کہا کہ مجھ پر عمر طلاق ہے مجھے عمر نے ''کہی'' (کسی) ماری ہے۔ عمر کہتا ہے کہ میں نے ''کہی'' نہیں ماری۔

۱۔ قابلِ دریافت امر یہ ہے کہ ''مجھ پر طلاق ہے'' کہنے سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

۲۔ عمر کے اضافہ سے طلاق کی نوعیت میں کیا فرق پڑے گا؟ یہ کس قسم کی طلاق ہے؟

۳۔ عدم شہود کی صورت میں عمر کو حلف دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

۴۔ فقہ حنفی میں اس لفظ کا ماخذ کیا ہے؟

(سائل از سید والا داخلی، کلور کوٹ)

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص462)

جواب

۱۔ ''مجھ پر طلاق ہے'' کے لفظوں سے بعض متقدمین کے نزدیک تو طلاق واقع نہیں ہوتی جیسا کہ علامہ ابی السعود آفندی مفتی الروم اور خیر الرملی اولاً وغیرہ متاخرین میں سے غلام قاسم محقق ابن ھمام سید عبدالغنی نابلسیؒ وغیرہ حضرات کا خیال ہے کہ واقع ہو جاتی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ متقدمین کے وقت میں عرف نہ ہوگی، ہمارے زمانہ میں عرف ہے، لہٰذا واقع ہوگی اور اسی کو علامہ شامی اور صاحب درالمختار نے ترجیح دی ہے۔ فرمایا: **ومن الفاظ المستعملة الطلاق يلزمنى والحرام يلزمنى وعلى الطلاق وعلى الحرام فيقع بلا نية للعرف فلو لم يكن له امرءة يكون يمينا فيكفر بالحنث**......

ترجمہ: طلاق کے اندر استعمال ہونے والے الفاظ میں الطلاق یلزمنی (مجھ پر طلاق لازم ہے) اور الحرام یلزمنی (مجھ پر حرام لازم ہے) اور علی الطلاق (مجھ پر طلاق ہے) اور علی الحرام (مجھ پر حرام ہے) تو طلاق عرف کی وجہ سے بغیر نیت کے واقع ہوگی اگر اس کی بیوی نہ ہو تو یہ قسم ہوگی اور اس پر قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔[۱]

علامہ شامیؒ سید عبدالغنیؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ: **والمتعارف استعماله فى موضع التعليق دون الانشاء فاذا لم يتعارف استعماله فى الانشاء منجزا لم يكن صريحا۔**

ترجمہ: اور اس کا استعمال تعلیق میں متعارف ہے انشاء میں متعارف نہیں ہے۔ پس جب انشاء میں اس کا استعمال منجز متعارف نہ ہو تو وہ صریح نہیں ہوگا۔[۲]

۱۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص469)

۲۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص470)

درالمختار میں ہے: **الصریح مالایحتاج الی النیة بائناکان الواقع به او رجعیا۔**

ترجمہ: صریح وہ ہے جس میں نیت کی ضرورت نہ ہو چاہے اس کے ساتھ واقع ہونے والی طلاق رجعی ہو یا بائن ہو۔[1]

علامہ شامی نے اسی عبارت کے تحت لکھتے ہیں۔ بہت سے صریح الفاظ ہیں جن سے بائن واقع ہوتی ہے جیسا کہ: **انت طالق بائن اوالبتة او افحش الطلاق۔ طلاق الشیطان وغیرہ۔**

ترجمہ: یعنی جس طرح کہ تو بائن طلاق والی ہے یا بتہ طلاق والی ہے یا افحش طلاق ہے یا طلاق الشیطان وغیرہ

فھذاکله صریح لایتوقف علی النیته ویقع به البائن۔

ترجمہ: یہ الفاظ سب صریح ہیں اور نیت پر موقوف نہیں ہوں گے اور ان کے ساتھ بائن طلاق واقع ہوگی۔[2]

اس سے چار سطر اوپر لکھتے ہیں: **ولا یرد انت علی حرام علی المفتی به لایتوقف علی النیته۔ مع انه لایلحق البائن ولایلحقه البائن لکونه بائنا لما ان عدم توقفه علی النیته امر عرض له بحسب اصل وضعه ومثله فی الدر عن التلویح وحواشی خیر الرملی قال فی مشتمل الاحکام والبائن لایلحق البائن یعنی البائن اللفظی اما البائن المعنوی یلحق اللفظی مثل الثلاث من المبسوط والمراد بالبائن**

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص509)

[2]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص509)

الذی لا یلحق هو ماکان بلفظ الکنایته الخ......[1]

۲۔ اس طویل سمع خراشی کا مقصد یہ ہے کہ باتفاق فقہا صریح وہ ہے جو نیت کی محتاج نہ ہو۔ اب واضح ہے کہ خود علمائے دیوبند اور دیگر حضرات مثلاً حافظ عطا محمد صاحب (ضیا شمس العلوم)، مولانا عبدالستار صاحب و محمد عبداللہ صاحبان مفتیان خیرالمدارس اور دیگر تمام حضرات اس کے معانی مختلف کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس کا معنی ہوگا ''عمر میں طلاق ہے''، کوئی کہتا ہے ''عمر بھر طلاق ہے''، کوئی کہتا ہے ''عرف کو دیکھنا چاہیے، اس علاقہ کی عرف میں اس کے کیا معنی مراد لیے جاتے ہیں''، بعض کا خیال ہے ''کلما کا مفہوم عرف میں اس طلاق سے مراد لیا جاتا ہے''...... بہر کیف جس کلام کا معنی بھی حضرات علماء کرام کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے، اسے صریح کہنا اور سمجھنا کتنی زبردستی ہے۔ آگے چلیے:

۳۔ اس لفظ میں طلاق عمر کی صفت ہے یا عمر طلاق کی؟ کیونکہ طلاق کی اضافت جب زمانہ کی طرف کی جائے تو اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ طلاق مضاف ہوگی یا مضاف الیہ؟ موصوف ہوگی یا صفت مشبہ ہوگی؟ یا غیر مدخول بہا کیلئے ہوگی یا غیر مدخولہ کیلئے؟ یہ سب مختلف اقسام ہیں اور ہر ایک کا حکم علیحدہ ہے۔ ظاہر ہے اگر طلاق عمر کی صفت ہو تو لفظ بالکل مہمل اور بے معنی ہو جائے گا جو کسی عاقل کو پسند نہیں ہے۔ لہٰذا یقیناً عمر طلاق کی صفت ہوگی اور اضافت مقلوبی ہوگی جیسا کہ اورنگزیب وغیرہ۔ اس کے ساتھ بائن طلاق واقع ہوگی اور عرف کی وجہ سے نیت کی محتاج نہیں ہوگی اور بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اس کا تکرار اسے مغلظہ نہ بنا سکے گا۔ اس تمہید کی تفصیل ملاحظہ ہو: **کذا شرعاً فما لو حلف**

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص509)

لیصومن عمره فانه یتناول جمیع عمره ولوقال لاصومن فی عمری فانه یتناول ساعة من عمره حتّٰی لوصام ساعة برا فی یمینه کذا فی المعراج۔

ترجمہ: اگر قسم اٹھائی کہ پوری زندگی روزہ رکھے گا تو قسم اس کی تمام عمر کو شامل ہوگی اور اگر کہا کہ اپنی زندگی میں روزہ رکھوں گا تو یہ اس کی زندگی کی ایک گھڑی کو شامل ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر ایک گھڑی روزہ رکھا تو اپنی قسم کو پورا کرنے والا ہو گا۔[1]

ذکر فی عدم ذکر کا فرق نہ ہو وہاں ہوگا جس کے لیے زمانہ متجزّی ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ صمت یوم الجمعۃ کہے یا صمت فی یوم الجمعۃ، کوئی فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ جز کا صوم ممکن نہیں، بخلاف طلاق کے کہ وہ جز میں بھی ممکن ہے۔ لہٰذا یہاں ذکر فی اور حذف فی میں فرق ہوگا۔ **واشارہ فی تلخیص الجامع الی قاعدۃ ھی ان الاضافۃ ان کانت الی الموجود فانہ یتجز کقولہ انت طالق فی الدار وان کانت الی معدوم فانہ یتعلق کقولہ فی دخولک** الخ......

ترجمہ: اور تلخیص الجامع میں اس قاعدہ کی طرف اشارہ ہے کہ اضافت اگر موجود کی طرف ہوتو منجز طلاق واقع ہوگی۔ جس طرح کہ اس کا قول انت طالق فی الدار (تو گھر میں طلاق والی ہے) اور اگر معدوم کی طرف ہوتو طلاق معلق ہوگی جس طرح کہ اس کا قول فی دخول الدار (تیرے گھر میں داخل ہونے میں)۔[2]

۴۔ لفظ ''عمر طلاق'' باضافہ لفظ عمر فقہ حنفی میں بجنسہٖ تو موجود نہیں لیکن اس کے امثال

---

[1]۔(بحر۔ ج3 ص268، دارالکتب العربیہ الکبری)

[2]۔(بحر۔ج3 ص266)

موجود ہیں کیونکہ لفظ طلاق کی اضافت وقت اورزمان کی طرف بالاجماع جائز ہے جیسا کہ: **انت طالق کل یوم اوکل جمعۃ اوکل شہر وغیرہ یا انت طالق شہرا یا انت طالق فی رمضان**،[1]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے، **فھو اول رمضان یاتی**[2] لیکن یہ کہنا کہ عمر طلاق کا معنی عمر بھر کے لیے طلاق ہے اور ہر طلاق عمر بھر کیلئے ہوتی ہے، اور اس پر یہ استدلال کہ **متی طلقت فی وقت طلقت** یا زد بار لفظ **فی جمیع الاوقات** بالکل غلط ہے۔ یہ تو اس وقت ہے جب مطلق وقت کی طرف طلاق نسبت کی جائے ۔ **مثالہ انت طالق فی ثلثۃ ایام طلقت الحال لان لا محل الوقت یصلح ظرفا لھا**، الخ...... جیسا کہ انت طالق فی ثلثۃ ایام نہ کہ مخصوص وقت کی طرف بغیر فی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے خیال میں طلاق عمر کی صفت ہو گی۔ **کما مر انفا وھو مھمل بالکلیۃ**۔

اگر ہر طلاق عمر بھر کے لیے ہوتی ہے تو پھر رجعی اور بائن مغلظہ کا فرق بالکل بے سود ہے۔ جب ہر ایک کا ذیل موجود ہے تو وہ عمر بھر کے لیے کس طرح ہو گی۔ طلاق رجعی میں عدت تک تو فقہا حنفیہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے نزدیک نکاح زائل نہیں ہوتا۔

ہدایہ شریف میں ہے: **والطلاق الرجعی لایحرم الوطی وقال الشافعی یحرم الوطی لان الزوجیۃ زائلۃ لوجود القاطع وھو الطلاق ولنا انھا قائمۃ حتی یملک مراجعتھا من غیر رضاھا**، الخ......

ترجمہ: اور طلاق رجعی وطی کو حرام نہیں کرتی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ وطی کو حرام کر

۱۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 1 ص 403، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

۲۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ص 404,403)

دیتی ہے،اس لیے کہ قاطع نکاح کے پائے جانے کی وجہ سے زوجیت زائل ہوگئی اور قاطع نکاح طلاق ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ زوجیت قائم ہے یہاں تک کہ بیوی کی رضامندی کے بغیر بھی شوہر اس سے رجعت کرنے کا حق دار ہے۔[1]

ہدایہ میں ہے: **وفی قوله تعالیٰ فامسکوهن بالمعروف الاتری انه تعالیٰ سمیٰ امساکا وهو الابقاء وانما یتحقق الاستدامة فی العدة (کفایه) لان الرجعة استدامة الملک القائم لا انشاء له من کل وجه۔**

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ عورتوں کو شرعی دستور کے مطابق روک لو۔اس کا نام امساک رکھا گیا ہے اور وہ باقی رکھنا ہے۔اور باقی رکھنا عدت ہی میں متحقق ہو گا۔کیونکہ رجعت نئے سرے سے انشاء نہیں ہے بلکہ ملک کو باقی رکھنا ہے۔[2]

اسی لیے ہمارے نزدیک رجعۃ پر شہادت شرط نہیں۔ **لانه استدامة للنکاح۔**

فتح القدیر میں ہے **فی الشلبی علی حسامیة الفتح وقوله تعالیٰ وبعولتهن احق بردهن وهو یشیر بتسمیته بعلا الی ان الطلاق الرجعی لا یبطل الزوجیة** الخ......

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا قول وبعولتھن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو بعل یعنی زوج کہنا طلاق رجعی ہے جس سے زوجیت باطل نہیں ہوتی۔[3]

ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ رجعی مزیل زوجیت نہیں لہٰذا اسے عمر بھر یا عمر طلاق کا مصداق کہنا ایسا ہے جیسا رات کو دن بتلانا۔واللہ ولی الرشاد۔

۱۔(ہدایہ۔ج2ص409)

۲۔(ہدایہ۔ج2ص405)

۳۔(فتح القدیر۔ج3ص44)

۵۔ جب طلاق کی اضافت وقت، زمانہ، سنہ، شہر کی طرف شرعاً جائز ہے گو ہر ایک کا حکم مختلف ہے، تو عمر، زندگی اور وقت میں فرق صحیح نہ ہوگا یعنی لفظ عمر کی طرف طلاق کی نسبت جائز ہوگی۔ عرفاً اور معناً بھی حالفین کا مقصد اس طلاق سے وہ طلاق ہوتی ہے جس کا مزیل نہ ہو۔ یہ حلف ہمارے ملک میں کنوارے بھی اٹھاتے ہیں اور ان کا یہ حلف دلوانے کا مقصد صراحۃً یہی ہوتا ہے کہ یہ پھر دوبارہ نکاح نہ کر سکیں۔

بحر میں ہے۔ **واما البينونة بتطليقة شديدة وما بعده فلان مالا يمكن تداركه يشتد عليه وهو البائن وما يصعب تداركه يقال فيه لهذا الامر طول وعرض فهو البائن ايضاً**، الخ......[1]

قابلِ غور امر یہ ہے کہ عوام حیلہ کو تدارک نہیں سمجھتے بلکہ حیلوں حوالوں سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ تو صرف مولوی صاحبان کا کام ہے۔ فقہی طور پر یہ معنیٰ ''کلما اتزوج'' والی طلاق میں پائے جاتے ہیں لیکن اس کے لیے ان الفاظ کا کہنا لازم ہے، نہ صرف اس مفہوم کا تصور کر لینا کافی ہوگا۔ **کما صرح به ابن همام** علیہ الرحمۃ۔ اگر عرف کو نص تسلیم کیا جائے تو پھر صرف اس مفہوم کا ارادہ کافی سمجھا جانا چاہیے۔ جیسا کہ حقیقت اور مجاز کی بحث کتب اصول میں مذکور ہے۔

٦۔ جب طلاق کی نسبت وقت، زمانہ، عمر، زندگی وغیرہ الفاظ کی طرف ہو سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس لفظ کے اضافہ سے حالف کا خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ شدت اور سختی پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ورنہ اس اضافہ کو بالکل لغو سمجھنا مسلمان عاقل و بالغ کی کلام مہمل بنانا ہوگا جو سراسر بے انصافی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے

الاصل انه متى وصف الطلاق ان كان وصفا لا يصف به الطلاق يلغو:

---

[1]۔ (بحر۔ ص289)

الوصف ویقع رجعیا مثلاً ان یقول انت طالق طلا قالم یقع علیک او علی انی بالخیار وغیرہ و متی وصف بصفعة یوصف بھا الطلاق فلا یخلوا اما ان لاتبنئی عن زیادة کقولہ احسن الطلاق او افضلہ او تنبئی عن زیادة کقولہ اشد الطلاق ونحوہٖ فالاول رجعی والثانی بائن علی اصولھم، الخ...

ترجمہ: اصل یہ ہے کہ طلاق کو اگر ایسے وصف کے ساتھ بیان کیا جس کے ساتھ طلاق کوموصوف نہیں کیا جاتا تو وصف لغو ہو جائے گا اور رجعی طلاق واقع ہو جائے گی جس طرح کہ انت طالق طلا قالم یقع علیک یا انی بالخیار اور جب اس کوموصوف کیا ایسی صفت کے ساتھ کہ جس کے ساتھ طلاق کوموصوف کیا جاتا ہے تو یہ دو حال سے خالی نہیں یا تو اس میں زیادتی سے خبردار کرنے والا معنی موجود ہوگا جیسے اشد الطلاق یا اس کی مثل تو اس کے ساتھ بائن طلاق واقع ہوگی یا اس نے زیادتی سے خبردار کرنے والا معنی موجود نہیں ہوگا جس طرح کہ احسن الطلاق افضل الطلاق وغیرہ۔ تو اس سے رجعی طلاق واقع ہوگی۔

وفی البدائع: اذا وصف الطلاق بصفعة تدل علی البینونة کان بائنا،

ترجمہ: بدائع میں ہے کہ طلاق کو جب ایسی صفت کے ساتھ موصوف کیا جو بینونت پر دلالت کرتی ہے۔ تو یہ طلاق بائن ہوگی۔[1]

و ھو یقول ثم اعلم ان الطلاق یتوقت فاذا قال انت طالق الی عشرة ایام فانہ یقع بعد العشرة والتاویل ماقال الشامی علیہ الرحمۃ ولیس بینھما بون لمن القی وسمع وھو شھید۔

---

[1]۔(بحرالرائق۔ج 3 ص 291، بحرالاکتب العربیۃ)

7۔ ایک بار پھر توجہ فرمایئے۔ عمر، زندگی، ہر وقت، ہر زمان سب قریب المعنی الفاظ ہیں۔ ان سے کل وقت، تمام عمر، ساری زندگی مراد ہوتی ہے۔ یہ الفاظ طلاق کی صفت ہو سکتے ہیں اور ان کے صفت بنانے سے عموم کلیت اور شدت کے سوا کچھ مراد نہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **الفاظ اشرط بالفارسية اگر، وهمی و همیشه و هر گاه و هر زمان و هر بار فالاول بمعنی ان والثانی بمعنی متی والثالث کالثانی والخامس بمعنی کل والسادس بمعنی کلما۔**

ترجمہ: اگر وہمی و ہمیشہ ہر گاہ ہر زماں ہر بار پس لفظ اگر ان کے معنی میں ہے تو پس حانث نہ ہوگا مگر ایک مرتبہ اور دوم بمعنی متی ہے کہ اس میں بھی ایک مرتبہ حانث ہوگا اور سوم مثل دوم کے ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں اور چہارم اور پنجم میں بھی ایک مرتبہ حانث ہوگا اس لیے کہ یہ لفظ کل کے معنی میں ہے اور یہی بات صحیح ہے اور ششم کلما کے معنی میں ہے۔[1]

۸۔ ہدایہ شریف میں ہے: **ثم الاصل عند ابی حنیفة انه متی شبه الطلاق بشئ یقع بائنا ای شئی کان المشبه به ذکر العظم اولم یذکر لما مر لان التشبیه یقتضی زیادة الوصف**، الخ......

ترجمہ: امام صاحب کے نزدیک اصل یہ ہے کہ جب طلاق کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی تو یہ بائن طلاق ہوگی مشبہ بہ جو چیز بھی ہو چاہے بڑا ہونے کو ذکر کیا یا نہ کیا کیونکہ تشبیہ وصف کی زیادتی کا تقاضا کرتی ہے۔[2]

---

[1]۔ (فتاویٰ عالمگیری۔ ج 1 ص 452، مطبوعہ دار العلمیہ بیروت لبنان)

[2]۔ (ہدایہ۔ ج 2 ص 387)

۹۔ لہٰذا ان مندرجہ بالا گزارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے عمر مدعی علیہ کو بصورت عدم شہود حلف دی جائے گی کہ اس نے ''کہی'' نہیں ماری بصورتِ دیگر انکار طلاق واقع نہ ہو گی۔

اگر حلف اٹھادے تو بائن طلاق واقع ہوگی اور اسے بائن لفظی ہونے کی وجہ سے تکرار مضر نہ ہوگا۔ ہٰذا ما عندی والعلم عند اللہ العلی تعالیٰ وما توفیقی الا باللہ

(۴ ذیقعد ۱۳۸۲ھ بمطابق ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء)

سوال ۹۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص کو حکیم صاحب نے ''بیئر'' پینے کو کہا ہے، وہ نشہ بھی دیتی ہے اگر زیادہ مقدار میں استعمال کی جائے، اگر تھوڑی استعمال کی جائے تو نشہ نہیں ہوتا۔ شرعاً کیا حکم ہے؟ وہ شخص کیا کرے؟ مطلع فرمائیں۔

(سائل از داؤد خیل)

جواب

بیئر ایک قسم کی شراب ہے اور شراب تھوڑی ہو یا بہت، حرام ہے۔ حضرت امام الائمہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک دوا کے لیے بھی اس کا استعمال ناجائز ہے۔ امام ابو یوسفؒ صاحب کے نزدیک اگر حکیم حاذق کہے کہ اس کے سوا اب اور کوئی علاج نہیں رہا، تو دوا کی مقدار استعمال کرسکتا ہے۔ آج ایسے حکیم حاذق کہاں ہیں جو ہر مرض کے جملہ معالجات پر حاوی ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: **لا شفاء فی الحرام۔**

ترجمہ: حرام چیز میں شفاء نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (۱۵ ذوالحجہ ۸۲ھ)

سوال ۹۱

ایک شخص سے والد نے مطالبہ کیا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور سخت مجبور کیا تو اس نے جواباً چھ دفعہ کہا کہ طلاق ہے، طلاق ہے، پھر اپنی بیوی کے ورثاء کو دیکھ کر تین دفعہ کہہ دیا کہ طلاق ہے، طلاق ہے، کیا اس کی عورت کو طلاق ہوئی یا نہیں؟ (سائل مولانا عبدالغفور صاحب جنجوی)

جواب

شخص مذکور کی عورت مطلقہ مغلظہ ہو گی۔ فتاوی مولوی عبدالحیی نے فرمایا: زید از زوجہء مدخولہ خود گفت طلاق است طلاق است طلاق است ودریافت کردہ شد کہ از تکرار چہ مراد است گفت صرف تاکید فصدق دیانۃ لا قضاء در درمختار است کہ لفظ الطلاق وقع الکل وان نوی التاکید دین[۱]...... اس طرح یہاں بھی حالف سے دریافت کر لینا بہتر ہے کہ تمہارا ارادہ طلاق ہے کس طرف تھا؟ ویسے علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ طلاق صریح میں بھی نیت کی حاجت پڑ جاتی ہے۔ **بهذا ظهر عدم صحة مافی البحر والاشباه من ان قولهم ان الصريح لايحتاج الى النية انما هو فی القضاء واما فی الديانة فمحتاج اليها......**

ترجمہ: اور اسی کے ساتھ بحر اور اشباہ میں جو ہے اس کی عدم صحت ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ صریح نیت کی محتاج نہیں ہے یہ بات (نیت کا محتاج نہ ہونا) قضاء میں ہے بہر حال دیانۃ صریح بھی نیت کی محتاج ہے۔[۲]

---

[۱]۔(فتاویٰ مولوی عبدالحیی ۔ص 87)

[۲]۔(فتاویٰ شامی۔ج 2 ص 468)

ممکن ہے کہا جائے کہ طلاق کو حالف نے اپنی بیوی کی طرف نسبت بھی نہیں کیا اور بیوی کا نام بھی نہیں لیا تو عرض ہے کہ علامہ شامی نے تصریح کی ہے کہ اضافت معنوی کافی ہے۔ چونکہ ہمارا عرف ایسا ہے اور حالف کے کلام مطالبہء طلاق زوجہ مدخولہ خود کے بارے میں ہے لہٰذا نیت وغیرہ کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۹۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین اندریں مسئلہ کہ زید نے عورت کے ساتھ جھگڑا کرتے ہوئے کہا، طلاق دے دی، طلاق دے دی، اس وقت عورت سامنے نہیں کھڑی تھی، پھر اپنے بیٹے کو کہا کہ میں نے تمہاری والدہ کا فیصلہ کر دیا ہے، اسے جہاں چاہو لے جاؤ۔ گواہ کہتا ہے کہ حالف نے کہا مجھ پر تین طلاق سے حرام ہے، مجھے گھر میں ٹھہرانے کی کوئی حاجت نہیں۔ عورت کہتی ہے کہ میرے اور خاوند کے درمیان مردوں کی بھیڑ تھی، میں نے خاوند کے الفاظ نہیں سنے۔ چونکہ بیوی کا نام نہیں لیا اور نہ طلاق کو اس کی طرف منسوب کیا ہے، طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ہوگی تو مغلظہ ہوگی یا رجعی؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل صاحبزادہ عبدالمعید اختر از جنجوں شریف، ۱۶ شوال ۱۳۸۲ھ)

جواب

فقہا کے نزدیک عرف نص کا درجہ رکھتی ہے اور ہماری عرف ''میں نے تیری ماں کا فیصلہ کر دیا ہے'' اور ''جہاں تیری مرضی ہو لے جاؤ'' دونوں کنائی طلاق کے الفاظ ہیں اور کنائی طلاق حالتِ مذاکرہ اور غضب میں وقوع طلاق کا باعث ہوتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **وفی حالة المذاكرة يقع الطلاق فی سائر**

الاقسام الا فیما یصلح جوابا وردا و فی حالة الغضب یصدق فی جمیع ذلک الافیما یصلح للطلاق فی قوله اعتدی اختاری امرک بیدک والحق ابو یوسف علیہ الرحمۃ بخلیة وبریته وبتة بائن و حرام ذکر ها السرخسی فی المبسوط وقاضی خان فی الجامع الصغیر۔ وآخرون وھی لاسبیل علیک ولا ملک لی علیک خلیت سبیلک وفارقتک والا روایته فی خرجت من ملکی قالو ھو بمنزلة خلیت سبیلک ......

ترجمہ: اور مذاکرہ طلاق کی حالت میں قضاء ان سب الفاظ کے علاوہ جو جواب رد کی صلاحیت رکھتے ہیں طلاق واقع ہو جائے گی اور حالت غضب میں اگر ایسے الفاظ کہے تو ان سب میں اس کے قول کی تصدیق کی جائے گی۔ مگر اس میں جو طلاق کی صلاحیت رکھتے ہیں جس طرح کہ اس کا قول اعتدی، اختاری، امرک بیدک تو ایسے الفاظ میں شوہر کے قول کی تصدیق نہ ہوگی۔ اور امام ابو یوسف صاحب نے **خلیة، بریة، بتة، بائن** اور حرام کے ساتھ چار کلمات اور ملائے اور وہ **لا سبیل لی علیک** (میری تجھ پر کوئی راہ نہیں) **ولا ملک لی علیک** (میری کوئی ملک تجھ پر نہیں) اور **خلیت سبیلک** (میں نے تیری راہ خالی کر دی) اور **فارقتک** (میں نے تجھے الگ کر دیا)[1]۔ اور ظاہر ہے کہ جب عورت کے ساتھ نزاع ہو رہا ہے تو طلاق صریح بھی اسی کو دے رہا ہے، خاص کر جب وہ بیٹے کو کہہ رہا ہے کہ میں نے تیری ماں کا فیصلہ کر دیا ہے تو پھر مزید اضافت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

لترکه الاضافة ای المعنویة فانها الشرط۔[2]

۱۔(فتاویٰ عالمگیری۔ج1ص410)

۲۔(فتاویٰ شامی۔جلد2ص440)

یعنی نسبت معنوی ہی وقوع کے لیے شرط ہے، نسبتِ لفظی ضروری نہیں۔

آگے چل کر علامہ شامیؒ اس کی مثال دیتے ہیں۔

ولو قال طالق فقیل له من عنیت فقال امرءتی طلقت مراءته۔

ترجمہ: اگر کہا کہ طلاق والی ہے اس سے پوچھا گیا کہ تیری مراد کون ہے اس نے کہا میری بیوی تو اس کی بیوی طلاق والی ہو جائے گی۔[1]

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے۔

سکران هربت منه امرءته فتبعها ولم یظفر بها فقال بالفارسية سه طلاق ان قال عنیت امرءتی یقع۔

ترجمہ: نشہ والا شخص کہ جس کی بیوی بھاگ گئی اور یہ اس کے پیچھے چلا گیا لیکن اس کو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا پھر فارسی میں کہا کہ سہ طلاق اگر اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کا ارادہ کیا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔[2]

غور فرمایئے اور یہاں تو حالف نے اپنے لڑکے کو بانگِ دہل بتلایا ہے کہ میں یہ طلاقوں کی پلٹن تمہاری ماں کی طرف بھیج رہا ہوں۔ لہٰذا میری فہمِ نارسا میں حالف مذکور کی بیوی مطلقہ مغلظہ ہو چکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۹۳

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زمین کی پیداوار سے جو عشر نکالا جاتا ہے، اس میں سے سرکاری (گورنمنٹ) کا لازم کردہ مالیہ منہا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص466، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ) (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص466)

[2]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ۔ ج2 ص76)

جواب

عشر میں سے کسی قسم کا خرچہ، مالیہ ٹیکس وغیرہ نہیں نکالا جا سکتا۔

کنزالدقائق میں ہے۔ **ولا ترفع المؤن مثل اجرة الحمال و نفقة البقر وکری الانهار واجرة الحافظ و نحوها لاطلاق مارويناو ماتلوناا ے فیما خرج لكم من الارض ففيه العشر الحديث وانفقو من طيبات ماكسبتم و مما اخرجنالكم من الارض الايات۔**

ترجمہ: اور خرچہ، مجرا نہیں ہوگا جس طرح کہ بوجھ اٹھانے والوں کی اجرت اور بیلوں کا خرچہ نہر کا کرایہ حفاظت کرنے والے کی اجرت اور اس کی مثل کیونکہ حدیث پاک میں یہ حکم مطلق آیا ہے حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز بھی زمین سے تمہارے لیے نکلے اس میں عشر واجب ہے اور قرآن مجید کی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی حلال کمائی میں سے خرچ کرو اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا اس سے بھی خرچ کرو۔[1]

سوال ۹۴

زید تین دفعہ کہتا ہے کہ صغریٰ قریشن کو نکاح میں لاؤں تو مجھ پر حرام ہے یا اس کے اردگرد آگے پیچھے آؤں یا صحبت صغریٰ سے کروں تو مجھ پر عمر طلاق ہے۔ کیا صورتِ مسئولہ میں زید کا نکاح صغریٰ قریشن سے صحیح ہوسکتا ہے یا نکاح کرتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی؟

جواب

زید پر پہلی حلف کی وجہ سے ایک دفع نکاح کرنے سے طلاق بائن واقع ہوگی اور

۱۔(کنزالدقائق، ص78)

بائن بائن کو لاحق نہیں ہوتی لہٰذا تکرار مضر نہ ہو گا۔ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے۔ **لو قال لامرأۃ تزوجتک فحلال اللہ علی حرام فتزوجھا تطلق۔** (خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے۔ دوسری حلف کی وجہ سے تجدیدِ نکاح ثانیا کے بعد مصاحبت اور مضاجعت سے دوبارہ طلاق واقع ہو جائے گی۔ چونکہ عمر طلاق کے لفظ کو ہر دفع صحبت کرنے سے معلق نہیں کیا گیا اور نہ ''کلما'' کی طرح اسے تزوج سے متعلق کیا ہے، لہٰذا تیسری دفعہ نکاح کرنے سے طلاق واقع نہ ہو گی۔[1]

شامی میں ہے: **فاذا قال ان تزوجت فلانۃ ابدا ھی کذا فتزوجھا ثانیا لاتطلق لا التابید انما ینفی التوقیت فیتابد عدم التزوج ولا یتکرر۔۔۔** بعض علماء کا خیال ہے کہ عمر طلاق کا لفظ نکاح کی طرف مضاف نہ ہو تو بیکار ہے، اس سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے رجعی واقع ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس سے بائن واقع ہوتی ہے۔ **کما ھو موید من الفقہ بالفقہ واللہ الموید والموفق وھو حسبی ونعم الوکیل۔ واللہ اعلم بالصواب**

سوال ۹۵

زید اور عمر نے جنگل میں بیٹھے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی ہمشیرہ تمہیں نکاح کر دی ہے اور اس نے قبول کر لی۔ حق مہر کا ذکر بھی نہیں کیا اور نہ ہمشیرگان سے اجازت لی۔ حالانکہ وہ دونوں بالغہ نہیں ہیں اور بعد میں جب ان کو اطلاع دی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ نکاح ہو گیا ہے یا نہیں؟

---

[1]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ، ج 1، ص 96)

جواب

سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **البکر تستاذن او تستاءمر** یعنی کنواری لڑکی بالغہ سے اجازت لینا ضروری ہے لہٰذا یہ نکاح درست نہیں ہوا۔[۱]

وہ جہاں چاہیں، دوسری جگہ نکاح کر سکتے ہیں۔ مہر کا ذکر یا عدم ذکر کوئی مضر نہیں۔ اس صورت میں اگر نکاح درست ہوتا تو مہر لازم ہو جاتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (۲ نومبر ۱۹۶۳ء)

سوال ۹۶

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص پر عدالت میں عورت نے دعویٰ کیا ہے کہ خاوند نے مجھے طلاق دے دی ہے، لہٰذا مجھے دوسری جگہ نکاح کرنے کی قانونی اجازت عطا کی جائے۔ عدالت نے جب مدعی علیہ سے دریافت کیا کہ تم نے طلاق دی ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر عدالت نے کہا کہ یہ عورت کے بھائی کیوں کہتے ہیں کہ تم نے طلاق دی ہوئی ہے؟ تو اس نے جواباً کہا کہ اگر مسماۃ کا بھائی حلف اٹھا دے۔ کہ میں نے طلاق دی ہے تو پھر مجھے خارج کر دیا جائے۔ مجسٹریٹ کے قلمی بیانوں میں ہے کہ مسماۃ کے بھائی کے حلف اٹھانے کے بعد مدعی علیہ نے طلاق دے دی اور راضی نامہ ہو گیا۔ قطع نظر مجسٹریٹ مسلمان کے تصدیقی الفاظ کے خود مدعی علیہ کے اپنے الفاظ سے طلاق ہو جائے گی جنہیں وہ آج بھی تسلیم کرتا ہے۔ قابلِ دریافت بات یہ ہے کہ مسماۃ مذکورہ کے بھائی نے اس وقت جو حلف اٹھائی، وہ جھوٹی تھی یعنی واقعہ میں اس نے طلاق پہلے دی ہوئی نہ تھی۔ بینوا

۱۔ (مشکوۃ شریف۔ ج2 ص270)

وتوجروا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

فقہ حنفی میں ایک اصل مجمع علیہ متون وشروح ہے کہ

''**الأَيْمَانُ مَبْنِيَّةٌ عَلَى الْعُرْفِ**''، دوسرا ''**الأَيْمَانُ مَبْنِيَّةٌ عَلَى الأَلْفَاظ لا عَلَى الأَغْرَاضِ**'' یعنی حلف کا تعلق صرف الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے، اغراض کے ساتھ، نیات ومقاصد کے ساتھ نہیں ہوتا۔ عرف عام میں مندرجہ بالا دونوں اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مدعی علیہ کا یہ کہنا کہ اگر فلاں شخص حلف اٹھادے تو مسماۃ مذکورہ فارغ ہے، یا مطلقہ ہے اور اس شخص نے عدالت میں حلف اٹھادی ہے، تو ہماری عرف میں اس کا یہی مطلب سمجھا جاتا ہے کہ پھر یہ سچ کہتے ہیں اور واقعی مسماۃ مذکورہ مطلقہ ہے۔ قطع نظر مسلمان مجسٹریٹ کے الفاظ سے جن میں صراحۃً ہے کہ پھر مدعی علیہ نے طلاق دے دی۔

ان اخبرتنی اور اعلمتنی ان فلانا قدم یحنث بالصدق والکذب ...... یعنی اگر تم مجھے خبر دو کہ فلاں شخص آ گیا ہے تو پھر میری عورت مطلقہ ہے یا تم آزاد ہو اور مخاطب مذکور نے زید کے آنے کی خبر دی تو وہ تعلیق صحیح ہو جائے گی خواہ وہ خبر سچی ہو یا جھوٹی۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ العلیم۔ (۲ دسمبر ۶۳ء)

سوال ۹۷

آج کل عام رواج ہو گیا ہے کہ پونده لوگ اور عام آڑھتی صاحبان سردیوں میں غریب زمینداروں کے ساتھ غلہ کا سودا کرتے ہیں۔ اگر زمیندار نے گندم لینی ہو تو اس سے کنٹرول نرخ اور بازار کے عام بھاؤ سے دگنا، تگنا یا ایسی قیمت جو کہیں نہیں ہوتی، مقرر کر

کے گندم دیتے ہیں یا رقم نقد دیں اور غلہ لینا کریں، تو بھی ایسا کرتے ہیں کہ فصل کے موقع پر ۲۳ روپے بوری ہوتی ہے تو وہ ۱۵ روپے بوری مقرر کرتے ہیں یعنی اس قرض اور ادھار کی وجہ سے اس کا نرخ حد سے زائد لیتے ہیں۔ بعض ایک بوری گندم کے عوض دو بوری نخود لینا طے کرتے ہیں۔ یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب

وہ لوگ اسے بیع سلم سمجھتے ہیں اور عام فقہا کرام کا یہ کہنا کہ لازماً آپس میں ایک نرخ مقرر کر لیں۔ اس کا مطلب یہ سمجھیے کہ خواہ وہ غبن فاحش ہی کیوں نہ ہو۔ یہ غلط ہے ورنہ پھر سود کی ممانعت کا کوئی معنی نہیں رہتا۔ گو فقہی طور پر اس پر سود کی تعریف صادق نہیں ہوتی لیکن ایسا کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے: **نهی رسول الله ﷺ عن بیع المضطر...** ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے مجبور کی بیع سے منع فرمایا۔[1]

المضطر المحتاج الذی اضطر الی البیع لدین رکبه فالمروة ان لا یشتری منه ویعان ویقرض......

یعنی ایک آدمی اپنے افلاس کی وجہ سے مجبور ہے، اس کی چیز کی قیمت دس روپے ہے، لیکن سرِ دست اسے یہ قیمت دیہات میں وصول نہیں ہو سکتی وہاں اس چیز کا کوئی خریدار نہیں تو تم اس کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھاؤ اور اس سے وہ چیز پانچ روپے میں نہ خریدو، بلکہ اس کی مدد کرو اور اسے قرض دے دو۔ مشکوٰۃ شریف میں دوسری جگہ فرمایا کہ ماپنے تولنے والوں کو **ولیتم امر ین هلکت فیهما قبلکم الامم السابقه......** یعنی ماپ تول میں زیادتی نقصان کی وجہ سے یا مذکورۃ الصدر چور بازاریوں کی وجہ سے پہلی قومیں ہلاک ہو گئیں۔ درالمختار کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے:

۱۔ (مشکوۃ شریف۔ ج1 ص254)

الا اذا تعدى الارباب عن القيمة تعدياً فاحشاً۔ فیسعر بمشورة اهل الرائے۔۔۔

ترجمہ: جس وقت غلے والے لوگ قیمت سے واضح طور پر زیادتی کریں تو حاکم وقت صاحب بصیرت لوگوں کے مشورہ کے ساتھ نرخ مقرر کرے۔[1]

والغبن الفاحش هو ان یبیعه بضعف قیمته،

ترجمہ: غبن فاحش چیز کو دگنا قیمت کے ساتھ بیچنا ہے۔[2]

یعنی جب لوگ غلہ کی بیع شرئ میں غبن فاحش شروع کردیں، غبن فاحش کہتے ہیں کسی چیز کی ایسی قیمت مقرر کرنی جو کسی جگہ نہ ہو، تو حاکم کو چاہیے کہ وہ ایک نرخ مقرر کردے۔ آج کل تو حکومت نے اس گرانی اور ظلم کو روکنے کے لیے نرخ مقرر کررکھا ہے، پھر بھی لوگ چور بازاری اور بلیک کے نت نئے طریقے ایجاد کرلیتے ہیں اور دوہرے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

امام ابوحامد غزالیؒ کیمیائے سعادت رکن دوم معاملات کے باب میں کسب وتجارت کے آداب کے ماتحت بیع سلم کے دس شرائط ذکر فرماتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی بیان کیا ہے جو غلہ خریدنا مقصود ہو، وہ اس چیز کی قیمت سے تبدیل کیا جاسکے، یعنی وہ غلہ اتنا ہو کہ سلم کرنے والا اگر قبض کے وقت اس غلہ کو بیچنا چاہیے تو اس کی اتنی قیمت وصول ہوسکے جو اس نے پہلے دی تھی۔ اب یہاں تو مسلم الیہ کی بیخ کنی مقصود ہوتی ہے۔ اس کے جواز میں صرف وہ احادیث جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیشگی رقم ادا کرکے ایک مقررہ مقدار کھجوریں لینا مقرر کیا تھا، پیش نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ہم اصل بیع سلم کے منکر نہیں ہیں بلکہ

---

[1]۔ (درمختار۔ص663، لبنان)

[2]۔ (بحر۔ج8، ص202)

اس کی اس ظالمانہ صورت کے منکر ہیں جو آج کل مروج ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۹۸

نماز کے بعد امام سلام پھیر کر کس طرف رخ کرے؟ دائیں یا بائیں یا لوگوں کی طرف؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

یہ چیز فرائض یا واجبات یا سنن میں سے نہیں ہے۔ یہ بلکہ امام کو اختیار ہے۔ ایسی نماز کے بعد کہ نوافل نہیں ہیں، جس طرف رخ کرے یا اُٹھ کر گھر چلا جائے۔ ہاں اگر نوافل ہیں تو وہ گھر میں جا کر پڑھنے میں بہتری ہے اور مسجد میں پڑھے تو جگہ بدل لے تا کہ اوپر سے آنے والا یہ نہ سمجھے کہ ابھی تک جماعت ہو رہی ہے۔ ہاں بیٹھنے کی صورت میں دائیں طرف افضل ہے یعنی قبلہ شریف امام کے دائیں طرف ہو اور متقدی بائیں طرف ،تو ہمارے ہاں یہ رخ جنوب کی طرف ہوگا۔[1]

درالمختار میں ہے: **و فی الخانية يستحب للامام التحول ليمين القبلة يعنی يسار المصلی لتنفل او وِرد وخيره فی المنية بين تحويله يمينا و شمالاً واماما و خلفا، وذهابه لبيته واستقباله الناس بوجهه ولو دون عشرة۔**

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ یمینا پھرنا افضل ہے جیسا کہ مسلم شریف کی روایت ہے، صاحب بدائع نے دونوں جانب کو برابر سمجھا ہے۔ صاحب درالمختار نے جو شرط لگائی ہے کہ

ا۔(فتاوی شامی۔ باب صفۃ الصلوٰۃ، ج1 ص372)

اگر دس آدمی یا دس سے زیادہ ہوں تو امام لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے کیونکہ قبلہ شریف سے مومن کی شان بلند ہے لیکن دس سے کم کی صورت میں بھی استقبال بہتر ہے۔

علامہ شامیؒ اس کے ماٰخذ ''شراح مقدمۃ'' پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: **فان هذا الذی ذکره لا اصل له فی الفقه وهو رجل مجهول والذی رواه موضوع۔ کذب علی النبی** ﷺ **بل حرمة مسلم واحد ارجح من حرمة القبلة**، الخ...... لیکن ایک نمازی تو امام کے نہ پھرنے کی صورت میں دائیں رہ جائے گا۔ ہاں دو ہوں تو پھر ان کی طرف رخ کر کے بیٹھنا چاہیے۔ لیکن صحیح وہی بات ہے کہ امام مختار ہے۔ آنحضرت ﷺ کبھی دائیں اور کبھی بائیں منہ پھیر کر بیٹھا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان صحابہؓ پر ناراض ہوتے جو ایک طرف کا الزام فرماتے تھے کیونکہ اس سے دوسری طرف نہ پھیرنا خلاف سنت محسوس ہوتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف باب الصلوٰۃ میں تین حدیثیں اکٹھی مذکور ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے تینوں حالتوں پر عمل فرمایا ہے۔ دائیں، بائیں اور لوگوں کی طرف منہ کر کے...... لہٰذا یہ بات امام کی سہولت پر موقوف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳ جولائی ۶۴ء)

سوال ۹۹

(میلاد شریف کے جواز کے بارے میں)

حضرت خواجہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت دوست محمد قندھاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیر تھے اور حضرت خواجہ دوست محمد صاحب، حضرت خواجہ عثمان صاحب موسیٰ زئی شریف والوں کے پیر تھے، اور حضرت خواجہ عثمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مولوی حسین علی ساکن واں بھچراں بانیء وہابیت کے مرشد تھے، اس لیے یہ استفتاء ایک خاص نوعیت کا حامل ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اخوی اعزی ارشدی حاجی صاحب زیر ارشادہ وسلمہ ربہ از فقیر احمد سعید عفی عنہ۔

بعد از سلام مسنون دعواتِ ترقیات مشحون مطالعه نمایند الحمد لله که تاتحریرِ احوال فقراء ایں حدود بجمعیت مقرون است۔ المسئول من الله سبحانه سلامتکم واستقامتکم و ترقی ارشاد کم چوں دریں ایام استفتاء مولود شریف خواندن نزد فقیرو اردگردیده بود کلمهء چند در جواب مرقوم گشته بود نقلش ضروری دانسته مهرر نموده شد۔ ذکر مولود شریف واخلاق لطیف و معجزات ووفات منیف وحلیه مبارک جناب مستطاب حضرت محبوبِ رب العالمین سید الانبیاء والمرسلین ﷺ بعینهٖ ذکر خالق السمٰوات والارضین است جل جلاله و عم نواله و ذکر حق سبحانهٗ و تعالیٰ واجب لقوله تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوا اللّٰهَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا وَسَبِّحُوۡهُ بُکۡرَةً وَّ اَصِیۡلًا لان الامر للوجوب عند الاکثر کما صرح به فی الاصول قال فی التوضیح والوجوب عند اکثرهم لقوله تعالیٰ فلیحذر الذین یخالفون عن امره ان تصیبهم فتنه او یصیبهم عذاب الیم تصیبهم من هذا الکلام خوف اصابته الفتنه او العذاب لمخالفة الامرء اذلو لاذلک الخوف بقیح التحذیر فیکون الامر واحبا اذ لیس علی ترک غیر الواجب خوف الفتنة او العذاب ودلیل بران امرکه ذکر عالی حضرت سرورِ کونین مرسلین ﷺ بعینهٖ ذکر حق سبحانه است حدیث شریف است روی ابو

سعید خدری ان النبی ﷺ قال اتانی جبرائیل علیه السلام فقال ان ربی وربک یقول تدری کیف رفعت ذکرک فقلت اللّٰہ و رسولہٗ اعلم قال اذا ذکرت ذکرت معی۔ قال ابن عطا جعلت تمام الایمان بذکری معک۔ و قال ایضاً جعلتک ذکرا من ذکری فمن ذکرک ذکرنی۔ پس ھر کسے که از ذکر مولود شریف مانع باشد وآندا مکروہ و حرام گوید۔ کالفرقة الوھابیة دشمن خدا و رسول است ومورد وعید ان تصبیھم فتنة او تصیبھم عذاب الیم۔ است الحذر الحذر عن رویتھم و عن صحبتھم۔ والسلام اولاً وآخراً۔

ترجمہ: سلام مسنون کے بعد دعا کی بدولت تمام معاملات الحمدللہ تا وقت تحریر بہتر ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تم تمام کی سلامتی اور استقامت وترقی کی دُعا کرتا ہوں۔ چونکہ ان ایام میں فقیر کو میلاد شریف کے متعلق استفتاء پڑھنے کا موقعہ ملا چند کلمے جواب میں لکھے ہوئے تھے اس کی نقل ضرورت کے مطابق پیش کر دی گئی آپ کے معجزات اور خوبصورت اخلاق وحلیہ مبارک کا ذکر ہی میلاد شریف ہے اور بعینہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذکر فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۔

اذکرو صیغہ امر ہے اور اکثر اصولی حتی کہ علماء صاحب توضیح نے لکھا ہے کہ امر وجوب کے لیے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنه او یصیبھم عذاب الیم

ترجمہ: وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں وہ فتنہ یا دردناک عذاب سے ڈریں اس کلام سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب یا فتنہ پہنچنے کا خوف اللہ تعالیٰ کے امر کی وجہ سے ہے لہٰذا ایسے لوگوں کو ڈرانا واجب ہے وگرنہ واجب کے علاوہ کے ترک پر تو

فتنہ یا عذاب کی وعید نہیں ہوتی دوسری بات یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ذکر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے کہ حضرت ابوسعید خدری کا فرمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میرا اور آپ کا رب فرماتا ہے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کا ذکر کیسے بلند کیا تو میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جہاں میرا ذکر ہوگا وہاں آپ کا ذکر ہوگا حضرت ابن عطاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ حضور کے ذکر کو ایمان کی تمامیت قرار دیا ہے اور فرمایا کہ میں نے آپ کے ذکر کو اپنا ذکر بنایا گویا کہ جس نے آپ کا ذکر کیا اس نے میرا ذکر کیا تو وہ ہر شخص جو حضور کے ذکر سے منع کرتا ہے اور اس کو مکروہ اور حرام کہتا ہو جس طرح کہ فرقہ وہابیہ وہ شخص **ان تصیبهم فتنة او یصیبهم** کی وعید وارد ہونے کی وجہ سے اللہ اور رسول کا دشمن ہے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیسا پاکیزہ عقیدہ تھا ان بزرگوں کا اور پھر انہی کے مریدین ہی آج کل عقیدۂ وہابیہ نجدیہ کی معاونت اور اشاعت میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

ع انقلابات ہیں زمانے کے

سوال ۱۰۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ہمارے شہر میں جہاں سات سو نفوس کی آبادی ہے، بارہ تیرہ دکانیں بھی ہیں، ضروریاتِ زندگی بہ آسانی میسر آسکتی ہے، وہاں ابتدا سے دو جگہ جمعہ ادا کیا جاتا ہے لیکن اب ایک امام صاحب جو پہلے ہماری مسجد میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور اب علیحدہ کر دیے گئے ہیں، نصف فرلانگ کے فاصلے پر دوسری مسجد

میں اذان دے کر نمازِ ظہر با جماعت ادا کرتے ہیں۔ اکثر اہلِ علم کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا مکروہِ تحریمہ ہے۔ کیا ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز ہے؟ (سائل از سورگ، پنڈی گھیپ)

جواب

باتفاق فقہ حنفیہ مصر کے لیے مفتی یا قاضی کا ہونا ضروری علامت ہے تاکہ معاملات شرعیہ میں اس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ اور ظاہر ہے کہ وہاں ایسا نہیں ہے۔

کنزالدقائق میں ہے: **کرہ للمعذور و المسجون اداء الظهر بجماعة فی المصر**۔ ترجمہ: معذور اور قیدی کے لیے شہر میں ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے۔[1]

کرمانی لکھتے ہیں: **لا فی القریة ولو بعد فراغ الامام**۔ گویا بستیوں میں ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے لیکن جہاں جمعہ ہمیشہ سے ادا کیا جاتا ہے، وہاں ضد اور منافرت کے لیے ایسا کرنا یقیناً کراہت سے خالی نہیں ہے۔ ایسے امام صاحب کی تفہیم لازم ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

سوال ۱۰۱

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ زید فوت ہو گیا ہے اور تین بیویاں ایک حقیقی چچا اور دو پھوپھیاں ایک عینی اور ایک خیفی۔ کیا ان پھوپھیوں کو حصہ ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو برابر یا کوئی فرق ہے؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ

(سائل پیر وارث شاہ، از عیسیٰ خیل)

۱۔ (کنزالدائق۔ ص57)

جواب

پھوپھیاں دوقسم	چچا حقیقی	بیویاں
محروم	بقیہ	۱/۴

بیویان ذوالفروض ہیں، چچا عصبہ ہے اور پھوپھیاں ذوی الارحام ہیں، لہٰذا پہلے دونوں کی موجودگی میں ذوئی الارحام کو کچھ نہیں مل سکتا۔ ملاحظہ ہو رہنمائے وراثت مصنفہ قاضی میراں بخش ڈیروی ص ۵۵۔ اور رسالہ ءمیراث مولانا عبیداللہ صاحب ملتانی ص ۱۹

سوال ۱۰۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید نے گائے ذبح کی عقدہ سے اوپر اور سر جدا کر دیا۔ دوسرے آدمی نے مطلع کیا کہ عقدہ تو دھڑ کی طرف چلا گیا ہے۔ اس نے دوبارہ چھری سے عقدہ جدا کر کے پھینک دیا۔ کیا اس طریقہ سے جانور حلال ہو جائے گا یا حرام؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔ سائل کو حاکم شہید کی عبارت سے بعض علماء نے شبہ ڈالا ہے کہ حلال ہے۔ جو شامیؒ نے ذکر فرمائی ہے، اس کی تفصیل بھی ذکر فرمائیں۔

جواب

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے تمہیداً پہلے دو باتیں جزوی طور پر سمجھ لینی چاہئیں۔ اول، فقہا حیات اور زندگی کسے تعبیر کرتے ہیں۔ دوم حلت اور ذکاۃ شرعی کے لیے کتنی رگیں کاٹنا شرط ہے۔

حیات تین قسم ہے۔ اول، حیاتِ حقیقی جو ذبح سے پہلے جانور کو حاصل ہے جس سے وہ چل پھر سکتا ہے، کھا پی سکتا ہے، جسے ہر شخص عقلاً سمجھتا ہے۔ دوم، حیاتِ حکمی، یہ وہ ہے جو

جانور کو کسی جگہ زخم لگ جانے کے بعد اسی طرح کہ اس سے اس کی سلامتی اور بچ جانے کی امید ہو، علاج معالجے سے زندگی متوہم ہو۔

ہدایہ شریف میں ہے: **وکذا حکما لانہ تتوھم سلامتہ بعد ھذا الجراحة وھذا اعتبرہ الشرع** ۔ترجمہ: حکمی طور پر وہ زندہ ہے کیونکہ اس کے زخم کے بعد بھی اس شکار کی سلامتی کی امید ہے اس لیے شریعت نے اس حیات کا اعتبار کیا ہے۔[1]

سوم، حیات مذبوحی، جسے اضطراب اور حرکت سے تعبیر کرتے ہیں جو جانور ذبح ہو جانے کے بعد اس میں کافی دیر تک موجود رہتی ہے۔

ہدایہ شریف میں ہے: **بان لایبقی فیہ من الحیوۃ الا بقدر مایبقی فی المذبوح**

ترجمہ: اس میں اتنی ہی زندگی باقی ہو جتنی ذبح شدہ جانور میں رہتی ہے جیسے اس کا سر جدا کر دیا ہو اس لیے کہ اس کا وجود اور عدم برابر ہے۔[2]

(اے بعد الذبح للاضطراب) کما اذا بان رئوسہ . . . لان وجودہ وعدم بمنزلة ...... کسی جانور کو دوبارہ ذبح کرنے کے لیے حیاۃ حکمی ضروری ہے نہ کہ حیاتِ ثالث کیونکہ فقہا کے نزدیک اس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔

درالمختار میں ہے: **لان مابقی من الحیوۃ غیر معتبر اصلا** ۔[3]

بزازیہ۔ بعض جہال اس تیسری قسم کو روح اور زندگی کی موجودگی سے تعبیر کر لیتے ہیں اور دراصل منشاء غلطی اس میں فرق نہ کرنا ہے۔

---

[1]۔(ہدایہ شریف۔ج 4 ص 515)

[2]۔(ہدایہ شریف۔ج 4 ص 516)

[3]۔(درمختار۔ص 104)

دوم، جانور کی ذبح صحیح کے لیے تین رگوں کا کاٹنا بالاتفاق شرط ہے اور فوق العقدۃ ذبح ہونے دو رگیں مری اور حلقوم سالم رہ جاتی ہیں۔

بحر الرائق میں ہے: **المذبح المری والحلقوم والودجان لما روی عنه علیه السلام انه قال اوفر الاوداج بما شئت؛ وهی عروق الحلق فی المذبح والمری مجری الطعام والشراب والحلقوم مجری النفس والمراد من الاوداج کلها واطلق علیه تغلیبا؛ وانما قلنا ذلک لان المقصود یحصل بقطعه وهو ازهاق الروح واخراج الدم لانه بقطع المری والحلقوم یحصل الازهاق و بقطع الودجین یحصل انهار الدم وقطع الحلقوم والمری واحدیٰ الودجین والاکتفاء بالثلث مطلقا هو قول الامام وقول ابی یوسف اول وعن ابی یوسف انه یشترط قطع الحلقوم والمری احدالودجین وعن محمد لا بدمن قطع الاکثر من کل واحد من هذه الاربعة**، الخ......

ترجمہ: ذبح کرنے کی جگہ مری، حلقوم اور ودجین ہیں آپ علیہ السلام کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جس چیز سے چاہو اوداج (رگوں) کو کاٹو اور وہ حلق کی رگیں ہیں۔ اور مری وہ نالہ جس میں سے دانہ پانی کا گزر ہوتا ہے۔ اور حلقوم سانس کی نالی ہے اور اس سے مراد تمام کی رگیں ہیں اور اس پر تغلیبا اطلاق کیا گیا ہے اور ہم نے یہ بات اس لیے کہی ہے کیونکہ مقصود جو کہ روح کا نکلنا اور خون کا نکلنا ہے وہ ان رگوں کے کاٹنے کے ساتھ حاصل ہوتا ہے کیونکہ مری اور حلقوم کے کٹنے کے ساتھ روح کا نکلنا حاصل ہوتا ہے کیونکہ مری اور حلقوم کے کٹنے کے ساتھ روح کا نکلنا حاصل ہوتا ہے۔ اور ودجین کے نکلنے کے ساتھ خون کا نکلنا حاصل ہوتا ہے اور تین رگوں کا کٹنا یہ کافی ہے۔ اور تین رگوں پر اکتفاء امام صاحب کا مذہب ہے اور امام ابو یوسف صاحب کا پہلا قول یہی ہے اور امام ابو یوسف صاحب سے

مروی ہے کہ ان کے نزدیک مری حلقوم اور ودجین میں سے ایک کا کٹ جانا ضروری ہے اور امام محمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے کہ ان چار میں سے اکثر کا کٹ جانا ضروری ہے۔[1]

بعض لوگوں کو مسئلہ مذکورہ الصدر میں حاکم شہید کی اس عبارت سے غلطی واقع ہوئی ہے جو شامی نے ذکر فرمائی ہے: **قال الحاکم الشهيد هذا التفصيل ليصح فيما اذا قطعه بدفعتين فلو بدفعة فلا حاجة اليه**[2]...... دراصل صاحب الدر نے ایک مسئلہ ذکر فرمایا ہے کہ گردن کی طرف سے جانور کو ذبح کرنا مکروہ ہے لیکن اگر رگوں تک چھری پہنچنے تک جانور زندہ ہو تو حلال ہو جائے گا ورنہ نہیں لیکن یہ مکروہ ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں کہ ابوبکر اعمش نے ان بقیت حیۃ کے ماتحت لکھا ہے کہ یہ تفصیل اس وقت صحیح ہوگی جب جانور قطع عروق سے قبل اس سے زیادہ زندہ ہو جیسا کہ تیسری قسم کی حیات جانور میں ہوتی ہے۔ کما مر تفصیلہ۔ حتیٰ کہ وہ قطع عروق سے حلال ہو سکے کیونکہ حلت کا تعلق قطع عروق سے ہے اور قطع عروق کے وقت حیاتِ حقیقی یا حکمی کا وجود ضروری ہے۔ ورنہ حیاتِ ثالثہ کا وجود و عدم برابر ہے۔ وہ جانور حلال نہ ہوگا کیونکہ وہ ذبح حقیقی سے پہلے مر چکا ہے۔ حاکم شہید فرماتے ہیں کہ صاحب الدر اور ابوبکر صاحب کی یہ تفصیل اس صورت میں صحیح ہے کہ پہلی دفعہ ذبح کرنے سے چھری قطع عروق نہیں کر سکی تو دوسری دفع قطع عروق کے لیے حیاتِ حقیقی یا حکمی ضروری ہے۔ اور اگر ایک ہی دفعہ چھری چلائی تو چھری رکھنے کے وقت حیات کا وجود ضروری ہے۔ قطع عروق کے وقت حیات کا کوئی اثر نہ ہے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

هذا فهمت من كلام هولاء الاعلام

---

[1]۔ (بحر الرائق۔ ج 8 ص 170)

[2]۔ (فتاوی شامی۔ ج 5 ص 192)

ہدایہ شریف میں ہے: **و ان ذبح الشاة من قفاها فبقیت حیة حتی تقطع العروق۔ حل لتحقق الموت بما هو ذکاة ویکره لان فیه زیادة الالم من غیر حاجة فصار کما اذا جرحها ثم قطع الاوداج وان ماتت قبل قطع العروق لم توکل لوجود الموت بمالیس بذکاة فیها** ......

ترجمہ: اگر گدی کی طرف سے کسی نے بکری ذبح کی پھر وہ زندہ رہی یہاں تک کہ ذابح نے رگیں کاٹ دیں تو وہ حلال ہے اسی لیے کہ موت اس چیز سے واقع ہوئی جو ذبح ہے اور یہ فعل مکروہ ہے کیونکہ اس میں بلاضرورت تکلیف کی زیادتی ہے تو یہ ایسا ہو گیا جیسے کسی نے بکری کو زخمی کرنے کے بعد اس کی رگیں کاٹی ہوں اور اگر رگیں کاٹنے سے پہلے بکری مرگئی تو وہ نہیں کھائی جائے گی اس لیے کہ موت اس چیز سے واقع ہوئی ہے جو بکری میں ذبح نہیں ہے۔[1]

اب رہا یہ مسئلہ کہ علامہ شامیؒ ذبح مافوق العقدۃ کو حلال کہتے ہیں۔ یہ اتنا سفید جھوٹ ہے جیسا کہ دن کو رات کہنا۔ علامہ شامی نے فقہا کے ہر دو اقوال کو نقل فرمانے کے بعد یعنی ذیلعی اور ان کے موافق اور استغنیٰ اور ان کے موافقین، اپنی تحقیق اس طرح نقل فرمائی ہے،

اقول والتحریر للمقام ان یقال ان کان بالذبح فوق العقدة حصل قطع ثلاثة من العروق۔ فالحق ماقاله شرح الهدایة ۔ تبعا للرستغنی والافالحق خلافه اذلم یوجد شرط الحل۔ باتفاق اهلِ المذهب و یظهر ذلک بالمشاهدة او سوال اهلِ الخبرة، الخ......

ترجمہ: مقام کی وضاحت یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر گھنڈی سے اور ذبح میں تین رگیں کٹ گئی ہوں تو شروع ہدایہ میں رستغنی کی اتباع میں جو کہا وہ حق ہے ورنہ حق اس کے

[1]۔(ہدایہ۔ج 4 ص 438، مطبوعہ اسلامی کتب خانہ)

خلاف ہے۔ کیونکہ اہل مذہب کی متفقہ شرط برائے حلت نہ پائی گئی یہ معیار مشاہدہ سے یا ماہرین کی بتانے پر ظاہر ہوئی۔[1]

اب انصاف فرمایئے کہ مشاہدہ اور تحقیق سے قطعاً یہ بات ثابت ہے کہ مری اور حلقوم عقدہ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اکثر کا انقطاع کس طرح ہوا جو حلت کے لیے بالاتفاق شرط ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے خود بھی کبھی مشاہدہ نہیں فرمایا۔ کتنی سچی بات تحریر فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں نیک جزا عطا فرمائے اور آج کل کے حرام حلال ملا کر کھانے والے جہال کو ہدایت کی راہ نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

سوال ۱۰۳

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید نے کہا کہ اگر میری شادی حسبِ خواہش نہ ہوئی تو میں سابقہ منکوحہ سے شادی کروں تو وہ مجھ پر طلاق، ایک دفعہ تو یقیناً کہا، شاید دو دفعہ کہا ہو، پھر کسی موقع پر کہا کہ میں منکوحہ کے بھائیوں سے صلح کروں تو مجھ پر طلاق۔ منکوحہ سے ابھی شادی نہیں ہوئی۔ کیا ایک طلاق واقع ہو گی یا تین؟ وہ غیر مدخولہ ہے۔ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل از موسیٰ خیل، ۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء)

جواب

چونکہ اس کی منکوحہ غیر مدخولہ ہے، صرف ایک طلاق سے بائن ہو جائے گی۔ لہٰذا صلح کرنے سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ شادی سے طلاق واقع نہ ہو گی۔ باقی لغو ہو جائیں

---

[1]۔ (ردالمختار۔ ج5 ص193)

گی۔شادی کے ساتھ جو متعلق ہے، وہ سابقہ منکوحہ سے متعلق ہے، وہ نکاح رہا ہی نہیں۔ ویسے ہماری عرف میں شادی رخصتی کو کہتے ہیں۔اس لیے رخصتی کے بعد دلہن کو گھر لا کر تجدید نکاح کرے تو وقوع ثانی کا احتمال بھی نہ رہے گا۔واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۱۰۴

ایک شخص نے کہا کہ اگر میں ''نونہہ'' منالاؤں یا اپنے گھر میں چھوڑوں تو مجھ پر میری عورت تین طلاق...... کسی عالم نے بتایا ہے کہ وہ مکان اپنے لڑکے کے ملک کر دے اور پھر اس گھر میں ''نونہہ'' آجائے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔کیا حکم ہے؟

(سائل از موسیٰ خیل، میانوالی)

جواب

اگر حالف خود منا کر نہ لائے اور اس گھر کو منانے سے پہلے لڑکے پر فروخت کر دے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔صرف ہبہ یا تملیک سے کام نہ چلے گا۔خلاصۃ الفتاوی میں ہے:

ولو حلف لا يدخل دار فلان هذه فباع فلان الدار فدخل الحالف لا يحنث ۔

ترجمہ: کسی شخص نے قسم اٹھائی کہ فلاں کے اس گھر میں داخل نہیں ہوں گا پھر فلاں نے اس گھر کو بیچا پس قسم اٹھانے والا داخل ہوا تو حانث نہ ہوگا۔[1]

سوال ۱۰۵

آج بروز ۱۰ اگست ۱۹۶۵ء کو مسمی نور احمد ولد غلام حسین مجنون مفقود نے حلفیہ بلفظ

---

[1]۔(خلاصۃ الفتاوی۔ج 2 ص 167، فصل فی الیمین والدخول)

اشہد بیان کیا کہ عرصہ چار سال سے غلام حسین مذکور لا پتہ ہے۔اگر کہیں وہ زندہ ہوتا تو کوئی تو ہمیں بتلاتا۔مزید برآں وہ اس سے قبل عرصہ چار سال سے سخت پاگل تھا جسے بالکل کپڑے لتے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔اگر وہ یہاں ہوتا تو بھی شادی کے قابل نہیں تھا۔لہٰذا میں اس بات پر راضی ہوں کہ میری بھتیجی مسماۃ مہر خاتوں کا دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے۔مجھے کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے۔مسماۃ مذکورہ اس معاملہ میں سخت مظلوم ہے اور یہی درخواست مسماۃ مذکورہ کے بھائی میاں محمد اور دوسرے خورد نے بھی دی۔شرعاً ہمیں اجازت دی جائے۔

جواب

چونکہ غلام حسین مذکور کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ چار سال سے بالکل لا پتہ ہے اور اس سے قبل وہ جب یہاں موجود تھا، تب بھی وہ سخت پاگل تھا۔لہٰذا مجنون کی بیوی مفتی شرعی سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔قاضی کا فسخ طلاق کا حکم رکھتا ہے۔اور شادی نہ ہونے کی وجہ سے اس فسخ کی کوئی عدت نہ ہوگی۔لہٰذا میں ثالث فریقین ہونے کی وجہ سے مسماۃ مذکور کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ جہاں چاہے، نکاح کر لے۔

سوال ۱۰۶

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص زید کی بیوی نے اپنے بھائی کو مجبوری کی وجہ سے دودھ پلایا ہے۔اس کا خاوند باہر نوکری پر تھا۔اس سے اجازت نہیں لی گئی۔واپس آنے پر اس نے ناراضی ظاہر نہیں کی۔پھر دودھ پینے والے لڑکے نے بڑے ہو کر شادی کی اور ایک لڑکا، لڑکی اور بیوی کو چھوڑ کر فوت ہو گیا۔زید ان تینوں کو اپنے گھر لے

آیا اور اس لڑکے کی بیوی کو بیٹی کہتا رہا۔ اس کی عورت کو کچھ شک گزرا تو اس نے جھٹ قرآن اس کے سر پر رکھ کر حلف اٹھائی کہ میرا اس کے ساتھ تعلق ہمدردانہ ہے صرف بے آسرا ہونے کی وجہ سے۔ اب اس نے اسی بیٹی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اس کی قسم کا کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ اس کا نکاح اس کے ساتھ جائز ہے یا نہیں؟ (سائل از کیمبل پور)

جواب

زید مذکور کا نکاح اس عورت کے ساتھ شرعاً ناجائز ہے۔ نص قطعی نے زوجۃ الابن کو حرام بتلایا ہے اور فقہا نے بالاجماع تعمیم کی ہے کہ وہ ابن حقیقی ہو یا رضاعی، دونوں کی بیویاں اس شخص پر حرام ہوں گی جس کی وجہ سے دودھ ہے۔ یہ قید عام شراح درالمختار شامی وغیرہ نے لگائی ہے۔ ویسے فقہ کا عام کلیہ اور ضابطہ ہے کہ از جانب شیردہ ہمہ خویش شوند، واز جانب شیر خوار زوجان وفروع......یعنی دودھ پلانے والی کے تمام رشتہ دار اس دودھ دینے والے کے رشتہ دار ہو جائیں گے اور پینے والا خود اور اس کی بیوی اور اولاد ان پر حرام ہوگی۔ لہٰذا ان حوالہ جات کی رو سے یہ نکاح نہیں ہوا۔ صرف زبان سے بیٹی کہتا تو نکاح کو مانع نہ تھا۔ دوم، دودھ کی حرمت کے لیے خاوند کی اجازت یا عدم اجازت کوئی موثر نہیں۔ قسم کا خلاف کرنے کے لیے دس مسکین کھلانے لازم ہیں۔ اس کی طاقت نہ ہو تو تین روزے۔ اللہ بس والباقی ہوس۔ یکم اگست ۱۹۶۵ء)

سوال ۱۰۷

مسماۃ مونداں فوت ہوگئی ہے۔ اس کی ایک لڑکی مریم بی بی ہے۔ ایک نواسہ اللہ بخش ہے۔ ایک عم زاد احمد ہے اور دو عم زاد کے لڑکے ہیں۔ ان کا والد بہت پہلے فوت ہو چکا

ہے یعنی مونداں سے پہلے۔ مسماۃ مذکورہ نے وصیت کی ہے کہ جو میری رقم جمع امانت ہے، وہ صرف اللہ بخش نواسے کو دی جائے۔ یہ تقسیم شرعاً کس طرح ہوگی؟ (سائل از ماموں کانجن)

جواب

بیٹی	چچازاد	چچازاد کے بیٹے	نواسہ
۱/۳	۱/۳	محروم	۱/۳

اللہ بخش چونکہ وارث نہیں، لہٰذا وصیت تہائی سے جائز ہوگی کیونکہ یہ وصیت مرض موت کی نہیں ہے اور اس حالت میں تہائی مال سے ہی وصیت جاری کی جائے گی۔ بیٹی ایک ہے۔ لہٰذا نصف یعنی (۱/۳) اس کا حق ہے اور نصف بقیہ (۱/۳) احمد مذکور کا۔ بھتیجے محروم ہوں گے بوجہ موجودگی اقرب کے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال ۱۰۸

جبکہ زمین مرہونہ کی اصل قیمت دس ہزار ہو اور پانچ ہزار دے کر اس کی پیداوار سے نفع اٹھایا جائے اور اصل پیداوار سے راہن کو کچھ نہ دیا جائے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

(سائل از چاہ صالح والا، ۱۴ ستمبر ۱۹۶۵ء)

جواب

۱۔ جو رہن زمین کل قیمت کے عوض رہن ہو، وہ بیع بالوفاء کہلاتی ہے، اسے اکثر فقہا نے بلاشک جائز لکھا ہے یعنی جس وقت راہن زمین کی یہ کل قیمت واپس دے دے گا، تو اسے زمین پھر بیع کر دی جائے گی۔

۲۔ جو زمین اصل قیمت سے کم پر رہن ہو اور زمین کا مالک اس سے نفع اٹھانے کی

اجازت دے دے تو بھی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے کیونکہ یہ حق العبد ہے، مالک کے بخش دینے سے بخشا جا سکتا ہے۔ سود کی طرح حق اللہ نہیں ہے کہ مالک کے اجازت دے دینے سے بھی ناجائز ہی رہے گا۔ (نمبر ۵ میں قابلِ غور بات)۔

۳۔ جس رہن زمین کی پیداوار سے کچھ حصہ مقررہ شکل میں مثلاً پانچواں چھٹا حصہ پیداوار واپس کر دیا جائے، تو بھی اس زمین سے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔

۴۔ جس رہن زمین کے عوض سالانہ زرِ رہن سے ایک مقررہ رقم ساقط کر دی جائے (کم کر دی جائے) مثلاً پانچ فیصد یا چھ فیصد، یہ بھی جائز ہے کیونکہ اس صورت میں وہ ارضی مستاجری ہی سمجھی جائے گی۔ یہ احسن اور بلا شک جائز صورت ہے۔

۵۔ زرِ رہن واپس لیتے وقت کچھ غیر مقررہ رقم اس منافع کے عوض مالک سے کم کر دی جائے یا اسے واپس کر دی جائے، یہ بھی جائز ہے۔

یہ صورتیں زمین مرہونہ سے نفع حاصل کرنے کی جائز ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ زرِ رہن سے راہن نے فائدہ اٹھایا ہے، یہی رقم وہ رقم والا کسی تجارت میں لگا دے تو یقیناً کم و بیش اسے نفع حاصل ہو سکتا ہے اور ارضی کا نفع محتمل ہے، کسی سال فصل ہوتا ہے کسی سال مالیہ بھی جرمانہ ہو جاتا ہے۔ یہ حق العبد ہے۔ سود کی طرح حق اللہ نہیں ہے۔

زیادہ زیادہ صورتِ مسئولہ میں کراہت ہے، حرمت نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ شریف، شامی اور مولوی عبدالحیی لکھنوی کا رسالہ انتفاع بالمرہون۔ والعلم عنداللہ۔

سوال ۱۰۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید اپنی لڑکی کو جنگل سے شہر میں اس لیے لایا ہے کہ اس کا نکاح پڑھا دے۔ ماں اور بھائی بھی ساتھ تھے۔ زید کا ایک داماد اس

رشتہ سے مانع تھا۔ چنانچہ وہ اس لڑکی اور اس کی ماں کو اپنے گھر لے گیا۔ رات کو زید نے اپنے لڑکے کی موجودگی میں نکاح پڑھا دیا۔ نکاح خوان نے جا کر لڑکیوں سے اجازت طلب کی تو کسی لڑکی نے اجازت دے دی۔ ان کا کہنا ہے کہ زید کی لڑکی وہاں موجود نہ تھی۔ لیکن صبح کو وہی نکاح خوان رجسٹر نکاح پر نشان انگوٹھا ثبت کرانے کے لیے گیا تو ماں نے اس لڑکی کو بلایا جو گھر میں جھاڑو دے رہی تھی تو اس نے آ کر بخوشی انگوٹھا لگا دیا۔ کسی قسم کا رد یا انکار نہیں کیا اور بعد میں دو تین عیدوں کے کپڑے بھی رواج کے مطابق پہن لیے۔ کیا شرعاً نکاح ہو گیا ہے یا نہیں؟ (سائل از قائد آباد، دوم از رسول نگر)

جواب

نکاح ہو گیا ہے۔ فتاوی شامی میں ہے: **فان استاذنها هو او وكيله او رسوله**

ترجمہ: اگر اس سے ولی، وکیل یا قاصد نے اجازت مانگی۔[1]

و ان زوجها بغير استئمار فقد اخطاء السنة وتوقف على رضاها (بحر عن المحيط)۔

ترجمہ: اگر اس کا نکاح اجازت کے بغیر کیا تو یہ سنت کے خلاف ہے اور عورت کی رضا مندی پر موقوف ہوگا۔[2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں: **اوزوجها وليها واخبرها رسوله او فضولی عدل سكتت عن رده مختارة ولو بكت بصوت لم يكن اذنا ولا ردا حتى لو رضيت بعده انعقد۔**

ترجمہ: یا اس کا نکاح اس کے ولی نے کیا اور اس کو اس کے قاصد نے یا عادل فضولی

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ ج2 ص324)

[2]۔ (فتاوی شامی۔ ج2 ص324)

نے خبر دی پھر اس نے نکاح کو رد کرنے سے اختیاری طور پر سکوت کیا اور اگر آواز کے ساتھ روئی تو یہ نہ تو اذن اور نہ ہی رد ہوگا یہاں تک کہ اس کے بعد اگر راضی ہوگئی تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔[1]

تیسری جگہ فرماتے ہیں: **لو استاذ نها فی معین فردت ثم زوجها منه فسکتت صح فی الاصح**

ترجمہ: اور اگر اس سے کسی معین شخص کے لیے اجازت طلب کی تو اس نے نکاح کو رد کر دیا پھر دوبارہ اسی شخص سے نکاح کیا تو اصح قول کے مطابق نکاح صحیح ہے۔[2]

قال ولا فرق بینهما الی الثیب والبکر البالغة الا فی السکوت لان رضاهما یکون بالدلالة کما ذکره بقوله او هو مافی معناه من فعل یدل علی الرضا۔

مندرجہ بالا شواہد سے واضح ہے کہ مسماۃ مذکورہ کا نکاح ہوگیا ہے جبکہ رد یا انکار موجود نہیں ہے اور فعلاً رضا موجود ہوگئی ہے۔ لہٰذا کوئی شک باقی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب (۱ رمضان ۱۳۸۵ھ)

سوال ۱۱۰

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ میں خطیب ہوں اور خطبہء جمعہ میں عربی میں خطبہ مسنونہ پڑھ کر کسی آیت یا حدیث کا مفہوم اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہوں۔ ایک مولوی صاحب سختی سے اس کی ممانعت ومخالفت کرتے ہیں اور فقہی دلائل سے کافی

---

[1] ۔(فتاوی شامی۔ج 2 ص 324)

[2] ۔(فتاوی شامی۔ج 2 ص 325)

فہمائش کی گئی ہے لیکن وہ نہیں مانتا۔ گولڑہ شریف سے فتویٰ طلب کیا تھا، وہاں کے مفتی فیض احمد صاحب نے فتویٰ بھی لکھا ہے اور آپ کی نشاندہی کی ہے کہ تفصیلاً اُن سے جواب طلب کریں۔ لہٰذا قلمی ہے کہ مفصل جواب سے مسرت بخشیں۔

(سائل از ڈھڈیال، تحصیل چکوال ضلع جہلم، ۶ جون ۱۹۶۶ء)

جواب

مولانا المکرم زید مجدکم! میری فہمِ نارسا اور عقلِ ناقص کی جہاں تک دسترس ہے، ایسا جان پڑتا ہے کہ ابتداء میں غیر عربی میں خطبہ پڑھنے یا کسی عجمی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کی ممانعت ابنِ تیمیہ نے کی ہے اور اس کے متعلق ایک رسالہ اقتضاء الصراط المستقیم لکھا ہے۔ ہندوستان میں غالباً یہ مسئلہ دوبارہ اس وقت چھڑا ہے جب شاہ رفیع الدین صاحب و دیگر دہلوی حضرات نے قرآن کریم کا ترجمہ بزبانِ اردو کیا ہے لیکن ان لوگوں نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر اس مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ آج تمام دنیا اس کی درستی کی قائل ہے۔ ہمارے فقہا میں سے مولوی عبدالحیی صاحب لکھنوی نے اس کی ممانعت میں ایک رسالہ مسمیٰ بہ ''آکام النفائس'' لکھا ہے جس میں زیادہ تر وہی باتیں لکھی ہیں جو ابنِ تیمیہ نے اپنی کتاب میں کہی ہیں۔ اس میں ان باتوں کو مقصد اور محور قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ زبان عربی کی قرآن واحادیث میں فضیلت وارد ہے۔

۲۔ صحابہ کرامؓ نے باوجود اعاجم پر حکومت وتسلط حاصل کرنے کے عجمی سننے والوں کے لیے اس کا اہتمام نہیں کیا حالانکہ اس کی ضرورت تھی۔ لہٰذا یہ بدعت ہے اور **وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ**۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے عجمی بولنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

لا تتعلّموا رطانة الاعاجم۔

۴۔ یہ چیز یعنی عجمی زبان میں خواہ فارسی ہو یا اردو، ترجمہ کرنے سے عربی سیکھنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

اولاً، ان دونوں رسائل میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کا تعلق فقہ کی کسی کتاب کے حوالہ سے ہو، یا کسی حدیث میں تذکیر ووعظ بزبان عجمی کہنے کی ممانعت کی گئی ہو۔

ثانیاً ان دونوں رسائل میں جس شئے کی ممانعت کی گئی ہے، وہ تمام خطبہ عجمی زبان میں پڑھنا یا صرف خطبہ مسنونہ کا عجمی زبان میں ترجمہ کر دینے سے متعلق ہے۔ اور ما نحن فیہ میں متنازع فیہ یہ چیز نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خطبتین مسنونہ با قاعدہ طریق پر پڑھ کر کسی آیت یا حدیث کا ترجمہ اپنی زبان میں سننے والوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جائز ہے یا نہ؟ اور ظاہر ہے کہ مانعین حضرات نے اس پر کوئی قوی دلیل قائم نہیں فرمائی۔ ان کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں خود مجتہد ہیں، کسی امام کی تقلید درست نہیں سمجھتے جیسا کہ عام طور پر مولوی عبدالحیی صاحب کے متعلق علمائے ہند کا رجحان ہے۔ اور ابن تیمیہ صاحب تو ماشاءاللہ کسی معاملہ میں بھی تقلید کے قائل نہیں تھے۔ اگر ان کی بات صحیح تسلیم کی جائے تو پھر ان کے تمام فتوے اور دینی تقاریر ومواعظ عربی زبان میں ہونے چاہئیں تھے کیونکہ اس میں وہ سب قباحتیں موجود ہیں جو انہوں نے ترجمہ وغیرہ یا دورانِ خطبہ غیر عربی میں کسی آیت کے یا حدیث شریف کے ترجمہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ **فوا اسفا علی مافرطنا**

بدائع والصنائع میں ہے: **اما کیفیة الخطبة و مقدارها فقد قال ابو حنیفة ان الشرط ان یذکر اللہ تعالیٰ علی قصد الخطبة کذا نقل عنه فی الابالی مفسدا قل الذکر ام کثیر حتیٰ لو سبح اوهلل او حمد اللہ تعالیٰ علی قصد الخطبة اجزاه وقال ابو یوسف وهی الشرط ان یاتی بکلام یسمی خطبة فی**

العرف،اھ......

ترجمہ: بہرحال خطبہ کی کیفیت اور مقدار اس بارے میں امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر خطبہ کے ارادے پر شرط ہے چاہے ذکر کم ہو یا زیادہ ہو یہاں تک کہ اگر سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ خطبہ کے ارادے پر پڑھا تو خطبہ صحیح ہے۔اور امام ابو یوسف صاحب کے نزدیک خطبہ کے اندر شرط ہے کہ ایسا کلام ادا کرے جس کو عرف عام میں خطبہ کہا جائے۔[1]

آگے لکھتے ہیں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو طریقے ہیں۔ایک وجوب وہ ہے **مطلق ذکر لقوله تعالیٰ فاسعوا الی ذکر الله**۔لہٰذا ذکر طویل کی قید بھی درست نہیں ہے۔

دوم ذکر اللہ کو مقید کیا جائے، اس کے ساتھ جسے عرف میں خطبہ کہا جاتا ہے اور خطبہ عرف میں اس کلام پر بولا جاتا ہے جس میں سامعین و حاضرین سے خطاب موجود ہو۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ پہلے دن جب خطبہ کیلئے کھڑے ہوئے، تو ان پر مجمع کا رعب طاری ہو گیا۔صرف ''الحمدللہ'' کہہ کر بند ہو گئے تو فرمایا کہ تم لوگوں کو امام فعال کی زیادہ ضرورت ہے امام قوال سے، میرے ساتھی اس دن کے لیے کچھ باتیں تیار کر کے لاتے تھے اور انشاء اللہ میں بھی آئندہ تمہیں خطبے سناؤں گا، اور منبر سے اتر آئے۔یہ سب صحابہؓ کی موجودگی میں ہوا۔مطلب یہ ہے کہ خطبہ کا معنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہی سمجھا کہ حاضرین سے نصیحت کے طور پر کوئی بات کہی جائے، جسے وہ سمجھتے ہوں، اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰت اور تلاوتِ قرآن پاک موجود ہو۔

فرماتے ہیں: **وھذا لان العرف انما یعتبر فی معاملات الناس فیکون**

---

[1]۔(بدائع الصنائع۔ج1ص262)

دلالة علی عرفهم۔ لہٰذا جب تمام لوگوں کے لیے زبان عربی سے واقفیت ناممکن ہوتو اور مسنون خطبہ کے بعد چند باتیں بطریق وعظ اپنی زبان میں کہہ دی جائیں تو حقیقتاً وعرفاً وہی خطبہ ہے۔

آگے لکھتے ہیں: **ویکرہ للخطیب ان یتکلم (اے بکلام الناس) ولو فعل لایفسد الخطبة لانّھا لیست بصلاۃ فلا یفسد ھاکلام الناس لکنه یکرہ الا اذا کان امرا بالمعروف فلا یکرہ۔ لما روی عن عمر رضی اللّٰہ عنه انه کان یخطب یوم الجمعة فدخل علیه عثمان رضی اللہ عنہ فقال له ایة ساعة ھذا**......

ترجمہ: خطیب کے لیے دنیاوی کلام مکروہ ہے لیکن اگر اس نے دنیاوی کلام کیا تو خطبہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ یہ نماز نہیں ہے لیکن دنیاوی کلام اگر امر بالمعروف کے علاوہ ہوتو وہ مکروہ ہے۔[1]

یعنی خطبے کے دوران ہی ان پر اعتراض کیا کہ تم اس قدر دیر کر کے کیوں آئے ہو؟ فرمایا: **مازدت حین سمعت النداء یا امیر المومنین علی ان توضات قال والوضو ایضا وقد علمت ان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امر بالاغتسال؛ وھذا لان الامر بالمعروف یلحق بالخطبة لان الخطبة فیھا وعظ فلم یبق مکروھا**......

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ خطبہ وعظ کا نام امر بالمعروف اور نیکی کی باتیں بتلانا ہی دراصل خطبہ کا مقصد ہے اور اگر وہ ایسی زبان میں ہو جسے وہ سمجھ ہی نہ سکیں تو وہ خطبہ بھی نہ ہوگا اور وعظ بھی نہ ہوگا۔ ہاں ذکر اللہ کے تحت داخل ہو کر جائز ہو جائے گا۔

فتاوی شامی میں ہے: **لم یقید الخطبة بکونھا بالعربیة اکتفاء بماقدمه فی باب صفة الصلوٰۃ من انھا غیر شرط ولو مع القدرۃ علی العربیة عندہ خلافا**

---

[1]۔ (بدائع الصنائع۔ ج1 ص265)

لهما حیث شرطاها الا عند العجز۔

ترجمہ: خطبہ کو عربی کے ساتھ مقید نہیں کیا اس بات پر اتفاق کرتے ہوئے جو باب صفۃ الصلوۃ کے اندر ہے کہ عربی شرط نہیں اگرچہ عربی پر قدرت بھی حاصل ہو۔

یہ امام صاحب کے نزدیک ہے صاحبین فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں خطبہ شرط ہے ہاں اگر عربی زبان میں خطبہ پڑھنے سے عاجز ہے تو اس کے لیے غیر عربی میں خطبہ جائز ہے۔[1]

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **ویکرہ للخطیب ان یتکلم الا ان یکون امرا بالمعروف کذافی فتح القدیر۔**

ترجمہ: خطیب کے لیے امر بالمعروف کے علاوہ دنیاوی کلام مکروہ ہے۔[2]

اس سے پہلے ایک سطر میں لکھتے ہیں کہ دوسرے خطبہ میں **نحمدہٗ و نستعینہٗ** الخ...... کے بعد خلفائے راشدین کا ذکر اور عمین مکرمین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر پاک مستحسن ہے۔ **وبذلک جری التوارث کذافی التجنیس۔**

حالانکہ یہ سب چیزیں صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نہیں کہی جاتی تھیں لیکن فقہاء نے اسے بدعت نہیں کہا بلکہ مستحسن قرار دیا ہے۔ اس طرح سلطانِ وقت کے حق میں دعا کرنا ازمنہء کثیرہ سے شعارِ اسلام و خطیب سمجھا جاتا ہے جو دورِ صحابہؓ میں نہ تھا باقی رہا یہ امر کہ صحابہؓ نے فارس و خراسان پر حکومت و غلبہ حاصل کرنے کے بعد ترجمہ کا اہتمام نہیں کیا تو اس کو سمجھنے کے لیے عرب کی تاریخ پر عبور لازم ہے پہلے پہل صحابہؓ کے خطبے صرف عساکر میں ہوتے تھے اور وہ سب اہلِ عرب ہوتے تھے اور بعد میں شہری لوگوں کے اسلام لانے

---

[1]۔(فتاوی شامی۔ج1ص 597)

[2]۔(فتاوی عالمگیری۔ج1ص 162)

کے بعد بھی خطبہء جمعہ والی یا حاکم کا فریضہ سمجھا جاتا تھا اور وہ صرف اہلِ عرب ہی ہوتے تھے صحابہؓ کے زمانہ میں کسی عجمی کو ولایت وحکومت نہیں عطا کی گئی دوم اس طریقہ سے سیاستہ گسان عربی کا تسلط بھی مقصود تھا جس کے لیے آج تک اہلِ ایران روتے پھر رہے ہیں کہ اہلِ عرب نے ہمیں اسلام کی نعمت سے تو یقیناً نوازا لیکن ہماری صدیوں کی ثقافت وتہذیب بالکل برباد کردی۔ ہلِ عجم نے ''**اَلنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلوکِھِم**'' کے تحت عربی زبان سیکھی اور عام کتب تفسیر وعقائد فقہ ونحو اہلِ فارس نے تصنیف کی ہیں جو آج تک مشعلِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ صحابہؓ نے کسی شہر میں کوئی مکتبہ یا درسگاہ عربی سیکھنے کے لیے قائم کی ہو یا لوگوں کو عربی سیکھنے پر مجبور کیا ہو۔ بہرکیف خطبہ مسنونہ کے بعد اگر کسی آیت و حدیث کا ترجمہ یا تذکرہ اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے کر دیا جائے تو اس میں کوئی کراہت یا حرمت نہیں ہے بلکہ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اسی کا نام خطبہ ہے۔

درمختار میں ہے: **المقرر عندنا انه لا يفتى ويعمل الا بقول الامام الاعظم۔**

مبسوط میں ہے: **والخطبة كلها وعظ و امر بالمعروف ۔درالمختار: و يعلم الناس فيها احكام صدقة الفطر۔ شامی: ان الخطيب اذا راى حاجة الى معرفة بعض الاحكام فانه يعلمهم اياها فى خطبة الجمعة۔ نهاية: فعنده يجوز بالفارسية ۔ جامع المضمرات يجوز عند ابى حنيفة بغير العربية للقادر والعاجز كليهما۔ فتاوىٰ سراجيه : ولو خطب بالفارسية يجوز۔ محيط: لو خطب بالفارسية يجوز عنده وللفقيه فيها وسعة و مجال و من ضاق عليه عرصة العقل و الخيال فعليه فهم محال و على الله التوكل و اليه المرجع والمآل۔**

سوال ۱۱۱

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ ایک شخص نے اشٹام پیپر خریدا ہے اور اس پر دکاندار نے ''طلاق نامہ'' کے لیے لکھ دیا ہے۔ بعد میں عرضی نویس سے اس کے بھائی نے لکھوایا ہے جبکہ وہ ساتھ ہی نہیں۔ دوسرے آدمی نے آ کر روک لیا ہے۔ خاوند نے اس پر نشانِ انگوٹھا لگایا ہے نہ عرضی نویس کو لکھنے کے لیے کہا ہے۔ کیا وہ طلاق نامہ شرعاً متصور ہو سکتا ہے یا نہ؟ (سائل محمد اکبر از پیر محل، جھنگ)

جواب

صورتِ مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوتی جب تک آخر صفحہ پر بطور اقرار دستخط یا نشان انگوٹھا ثبت نہ ہو۔ فتاوی شامی میں ہے: **لوا ستكتب من آخر كتابا بطلاقها وقرأه على الزوج فاخذه الزوج و ختمه و عنونه و بعث بها اليها واتاها وقع**

خلاصہ عبارت: اگر دوسرے سے طلاق نامہ لکھوایا اور اس کو زوج کے پاس پڑھا پھر زوج نے اس کو لیا اور مہر لگا کر عورت کی طرف بھیج دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی۔[1]

كل كتاب لم يكتبه بخطه ولم يمله بنفسه لا يقع الطلاق۔[2]

واللہ اعلم بالصواب۔ (۹ جولائی ۱۹۶۶ء)

سوال ۱۱۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ نماز و نوافل وغیرہ پڑھ کر مسجد میں جو

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ ج2 ص465)

[2]۔ (فتاوی شامی۔ ج2 ص465)

لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، امام ان کے ساتھ مل کر دعا مانگتا ہے، یہ جائز ہے یا بدعت؟ اسی طرح اذان کے بعد جو دعا مانگی جاتی ہے، اس کے لیے ہاتھ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب

اللہ تعالیٰ سورۃ حدید میں فرماتے ہیں: **وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ۔ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ**

ترجمہ: اور اس کے پیروؤں کے دل میں نرمی اور رحمت رکھی اور راہب بننا تو یہ بات انہوں نے دین میں اپنی طرف سے نکالی ہم نے ان پر مقرّر نہ کی تھی ہاں یہ بدعت انہوں نے اللہ کی رضا چاہنے کو پیدا کی پھر اسے نہ نباہا جیسا اس کے نباہنے کا حق تھا تو ان کے ایمان والوں کو ہم نے ان کا ثواب عطا کیا اور ان میں بہتیرے فاسق ہیں۔

فاضل نعیمیؒ لکھتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ نے ہزاروں اختلافی مسائل کا فیصلہ کر دیا ہے جن میں آج کل لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اپنی خواہشِ نفس کی بنا پر بہت سے امورِ خیر کو بدعت کہہ کر منع کرتے ہیں جن سے دین کی تائید اور تقویت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اس سے اُخروی فوائد پہنچتے ہیں اور لوگ طاعات وعبادات میں ذوق وشوق سے مشغول ہوتے ہیں۔ ایسے امور کو بدعت کہہ کر نیکی سے منع کرنا آیتِ کریمہ کے خلاف ہے اور **مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ** کا مصداق بنتا ہے۔

دین میں کسی ایسے کام کی ابتدا کرنا جو کام فی نفسہ نیک ہے اور کرنے والے کا مقصد رضائے الٰہی چاہنا ہے تو یہ کام بہتر ہے، اس پر ثواب ملے گا۔ یہ بدعت لغوی ہے، بدعتِ شرعی نہیں ہے اور یہی وہ بدعت ہے جس کو حضرت عمرؓ نے ''**نعمة البدعة**'' فرمایا اور اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''**من سَنَّ فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر مَن عمل لها**

ترجمہ: جس نے اسلام میں اچھے کام کی ابتداء کی تو اس کے لیے اس کا اجر بھی ہے اور جو اس پر عمل کرے گا اس (ابتداء کرنے والے) کو اجر ملتا رہے گا۔[1]

اور **وعلیکم بسنتی وسنة خلفاء الراشدین المهدیین**

ترجمہ: میری اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔[2]

اور فرمایا ''**کل بدعة ضلالة**'' سے مراد بدعتِ سیئہ ہیں۔ مشکوٰۃ شریف باب اعتصام بالکتاب والسنة فصل ثانی میں آنحضرت ﷺ نے خود اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:

من ابتدع بدعةً ضلالةً لا یرضاها الله ورسوله کان علیه الاثم......

ترجمہ: اللہ کے پیارے حبیب ﷺ نے فرمایا کہ جو گمراہی کی بدعت ایجاد کرے جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ راضی نہ ہو تو اس پر ان سب کے برابر گناہ ہوگا جو اس پر عمل کریں گے[3]۔ یعنی جو کتاب وسنت صریحہ کے خلاف ہو وہ تو دین کا کام ہی نہ ہوا۔ مرقات شرح مشکوۃ میں ہے: **قال الشافعی** علیہ الرحمۃ **ما احدث مما یخالف الکتاب والسنة والاثر والاجماع فهو ضلالة وما احدث من الخیر مالا یخالف شئیاً من ذلک فلیس بمذموم**......

ترجمہ: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جس نے ایسا طریقہ ایجاد کیا جو کتاب وسنت اور اجماع کے مخالف ہو تو وہ گمراہی ہے اور جو ان میں سے کسی کے مخالف نہ ہو وہ مذموم نہیں ہے۔[4]

---

[1]۔(ریاض الصالحین صفحہ 88 باب فی مَن سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً اوسِیَۃً)

[2]۔(مشکوٰۃ شریف۔ صفحہ 30، ج 1، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

[3]۔(مشکوٰۃ شریف۔ باب الاعتصام بالسنۃ والکتاب، صفحہ 30، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ)

[4]۔(مرقاۃ شرح المشکوٰۃ۔ صفحہ 216 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)

ویسے بدعت کی کئی قسم ہیں۔ واجب، حرام، مکروہ، مستحب، مباح وغیرہ۔ **کما ھو مذکور فی الکتب**، لہٰذا دین میں ایسی بات نکالنی جو فی نفسہٖ بری ہے یعنی کتاب وسنت میں اسے منع کیا گیا ہے، یا اس کے نکالنے سے کوئی سنت مرتفع ہو جاتی ہے تو یہ بدعت سیئہ اور بدعتِ ضلالۃ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے منع فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۱۱۳

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید کی عمر پندرہ سال سے زائد ہے اور وہ دیگر علاماتِ بلوغ کا بھی مدعی ہے لیکن اس کی داڑھی نہیں نکلی تو کیا اس کے پیچھے اقتداء کامل مردوں کی طرح جائز ہے یا نہیں؟

جواب

فتاویٰ شامیؒ میں ہے کہ جائز ہے۔ یہی مسئلہ شیخ احمد بن یونس معروف بابن الشلبی اور مفتی محمد تاج الدین قلعی سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا بلاشک جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔[1]

سوال ۱۱۴

زید کو آٹھ شخصوں نے جنگل میں پکڑ کر خوب مارا پیٹا اور معلق طلاق کہلوالی کہ میں اگر اپنی لڑکی نہ منادوں تو مجھ پر میری بیوی مطلقہ بالثلاث ہے یا عمر طلاق ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب وہی مارنے والے اشخاص گواہ شاہد بن گئے ہیں اور حالف خود کہتا ہے کہ میں نے زن طلاق

---

[1]۔ (فتاوی شامیؒ۔ ج1 ص394)

کا لفظ ایک مرتبہ کہا ہے۔شرعاً اس کا کیا حکم ہے۔ وہ مارنے والے گواہ شرعی بن سکتے ہیں یا حالف کا قول بالحلف معتبر ہوگا؟ (سائل از اشرف والا)

جواب

یہ بات بصورت تصفیہ شرعی میرے روبروپیش ہوئی۔فریقین کے بیانات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔مندرجہ ذیل امور قابلِ تنقیح ہیں۔

(۱) شہادت اور دعویٰ میں کیا فرق ہے؟

(۲) کوئی شخص اپنے فعل پر شہادت دے سکتا ہے؟

(۳) شاہد حسبہ اگر بلا عذر تاخیر کرے تو اس کی شہادت رد ہوسکتی ہے یا نہیں؟

(۴) جو شخص رات کو یا دن کو جمعیت بنا کر کسی مسلمان کو خوفزدہ کرے یا مارے پیٹے اور طلاقیں اٹھوائے تو اس کی شہادت شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

(۵) عداوتِ دنیاوی کے ہوتے ہوئے اس کے خلاف شہادت دے سکتا ہے یا نہیں؟ شہادت میں اختلاف ہو تو وہ قابلِ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں؟......

مجمع الانہر میں ہے: **هی اخبار بحق للغیر لے حصل لغیر المخبر من کل الوجوه** ......[1]

لہٰذا جو شخص کہتا ہے کہ میں نے اسے مارا پیٹا اور اس سے اس طرح طلاق کہلوائی یا اس نے کہی تو ظاہر ہے کہ یہ ان کے اپنے فعل کی شہادت ہوئی نہ کہ دوسرے شخص پر۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: **لا یجوز الشهادة علی فعله**۔[2]

قاطع الطریق فاسق اور مرتکب کبیرہ کا ہوتا ہے، اس سے عدالت ساقط ہوجاتی ہے

---

[1]۔(مجمع الانہر۔ج2ص185)

[2]۔(فتاوی شامی۔ج4ص398)

اور شہادت کے لیے عدالت شرط ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: **وان قصدوا بالحجر او الخشب فان كانوا خارج المصر فكذالك۔**[1]

مجمع الانہر میں ہے: **والعدالة شرط لا نزجارعما يعتقده حرام فی دينه وهذا يتناول الاجتناب من الكبائر وفی البحر الاعانة على المعاصی والحث عليهاكبيرة** خلاصہ عبارت: ہر اس کام سے روکنے کے لیے جو اس کے دین کے اندر حرام ہے عدالت شرط ہے۔ اور یہ کبیرہ گناہوں سے بچنے کو بھی شامل ہے اور بحر میں ہے کہ گناہوں پر مدد اور ابھارنا کبیرہ گناہ ہے۔[2]

درمختار میں ہے: **كل فعل يرفض المروة والكرم كبيرة واقره ابن الكمال ومن ارتكب كبيرة سقطت عدالته۔**

ترجمہ: جو فعل مروۃ اور کرم کو چھڑوا دے وہ کبیرہ گناہ ہے۔ اور اس کو ابن کمال نے ثابت رکھا ہے اور جو شخص کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو اس کی عدالت ساقط ہو گی۔[3]

درمختار میں ہے: **ولا تقبل شهادة عدو بسبب الدنيا۔**

ترجمہ: دنیاوی دشمنی والے دشمن کی گواہی قبول نہیں ہو گی۔[4]

دوسری جگہ ہے: **بخلاف عداوة الدينية فانه لا يامن من التقول عليه كما سيجئی۔**

---

[1]۔(مجمع الانہر۔ص 631)

[2]۔(مجمع الانہر۔ج 2 ص 188)

[3]۔(درمختار۔باب قبول وعدمہ۔ص 487)

[4]۔(درمختار۔ص 489)

ترجمہ: دینی دشمن کی گواہی کا حکم اس کے خلاف ہے کیونکہ اس میں دروغ گوہی کا اطمینان نہیں۔[1]

درالمختار میں ہے: **متی اخر شاھد الحسبة شھادة بلا عذر فسق فترد کطلاق امرءة۔**

ترجمہ: جس وقت شاہد حسبہ نے فسق والے عذر کے بغیر گواہی کو موخر کیا تو اس کی گواہی رد کی جائے گی۔[2]

قال قال رسول اللہ ﷺ من اشار الی اخیه بحدیدة فان الملائکة تلعنه حتی یضعھا وان کان اخاہ لابیه وامه (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے بھائی کی طرف لوہے سے اشارہ کرے تو فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں حتی کہ اسے رکھ دے اگرچہ اس کا سگا بھائی ہو۔[3]

عن النبی ﷺ من حمل علینا السلاح فلیس منا ۔وزاد مسلم من غش فلیس منا۔

ترجمہ: نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں اور مسلم نے یہ زیادہ کیا کہ جو ہم سے ملاوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔[4] **وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ من نظر الی اخیه**

---

[1]۔(درمختار۔باب قبول وعدمہ۔ص 487،لبنان)

[2]۔(درمختار۔ص 483،لبنان)

[3]۔(مشکوٰۃ۔باب الجنایات۔ص 305)

[4]۔(مشکوٰۃ شریف۔باب الجنایات۔ص 305)

نظرة یخفیه اخافه اللّٰہ یوم القیٰمة۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جس شخص نے اپنے بھائی کو ڈراونی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو ڈرائے گا

حوالہ جات پر غور کرنے سے ظاہر ہے کہ گواہان اکراہ و جبر جو اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس کا اقرار کرتے ہیں، بڑی دیدہ دلیری سے قابل شہادت نہیں رہے۔ لہٰذا جان محمد مذکور چونکہ طلقات ثلاثہ کا منکر ہے، اگر حلف بالقرآن اٹھا کر کہہ دے کہ میں طلقات ثلاثہ کہہ کر تیسرے دن لڑکی ان کے حوالے کرنے کا انہیں وعدہ نہیں کیا تو اس پر طلاق مغلظہ وارد نہیں ہوتی۔ اور قرینِ قیاس بھی ہے۔ اگر اس نے تیسرے دن شہباز خان کے حوالہ کرنے کا حلف اٹھایا تھا تو پھر تیسرے دن ان کے پاس آدمی بھیجنے کی کیا ضرورت؟

علاوہ ازیں اگر تسلیم کر لیا جاوے کہ مدعیانِ جبر صحیح کہتے ہیں تو اس کا بھتیجا تو حقیقی خصم ہے۔ اس نے وعدہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ مجموعی طور پر تینوں گواہوں کا جس بات پر اتفاق ہے، وہ یہی الفاظ ہی کہ میں اگر نہ منا دوں، تمام زندگی میں اس بات کی توقع ہے جب تک وہ لڑکی یا باپ نہ مر جائے۔ بعد کی طلقات میں تینوں شہادتیں مختلف ہیں۔

درالمختار میں ہے: **ولو شهد احدهما بالف والاخر بالفين او مائة و مائتين او طلقة وطلقتين وثلاث ردت لاختلاف المعنين۔**

ترجمہ: اگر ان میں سے ایک نے ہزار کی گواہی دی اور دوسرے نے دو ہزار کی یا ایک نے سو کی اور دوسرے نے دو سو کی گواہی دی یا ایک طلاق، دو طلاقوں اور تین طلاقوں کی گواہی دی تو معانی کے اختلاف کی وجہ سے اس کو رد کیا جائے گا۔[1]

القصہ جان محمد مذکور کے حلف اٹھانے کے بعد میں فیصلہ کرتا ہوں کہ طلاق مغلظہ واقع

---

[1]۔ (درمختار۔ ص 493 مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

نہیں ہوئی۔ (۲۱ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ)

سوال ۱۱۵

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ''ضاد'' کو مشابہ ''ظا'' پڑھنے سے نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ اور اس طرح ''ضاد'' کو ''دال'' کے مشابہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

(سائل از ریاست بہاولپور)

جواب

تحقیق مسئلہ کے متعلق مختصراً اتنا عرض ہے کہ جو شخص تفریق اور حروف کی صحیح ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس حرف کے بدلنے سے معنی بدل جائے گا یا نہیں؟ اگر معنی بدل جاتا ہے اور وہ شخص فرق پر بلا تکلف قادر تھا تو بالاتفاق نماز نہیں ہوگی۔ اگر ایسے الفاظ ہیں جن میں مشقت کے ساتھ فرق ہوتا ہے جیسا کہ ''ضاد'' اور ''ظا''، تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ نماز فاسد نہیں ہوتی۔

قاضی امام ابوحسن اور قاضی امام ابو عاصم فرماتے ہیں کہ اگر عمداً ایسا کرے تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ اگر اتفاقاً زبان پر وہ لفظ جاری ہوگیا یا اچھی طرح ان میں تمیز نہیں کرسکتا تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **ان ذکر حرفا وکان حرف ولم یغیر المعنی بان قرء ان المسلمون مکان المسلمین و الظالمون مکان الظالمین و ماءاشبه ذلک لم تفسد صلاته۔ وان غیر المعنی فان امکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاء فقرء الطالحات مکان الصالحات تفسد صلاته عند**

الکل وان کان لا یمکن الفصل الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین والتا مع الطاء اختلف المشائخ قال اکثرھم لا تفسد صلاته ھکذا فی فتاویٰ قاضیخان وکثیر من المشائخ افتوا به قال القاضی الامام ابوالحسن والقاضی امام ابو عاصم ان تعمد فسدت وان جری علی لسانه او کان لا یعرف التمییز لا تفسد وھو اعدل الا قاویل والمختار ھکذا فی الوجیز الکردری۔

ترجمہ: ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف ذکر کیا مثلاً ان المسلمین کی جگہ ان المسلمون اور ان الظالمین کی جگہ ان الظالمون پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر معنیٰ بدل گئے ہیں پس اگر وہ دونوں حروف ایسے تھے کہ ان میں جدائی آسانی سے ممکن تھی جیسا کہ، ط، اور صاد پس اگر کسی نے صالحات کی جگہ طالحات پڑھا تو سب کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی اگر وہ دونوں حرف ایسے تھے کہ ان میں مشقت کے بغیر فرق نہیں ہوسکتا تھا جیسا کہ، ظاء، اور، ضاد، اور، صاد، اور سین، اور، طا، اس میں مشائخ کا اختلاف ہے اکثر کا قول یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی یہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے اور اکثر مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے امام ابوالحسن ، قاضی امام ابو عاصم نے کہا ہے کہ جان بوجھ کر ایسا کرے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر اتفاقاً اس کی زبان سے نکل گیا یا ان میں تمیز نہیں جانتا تو فاسد نہ ہوگی۔ اور یہی سب قولوں میں ٹھیک اور مختار ہے۔ اور یہ وجیز میں لکھا ہے جو کردی کی تصنیف ہے۔[1]

حضرت اعلیٰ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں ہو جاتی ہے اور خواص جو امتیاز پر قادر ہیں، اور ضد اور اپنے اپنے اساتذہ کی پیروی نماز کی صحت سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، تو نماز نہ ہوگی۔[2]

---

[1]۔ (فتاوی عالمگیری۔ ج 1 ص 79)

[2]۔ (فتاویٰ مہریہ۔ ص 117)

وفيه تفصيل و تطويل فانظر ثمه۔

سوال ۱۱۶

زید نے اپنی میل سکنی کا عمر کے ساتھ سودا کیا۔ وہ جگہ زید کی اپنے بھائی کے ساتھ مشترک تھی اور اس کا بھائی بھی فروخت کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس سودا میں موجود نہیں تھا۔ زید نے یک صد روپیہ بطور ''ساہی'' (بیعانہ) وصول کر لیا اور ایک معتبر آدمی کے روبرو ایجاب وقبول کیا اور ''ساہی'' وصول کر کے رسید لکھ دی۔ چند دن بعد زید کو ایک دوسرے آدمی نے زبردستی پکڑ لیا اور پھر اس سے اشٹام لکھوا لیا جو نہایت مشکوک ہے۔ پھر زید نے اپنے بھائی کو ساتھ لے جا کر پوری رقم وصول کر کے عدالت میں رجسٹری کر دی اور میل سکنی کا قبضہ بھی دے دیا۔ اب قابلِ دریافت یہ امر ہے کہ یہ جگہ شرعاً کس کی ہوئی؟

۱۔ زید نے دوسرے آدمی کے ساتھ سودا کرنے کا پولیس کے سامنے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ جو تحریر لیے پھرتے ہیں، وہ جھوٹی ہے۔

۲۔ سابقہ خریداروں نے رجسٹری کے بعد دونوں بھائیوں سے قبضہ لیا اور اس موجودہ چھپر میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ دوسرے فریق نے رات کے وقت اس میل سکنی پر زبردستی دیوار کھڑی کر دی ہے اور وہ چھپر اور سامان لوٹ لیا ہے۔ اگر اس کی کوئی قانونی شکل ہوتی تو وہ ضرور اس سے پہلے مالکوں کی اجازت سے قبضہ حاصل کرتے حالانکہ نہ خود انہوں نے قبضہ کیا ہے اور نہ سابقہ خریداروں کو قبضہ کرتے وقت رکاوٹ کی ہے۔

جواب

اس معاملے میں مندرجہ ذیل امورِ تنقیح قابلِ غور ہیں۔

۱۔ شرعاً بیع ایجاب وقبول کا نام ہے۔ یا عملاً کچھ رقم بطور عوض وصول کرنے کا۔

درالمختار میں ہے: **یکون بایجاب و قبول و هما رکنه او بفعل کتعاط**۔[۱]

یعنی زبان سے ایجاب وقبول تو نہیں کیا لیکن اس چیز کی معروفہ رقم بائع کے حوالے کردی اور چیز پر قبضہ کرلیا۔

۲۔ **شرطه اهلية المتعاقدين وحكمه ثبوت الملك والدال على التراضى لذالم يلزم بيع المكره**۔

ترجمہ: بیع کی شرط یہ ہے کہ عقد کرنے والوں میں اہلیت موجود ہو۔ اور اس کا حکم ملک کا ثابت ہونا ہے۔ اہلیت رضامندی کی دلیل ہے اسی وجہ سے مکرہ کی بیع لازم نہیں ہوگی۔[۲]

گویا دوسری بیع کے جواز کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس سے پہلے بیع کا کوئی ظاہری ثبوت نہیں جس میں قبضہ یا وصولی رقم کا ذکر ہو۔

۳۔ **صح بثمن حال و موجل الى اجل معلوم** ترجمہ: صحیح ہے بیع نقد اور ادھار کے ساتھ جب کہ ادھار کی مدت معلوم ہو۔[۳]

وشرط لصحته معرفة قدر مبيع وثمن ووصف ثمن۔ ترجمہ: مبیع، ثمن کی مقدار اور ثمن کے وصف کا معلوم ہونا یہ بیع کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔[۴]

یعنی شرعاً معدوم کی بیع جائز نہیں ہے۔ مشترک چیز میں ایک شریک اگر سالم کا سودا

۱۔ (درمختار ص 394، کتاب البیوع)

۲۔ (درمختار۔ ص 394)

۳۔ (درمختار۔ ص 396، مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

۴۔ (درمختار۔ کتاب البیوع)

کردے اور دوسرا شریک کوئی اعتراض نہ کرے تو سالم کا سودا ہو گیا ورنہ بصورت اعتراض اس بائع کے حصہ کا سودا تو یقیناً ہو گیا۔

۴۔ **واذا قبض المشتری المبیع برضاء بائعه صریحاً او دلالة فی البیع الفاسد ولم ینهه ملکهٗ**

ترجمہ: جب مشتری نے بیع فاسد میں مبیع اس کے بائع کی رضامندی کے ساتھ قبضہ کیا حالانکہ اس نے مشتری کو نہ روکا تو وہ اس کا مالک ہوگا۔[۱]

۵۔ **ولا یفسد بیع عشرة السهم من مائة سهم اتفاقًالشیوع السهم۔**

ترجمہ: حصوں کے شائع ہونے کی وجہ سے سو میں سے دس کی بیع فاسد نہیں ہے

اور ہبہ کے لیے موہوب لہٗ مقبوض غیر مشترک ممیز غیر مشغول ہونا لازم ہے۔ **وشرائط صحتها فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاعٍ** ترجمہ: ہبہ میں موہوب چیز پر قبضہ اور اس کا شائع نہ ہونا اس کی صحت کے لیے شرط ہے۔[۲]

لہٰذا مندرجہ بالا شواہد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیع اول صحیح ہے اور پھر اس شخص کا کسی دوسرے کے ساتھ سودا کرنا رضامندی کے ساتھ ہو یا زبردستی، ناجائز ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ (۱۹ مارچ ۱۹۶۸ء)

سوال ۱۱۷

زید نے کہا ساس سے جھگڑتے ہوئے "طلاق ہے، طلاق ہے" اور پھر کہا، "مجھ

۱۔ (درمختار۔ کتاب البیوع۔ ص418)

۲۔ (درمختار۔ کتاب الہبہ۔ ص560)

پر حرام ہے، میں اسے منہ متھے نہیں لگاؤں گا" ...... نہ عورت کا نام لیا نہ اس کے باپ کا۔ گواہ اللہ بخش کہتا ہے کہ حالف نے پہلی دفعہ عورت کے والد کا نام لیا کہ احمد کی لڑکی مجھ پر طلاق ہے۔ دوسری دفعہ صرف "طلاق ہے" کہا اور تیسری دفعہ کہا، "مجھ پر حرام ہے، میں اسے منہ متھے نہ لگاؤں گا۔" (سائل از وان بھچراں)

جواب

پہلی دو طلاقیں رجعی ہیں۔ **بقولہٖ تعالیٰ الطلاق مرتان فامساک بمعروف،** الخ ...... اور تیسری کنائی ہے۔ **بحکم البائن یلحق الصریح لاالبائن۔** پہلی دو طلاقوں کا رجوع منقطع ہوگیا۔ اب عورت کو گھر لا کر ایجاب وقبول لازم ہوگا۔

درالمختار میں ہے: **کذا الطلاق علی مال فیلحق الرجعی فیجب المال،** الخ ......ترجمہ: اور اسی طرح طلاق علی المال رجعی طلاق کو لاحق ہوگی اور مال واجب ہوگا۔[1]

اگر تیسری طلاق کو معلق سمجھا جائے یعنی یہ مطلب ہو کہ اگر میں اسے منہ متھے لگاؤں گا تو مجھ پر حرام ہے، تو پہلی دو طلاقوں سے رجوع کرلے اور تیسری منا کر گھر لانے کے بعد واقع ہوگی۔ لہٰذا پھر ایجاب وقبول کرلے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۲۵ محرم الحرام بمطابق ۱۲ اپریل ۱۹۶۸ء)

سوال ۱۱۸

جواب درسوال:

بیانات منقولہ مذکورہ سے جو بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے، وہ یہ ہے کہ احمد ولد گلا یا نے

---

[1]۔ (درمختار۔ص 215، مطبوعہ دارالعلمیہ بیروت لبنان)

جو دعویٰ کیا ہے، اس پر کوئی شہادت موجود اور قائم نہیں کر سکا۔ اگر اس کے ساتھ اس کی حلف بالطلاق نہ ہوتی تو اس کا فقط یہ دعویٰ خارج ہو جاتا لیکن یہاں اس کی حلف بالطلاق ہے اور گواہان جو اس موقع پر موجود ہیں اور کچھ غیر متعلق بھی ہیں، وہ اسے قطعاً جھوٹا ثابت کرتے ہیں اور اس کی حلف کا سیدھا مفہوم یہ ہے کہ اگر مشہود علیہ کے پاس اس وقت بندوق نہ ہو تو میری عورت پر تین طلاق کیونکہ اس کے اپنے بیانوں پر حلف بالطلاق اٹھانے کا دوسرا کوئی مطلب بھی نہیں ہو سکتا۔

دوم، گواہان دو چیزیں ثابت کرتے ہیں۔ ایک اس کا تین طلاق اٹھانا، جس میں وہ قطعاً متفق اور سچے ہیں کیونکہ اتنے آدمیوں کا تصادم علی الکذب ناممکن ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے صرف زن طلاق کا لفظ کہا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ جس طرح وہ اس معاملے میں صراحتہً قاضی اور مفتی کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے، بالکل اسی طرح اس نے بندوق کے دیکھنے سے واقف ہے۔ اس پر یہ بات بالکل آشکار ہے کہ وہ حلف بالطلاق کاذباً اٹھانے پر ہرگز تیار نہ تھا بلکہ حلف بالقرآن اٹھاتا تھا گویا اس کے خیال میں عورت کے چلے جانے سے قرآن جھوٹا اٹھا دینا بالکل کم ہے۔ اس سے حالف کا فاسق ہونا یقیناً ثابت ہے اور فاسق کی شہادت کا حال معلوم ہے۔ یوں تو آج کل اکثریت فساق کی ہے۔ لیکن بیانات اور شہادت میں جس کا فسق ظاہر ہو جائے، وہ قطعاً شہادت کے قابل نہیں رہتا۔

سوم، اس نے صرف اپنا بھرم رکھنے کے لیے حلف اٹھا دی ہے۔ اسے اصل واقعات کا اتفاقی اجتماع سوچی سمجھی ہوئی سکیم کا علم نہیں تھا ورنہ ہرگز وہ حلف کے پاس نہ پھٹکتا۔

باقی رہا یہ معاملہ کہ دوسرے گواہ بھی باہتمام نفی کے گواہ ہیں اور شہادت نفی پر معتبر نہیں ہوتی تو اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ

شهادت النفی المتواتر مقبولة قال فی المحیط فی الحاوی او لخمیس ان تواتر عند الناس وعلم الکل عدم کونه فی ذلک المکان والزمان لاتسمع الدعوی ویقفی بفراغ الذمة لانه یلزم تکذیب الثابت بالضرورة۔ فتاوی شامی

شہادت النفی شروط میں بالاتفاق معتبر ہے اور حقیقت میں مختلف عبارات فقیہ پر غور کرنے سے ثابت ہے کہ جونفی اثبات کو مستلزم ہو وہ اثبات ہوتی ہے۔لہٰذا یہ شہادتیں اثبات پر ہوں گی، نفی پر نہیں۔کیونکہ ان شہادتوں کا مقصد عمل نہیں حلف کاذب کا ایقاع تھا۔اور دوم، جس طرح یہ شہادتیں مدعی کی زن طلاق کے خلاف اثبات بالطلاق الثلاثۃ پر صریح ہیں، اسی طرح حالف کو اس حلف میں بالکل کاذب ظاہر کرنے کے لیے مسجد میں جمع کی گئی ہیں۔ثالثاً، تمام اشخاص نیک و بد قرآن اٹھا کر کہتے ہیں کہ وہ خالی ہاتھ تھا۔یہ اثبات ہے، نفی نہیں۔اور ایک آدمی صرف اپنی بات کا بھرم رکھنے کے لیے حلف بالطلاق اٹھاتا ہے کہ وہ خالی ہاتھ نہیں تھا۔تو گویا ہم قرآن کریم کو حلف بالطلاق کے مقابلے کم سمجھ رہے ہیں۔ مندرجہ بالا گزارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے میری سمجھ کے مطابق حالف پر طلاقِ مغلظہ واقع ہو چکی ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۱۱۹

دس سال کے لڑکے نے ایک عورت سے زنا کیا، پھر اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کر لیا اور پھر بھی ایک بار یا دو بار اس لڑکے نے اس عورت سے بدکاری کی، پھر اس عورت کی لڑکی اس مرد ناکح سے پیدا ہوئی اور چھ سال کی عمر میں اس کا نکاح اس زانی سے کر دیا گیا۔یہ نکاح جائز ہے یا فاسد؟ کسی امام کا اختلاف ہے یا سب کا اتفاق؟ دلائل کیا ہیں

اور کس کے دلائل قوی ہیں؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔ (سائل از قائد آباد)

جواب

امام اعظم اور صاحبین یعنی ہمارے آئمہ ثلاثہؒ امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی حضرت عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ ابن عباسؓ، عمرانؓ بن حصین، حضرت جابرؓ، حضرت عائشہؓ، حسن بصری اوزاعی نخعی شعبی، طاوس ومجاہد یہ سب حضرات ہمارے قول کے موید ہیں۔ کما صرحہ بہ الشامی فی باب المحرمات۔ صرف امام شافعی مخالف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ازدواجی تعلقات سے جو محبت کا رشتہ پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے **فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا** سے تعریف فرمائی ہے وہ صرف وطی حلال پر متفرع ہونا چاہیے۔ وطیء حرام اکرام و اعزاز کی مستحق نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم نے **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ** الخ...... میں جو علت یا سبب باعث حرمت مقرر فرمایا ہے، بعینہٖ وہی وطیء حرام میں موجود ہے۔ بات صرف اکرام و انعام کی نہیں بلکہ جزئیت اور تعلق کا رشتہ پیدا ہو جانے کی ہے۔

۲۔ مراہق کا حکم بالغ کا ہے اور یقیناً جو زنا پر قادر ہے، وہ مراہق ضرور ہے۔

۳۔ عورت کے لیے مشتھاۃ ہونا لازم ہے جو ۶ سال سے ۹ سال تک کی عمر سے کم ہو نا یعنی ۹ سال یا زائد کی عمر والی لڑکی کو مشتھاۃ کہا جاتا ہے، اگر اس سے کم عمر والی لڑکی سے ایسی کوئی بات کی ہے تو اس کی اولاد سے حرمت پیدا نہ ہوگی۔

درالمختار میں ہے: **لما تقرران وطیء الامھات یحرم البنات۔**

ترجمہ: ماؤں سے وطی کرنا بیٹیوں کو حرام کر دیتا ہے۔[1]

واللہ اعلم بالصواب۔

۱۔ (درمختار۔ کتاب النکاح فصل فی المحرمات)

سوال ۱۲۰

۱۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ رمضان شریف کا چاند ایک شہر والوں نے دیکھا ہے اور روزہ رکھا اور دوسرے شہر والوں نے ان کی اطلاع پر روزہ رکھا ہے اور تیس دن پورے کرنے کے بعد بھی عید الفطر کا چاند نظر نہیں آیا تو کیا وہ بغیر دیکھے عید کر سکتے ہیں؟ یا روزہ رکھیں؟

۲۔ ایک شہر کے عالم کے روبرو دو شخصوں نے شہادت دی ہے کہ ہم نے چاند دیکھا ہے اور قاضی نے ان کی شہادت کی بنا پر حکم دے دیا ہے کہ چاند ہو گیا ہے تو کیا دوسرے شہر کا قاضی یا عالمِ دین اس پہلے قاضی، عالم، حاکم کی ثابت شدہ شہادت پر حکم دے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ موثق ذریعہ سے قاضی ثانی کے پاس قاضی اول کے حکم کی خبر پہنچ گئی ہے۔ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

۱۔ علامہ شلبی علی ھامش زیلعی فرماتے ہیں: **قال الکمال رحمه الله و اذا ثبت فی مصر لزم سائر الناس فیلزم اهل المشرق رؤیته اهل المغرب فی ظاهر المذهب وقیل یختلف باختلاف المطالع لان السبب الشهر وانعقاده فی حق قوم لرویته لا یستلزم فی حق آخرین مع اختلاف المطالع۔ و صارکما لو زالت او غربت الشمس دون آخرین وجب علی الاولین الظهر والمغرب دون اولئک وجه الاول عموم الخطاب فی قوله صوموا معلقا المطلق الرویته فی قوله لرویته برویته قوم یصدق اسم الرویة فیثبت ماتعلق به عموم الحکم فیعم الوجوب بخلاف الزوال**[1]

---

[1]۔(علامہ شلبی علی ھامش زیلعی۔ ج1 ص316)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ''**صوموا لرویته**'' میں مطلق رویۃ کے ساتھ متعلق ہے۔ لہٰذا جہاں بھی رویت ثابت ہوگئی، دوسروں کے لیے اس پر عمل کرنا جائز ہو جائے گا بخلاف ان لوگوں کے جن پر اس وقت ظہر کا وقت ہے اور دوسری قوم پر مغرب کا وقت ہے تو ہر قوم اپنے وقت کے ساتھ مکلف ہوگی۔ کیونکہ شارع علیہ السلام کی طرف سے عدم وجوب کا حکم ثابت نہیں ہوا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: **ثم انما یلزم متاخری الرویة اذا ثبت عندھم رویة اولئک بطریق موجب حتی لو شھد جماعة اھل بلد کذا رءوا ھلال رمضان قبلکم فصاموا وھذا الیوم ثلاثون بحسابھم ولم یرھولاء الھلال لایباح فطر غدو لاتترک التراویح ھذه اللیلة لان ھذاه الجماعة لم یشھدوا بالرویة ولا علی شھادة غیرھم وانما حکو رویة غیرھم**......

گویا سوال مذکور کا جواب صراحۃً فرما دیا گیا ہے کہ اگر ایک قوم کے پاس شہادتِ شرعی بھی رویۃ ہلال کی نہیں ہوئی اور نہ انہوں نے دوسرے شہر والوں کے دیکھنے اور شہادت پر عمل کیا ہے۔ صرف ان کے سامنے یہ حکایت کی گئی ہے کہ فلاں شہر والوں نے جمعہ کا روزہ رکھا ہے اور اس شہر والوں نے سنیچر کا روزہ رکھا تھا۔ کیونکہ نہ رویت ہوئی تھی اور نہ دوسرے لوگوں کی رویت موجب طریق سے ان تک پہنچی اور تیس دن پورے ہونے پر بھی چاند نظر نہیں آیا تو انہیں روزہ نہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، انہیں تراویح بھی پڑھنی چاہئیں۔ گویا اگر ان لوگوں نے بلد اول کی رویت شرعی طریق سے ثابت ہو جانے پر وہی جمعہ کا روزہ رکھ لیا تھا اور تیس دن پورے ہو گئے اور چاند نظر نہیں آیا تو وہ عید کر سکتے ہیں اور اگر ان لوگوں کے پاس صرف تذکرہ ہوا ہے یا انہوں نے سابقہ شہر والوں کی رویت کا اعتبار نہیں کیا اور نہ اس پر عمل کیا

ہے تو وہ ان کی رویت کے حساب سے تیس دن پورے کر کے روزہ ترک نہیں کر سکتے۔

۲۔ علامہ شلبی علی ھامش زیلعی فرماتے ہیں: **ولو شهدوا ان قاضی بلد كذا شهد عنده اثنان لروية الهلال فی ليلة كذا وقضى بشهادتهما جاز لهذا القاضی ان يحكم بشهادتهما لان قضاء القاضی حجة وقد شهدوا به** ......یعنی ایک شہر کے عالم دین کے پاس دو آدمیوں نے شہادت دی ہے کہ ہمارے روبرو دو آدمیوں نے رویت ہلال کی شہادت دی، فلاں شہر کے عالم دین کے پاس اور اس نے حکم دیا کہ کل تم عید کر سکتے ہو تو اس شہر کے عالم کو بھی جائز ہے کہ وہ اپنے شہر والوں کو ترکِ روزہ کا حکم دے۔[۱]۔ ہذا ما عندی العلم عند اللہ تعالیٰ۔

سوال ۱۲۱

غلام حسن بیمار تھا۔ برادری کے چند اشخاص اس کے پاس آئے کہ تم اپنی لڑکی نابالغہ کے نکاح کی اجازت دے دو۔ اس نے جب انکار کو موثر ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے کہا، ہاں اس صورت میں اجازت دیتا ہوں کہ تم اس کا نکاح محمد ولد فتح محمد بھروکہ کے ساتھ پڑھ دو۔ انہوں نے جا کر ایک دوسرے شخص کے ساتھ نکاح پڑھ دیا۔ اس بھروسہ پر کہ خود چپ ہو جائے گا لیکن اس وقت جب اسے اطلاع ہوئی کہ انہوں نے تو دوسرے لڑکے کے ساتھ نکاح کر دیا ہے، اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مٹھائی وغیرہ بعد میں تقسیم کرنا، پہلے مسئلہ دریافت کرو۔ یہ نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔ اب وہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ نکاح صرف زبانی

---

[۱]۔(علامہ شلبی علی ھامش زیلعی۔ ج1 ص317)

ہے۔کیا دوسری جگہ اس لڑکی کا نکاح اس کا والد پڑھا سکتا ہے؟ یا نہیں؟ یا اسی لڑکے کو دے تو دوسرا نکاح پڑھانا ہوگا یا نہیں؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل غلام حسن از نور پورتھل)

جواب

یہ نکاح درست نہیں ہوا کیونکہ وکیل کی اجازت جب مقید اور متعین ہو تو موکل کے خلاف کرنے سے وہ باطل ہو جاتی ہے اور وکیل خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔ جب وکیل وکیل ہی نہیں رہا تو اجازت نہ رہی اور نکاح ناجائز ہوگیا۔ درالمختار میں ہے: **او بخلاف ماسمی الموکل له من الثمن وقع الشراء للوکیل لمخالفة امره ینعزل فی ضمن المخالفة (عینی)**......

ترجمہ: یا اس ثمن کے خلاف جو موکل نے جس کا نام لیا اس کے ساتھ چیز خریدی تو یہ خریدنا وکیل کے لیے ہی ہوگا کیونکہ وکیل نے موکل کے امر کی مخالفت کی۔ اور وکیل اسی مخالفت کے ضمن میں معزول بھی ہو جائے گا۔[1] لہٰذا اب اگر اسی لڑکے کو نکاح کر دینی ہو تو لڑکی سے اجازت لے کر پھر نئے سرے سے نکاح کریں ورنہ جہاں چاہے اس کا والد اس کا نکاح کر سکتا ہے۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ العلیم الخبیر المتعال۔ (۱۳ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ)

سوال ۱۲۲

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص نے ۲۹ رمضان یا ۳۰

۱۔(درمختار۔باب الوکالۃ بالبیع والشراء)

رمضان کوعصر کے بعد چاند دیکھا اور روزہ افطار کرلیا۔اس خیال سے کہ شاید چاند دیکھ کر روزہ افطار کرلینا جائز ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو ناجائز تھا۔وہ کیا کرے؟ اس کی غرض قطعاً مخالفت یا نفس پرستی کی نہیں تھی۔وہ شخص صرف روزہ رکھے یا کفارہ بھی ادا کرے؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔(سائل امیر عبداللہ خان نیازی، فتح پور)

جواب

درالمختار میں ہے: **واعلم ان کل ماانتفی فیه الکفارة محله مااذالم یقع منه ذلك مرة بعد اخری لاجل قصد المعصیة لان فعله اوجبت زجرا له بذلك افتی ائمة الامصار** ،الخ......

ترجمہ: جان تو کہ جس چیز کے اندر کفارہ نہیں ہوتا اس کا محل وہ ہے جو اُس سے معصیت کے ارادہ سے بار بار سرزد نہ ہو کیونکہ اس کا کرنا زجراتو بیخ کو واجب کرتا ہے اسی پر آئمہ نے فتوی دیا۔[1] یعنی اس شخص کو صرف روزہ قضا کرنا چاہیے، کفارہ لازم نہیں ہے۔

سوال ۱۲۳

اگر کوئی شخص میت کو دفن کر کے قبر پر اذان کہے تو یہ جائز ہے یا ممنوع؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اذان صرف فرائض کیلئے جائز ہے اور کسی چیز کے لیے نہیں۔

بینوارحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

درالمختار باب الاذان میں ہے کہ دس چیزوں کے لیے فرائض کے علاوہ اذان دینی

---

[1]۔(درمختار۔باب مایفسد الصوم ومالایفسدہ)

مستحب ہے: فرض الصلٰوۃ و فی اذن الصغیر و فی وقت الحریق و للحرب الذی و فی خلف المسافر والغیلان ان ظهرت، الخ......علامہ شامی اسی عبارت کے ماتحت فرماتے ہیں: قیل و عند انزال المیت القبر قیاسا علی اول خروجه الدنیا لکن رواه ابن جحر فی شرح العباب وعند تغول الغیلان اے عند تمرد الجن لخبر صحح فیه ۔ اقول ولا بعد فیه عندنا اه اے لان ماصح فی الخبر فهو مذهب للمجتهد وان لم ینص علیه لما قدمناه فی الخطبة عن الحافظ عبدالبر و العارف الشعرانی عن کل من الائمة الاربعة انه قال اذا صح الحدیث فهو مذهبی علی انه من فضائل الاعمال یجوز العمل بالحدیث الضعیف کما مر۔ [1] . . . و حرر مولانا التحریر العلام والبحر القمقام سیدی و والدی رحمه اللّٰه تعالیٰ علی قول العلامة الشامی قیاس و فیه مافیه لانه لاضرورة اے القیاس لان حدیث لقنوا موتاکم نص فی هذا الامر لانه من باب التلقین اه ک و یقول العبد الضعیف غفرله ان ورد فی الحدیث دعونی اصلی اے یظهر للمیت فی هذا الوقت انه وقت العصر و یتاخر صلوته فیقول للملائکته دعونی اصلی فالاذان فی هذا الوقت من احسن التلقیناً (شوقؔ)

قال صاحب المراقی الفلاح و تلقینه بعد وضعه فی القبر مشروع الحقیقة قوله ﷺ لقنوا موتاکم شهادة ان لا اله الا اللّٰه ۔ اخرجه الجماعة الا البخاری ونسب اے السنة والجماعة وقیل لا یلقن فی القبر ونسب الیٰ المعتزلة وقیل لا یؤمر ولا ینهی عنه، الخ......

آگے چل کر یہی صاحب لکھتے ہیں: وقلت و یمکن وایده علامة الطحطاوی

---

[1]۔ (فتاوی شامی ۔ ج 1 ص 269)

رحمه اللّٰہ تعالیٰ شرحه ص ۳۳۸۔ الجمع فیلقن عند الاحتضار (اے قرب الموت) یصرح قوله ﷺ فانه لیس مسلم یقولها عند الموت الا انجته من النار و عملاً بحقیقته موتاکم لتشبیه السوال فی القبر لما روی عن سعید بن منصور و سمرة ابن حبیب و حکیم ابن عمیر۔ قالو اذا سوی علی المیت قبره وانصرف الناس کانوا یستحبون ان یقال للمیت عند قبره یا فلان قل لااله الا اللّٰہ ثلث مرات قل ربی اللّٰہ و دینی الاسلام و نبی محمد ﷺ انی اتوسل الیک بحبیبک المصطفیٰ ان ترحم فاقتی بالموت علی الاسلام والایمان وان تشفع فینا نبیک علیه افضل الصلاة والسلام، طحطاوی ص ۳۳۸-۳۳۹۔ گویا حدیث صحیح ''دلقنوا موتاکم'' کا مصداق حقیقی اموات حقیقیہ ہیں اور تلقین بعد الدفن مسنون ہے اور یہی اہلسنت و جماعت کا مذہب ہے اور ممانعت معتزلہ کا مسلک ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار اور صحیح حدیث پر عمل ائمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے۔ کمامر۔ (ذیقعد ۱۳۸۸ھ)

سوال ۱۲۴

ایک شخص ہر وقت خاموش رہتا ہے، لکھ پڑھ سکتا ہے، جو سوال کیا جائے صحیح جواب دیتا ہے، شادی کے لیے کہا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، میرا دماغ صحیح نہیں ہے، کھاتا پیتا بھی صحیح ہے، اس کی طلاق ہوسکتی ہے یا نہیں؟ (سائل از کمر مشانی)

جواب

میرے خیال میں اگر وہ سمجھتا ہے کہ میں طلاق دے رہا ہوں یا لکھ رہا ہوں اور اس

سے میری عورت مطلقہ ہوجائے گی تو طلاق ہوجائے گی ورنہ نہیں۔

بحر الرائق میں ہے: **قال الرملی فی حواشی المراد بالمدهوش من ذهب عقله من ذهل اووله لامطلق تحیر۔ وهذا الذی یجب ان یفسربه اذا التحیر لایمنع وقوع للطلاق۔**

خلاصہ عبارت: مدہوش سے مراد وہ شخص ہے جس کی عقل شدت تحیر کی وجہ سے چلی جائے مطلق تحیر مراد نہیں ہے۔ مدہوش کی اس طرح تفسیر کرنا ضروری ہے کیونکہ محض تحیر طلاق کے وقوع سے مانع نہیں ہے۔[1]

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری رحمہم اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے بھنگ پی لی ہے اور وہ اس کے سر چڑھ گئی ہے اور اس حالت میں طلاق کہہ دی تو کیا واقع ہوگی؟ فرمایا: **ان کان حین یشرب یعلم انه ماهو فهی طالق۔ وان لم یعلم لم تطلق۔**[2]

ترجمہ: اگر پیتے وقت اس کو معلوم تھا کہ یہ کیا ہے تو عورت کو طلاق ہوجائے گی اور اگر اس کو معلوم نہیں تھا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

سوال ۱۲۵

مسئلہ وراثت ......محمد حیات متوفی کی ایک بیوہ ہے، چار لڑکیاں ہیں، دو بہنیں ہیں، ایک بھتیجا ہے، تین بھتیجیاں ہیں، یہ سب زندہ ہیں۔

۱۔ ان مندرجہ بالا ورثا میں کون ذوی الفروض ہیں، کون عصبات ہیں، کون ذوی

---

[1]۔(بحر الرائق۔ج3 ص249)

[2]۔(خلاصۃ الفتاوی۔ج1 ص75)

الارحام ہیں۔

۲۔ کیا ذوی الفروض کی موجودگی میں ذوی الارحام کو حصہ ملتا ہے یا نہیں؟

۳۔ متوفی کی بیوی خاوند سابق کے بھانجے سے نکاح ثانی کر لیا ہے اور انہیں سابقہ مکانات میں رہائش پذیر ہے۔

۴۔ کیا وہ کمسن لڑکیاں ماں کے ساتھ رہ سکتی ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو ان کی پرورش کون کر سکتا ہے؟

۵۔ متوفی حنفی المذہب مسلمان تھا۔

بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔ (سائل محمد نواز ولد محمد خان وڈھل، از علاقہ رنگ پور بگھور)

جواب

۱۔ اصحاب فرائض بارہ اشخاص ہیں۔ چار مرد، خاوند، باپ، دادا، مادری بھائی ...... اور آٹھ عورتیں، حقیقی بہن (پدری مادری)، پدری بہن، مادری بہن، بیٹی، پوتی، بیوی، ماں، دادی ...... ماں، باپ، بیوی اور بیٹے ایسے وارث ہیں جنہیں کوئی محروم نہیں کر سکتا، ہر حال میں انہیں حصہ ملتا ہے۔ دوسرے وارث ایسے ہیں جو بعض صورتوں میں محروم ہو جاتے ہیں مثلاً باپ کی موجودگی میں دادا محروم ہو جائے گا، بیٹے کے ہوتے پوتی کو حصہ نہیں ملے گا، علی ہذا ......

عصبات وہ وارث ہیں جو اصحابِ فرائض کے بعد کل ترکہ سمیٹ لیتے ہیں۔ ان کی تین قسم، عصبہ، بنفسہ (مستقل رشتہ دار)، عصہ بالغیر عصبہ مع الغیر۔ پہلا وارث ہے جس کی نسبت الی المیت میں عورت کا واسطہ نہ ہو مثلاً بیٹا، پوتا، باپ، دادا، بھائی، بھتیجا، چچا اور اس کی اولاد۔ دوم بیٹیاں، پوتیاں، بہنیں، بھائیوں کے ساتھ مل کر عصبہ کہلائیں گی۔ ذوی الارحام جو پہلے دو ورثا کی عدم موجودگی میں حق دار ہو سکتے

ہیں جیسے سگی بھتیجیاں، مادری بھائیوں کی اولاد، ماموں، خالائیں، پھوپھیاں، چچا کی بیٹیاں وغیرہ۔

۲۔ متوفی مذکور کی لڑکیاں قریب البلوغ ہونے تک ماں کے پاس رہ سکتی ہیں، اس کے بعد مرد وارثانِ بازگشت ان کو لے سکتے ہیں۔

۳۔ بیوہ اور لڑکیاں اپنے حصہ جائیداد کے طور پر جو مکان انہیں مل سکتا ہے، اس میں رہ سکتی ہیں۔لہٰذا میت مذکور کی جائیداد اس طریقہ پر تقسیم ہوگی۔

بیوہ	لڑکیاں (چار)	بہنیں (دو)	بھتیجا	بھتیجیاں
۱/۸	۲/۳	۱/۸ بحصہ برابر	محروم	محروم

کیونکہ بہنیں بوجہ دختران میت عصبہ ہوجائیں گی اور قریب ہونے کے یعنی جزو اصل قریب ہونے کو بھتیجے کو محروم کردیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۱۲۶

معروض آنکہ محدود و محصور اہلِ علم اس مسئلہ میں متردد ہیں برائے رفع تردد لاحقہ حضور کو حکم منظور کر کے تحریری جواب کے منتظر ہیں مثلاً زید نے صوم رمضان کے باوجود نصف دن تک بار برداری کا کام کیا، تھک کر گھر گیا اور ماں اور بیوی سے جھگڑا شروع کیا اور غصہ میں بیوی کو مخاطب ہو کر تین طلاق لفظ سے مطلقہ کیا حاضرین مجلس اور بیوی اس کی شہادت دیتے ہیں اور وہ خود کہتا ہے کہ مجھے غصہ کی وجہ سے اپنے کلام اور خطاب کا پتہ نہیں ہے کہ میں نے کیا کہا ہے۔کیا شرعاً طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

(المفتی بشیر خان از پہاڑ پور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان)

جواب

گواہان اور حاضرین جو اس وقت وہاں موجود تھے، اگر حلفیہ شہادت دیں کہ طلاق دینے سے پہلے کوئی ایسی بات یا فعل اس سے صادر ہوا ہو جس سے انہوں نے محسوس کیا ہو کہ اس کا دماغ درست نہیں رہا، پھر تو اس کا دعوی عدم علم مسموع ہوگا ورنہ گواہان کی بات معتبر ہو گی اور اس پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ ویسے اکثر آدمی طلاق دینے کے بعد یہی کہتے ہیں کہ صاحب ہمیں اس وقت ایسا غصہ تھا کہ ہمیں معلوم ہی نہیں رہا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور یہ بات بالکل غلط ہوتی ہے کیونکہ انہیں طلاق دینے کا ہوش ہوتا ہے اور دوسری کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ فتاویٰ شامی میں ہے : **فالذی ینبغی التعویل علیه فی المدهوش ونحوه اناطة الحکم بغلبة الخلل فی اقواله وافعاله الخارجة عن عادته ۔**

خلاصہ عبارت: مدہوش آدمی جس کی طلاق واقع نہیں ہو گی وہ ہے کہ جس کے اقوال، افعال کے اندر اتنا غلبہ آ جائے جو عام حالت کے علاوہ ہو۔ علامہ شامیؒ کا قول فقہی نقطہء نظر سے نہایت وقیع اور مبنی پر انصاف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (۱۸ جنوری ۱۹۷۰ء)

سوال ۱۲۷

ایک موچن جو ایک جمعدار کی پیر بہن تھی اور کسی سفر کے دوران ایک دن ضلع جہلم میں ان کے گھر رات گزاری۔ جمعدار صاحب کافی معمر ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مذکورہ جمعدار صاحب نے نکاح کا دعویٰ کر دیا۔ مسماۃ مذکورہ منکر ہے اور جو جعلی اندراج بتایا گیا ہے، اس کا انگوٹھا مسماۃ سے نہیں ملتا۔ ایک مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ اسلام میں ذات پات کا سوال کوئی نہیں اور عورت کو کلی اختیار ہے کہ وہ اولیاء کے بغیر نکاح کرے یا اولیاء کے نکاح کو

توڑ دے۔ اور مجلس میں اقرارِ زوجیت سے بھی نکاح ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا اس صورت میں واقعی نکاح ہو جاتا ہے؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ۔

(سائل سجادہ نشین صاحب، رسول نگر ضلع گجرات)

جواب

شریعتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نکاح کے معاملہ میں کفو کا لحاظ ضروری سمجھا گیا ہے کیونکہ نکاح محبت مودت رشتہ داری کنبہ سازی نسل کشی اور مفاخرت کے لیے کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو قرآن کریم: **فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا** اور اگر کفو نہ ہو یا اسکا لحاظ نہ رکھا جائے تو یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں۔ الا ماشاء اللہ۔

ہدایہ شریف میں ہے: **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الا لا یزوج النساء الا الاولیاء ولا یزوجن الا من الاکفاء۔**

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ خبردار عورتوں کا نکاح ولی ہی کریں اور صرف کفو سے کریں۔[1]

وعن عائشۃ انکحوا الاکفاء وقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا علی ثلاث لا تو خرہ الصلوٰۃ اذا اتت والجنازۃ اذا حضرت والایم اذا وجدت لھا کفوا......

ترجمہ: تین چیزوں کو موخر نہ کر نماز جب اس کا وقت آ جائے اور نماز جنازہ جب حاضر ہو جائے اور عورت جب کفو کو پائے۔[2]

قابلِ غور بات کفو کا معنی ہے مثل یعنی موزوں رشتہ...... موزونیت نسب، حسب، مال، علم، تقویٰ، عزت دینی و دنیاوی، پیشہ، حرفت ان سب چیزوں میں تلاش کرنی ضروری

---

[1]۔ (ہدایہ۔ ج2 ص341)

[2]۔ (اخرجہ الترمذی) حاشیہ ہدایہ ص341

ہے۔کفو کا معنی قوم نہیں ہے۔

کفوان اے مثلان مخالف ان احادیث سے استدلال نہیں کرسکتا جس میں فرمایا گیا ہے: **الناس سوا سیته کا سنان المشط**۔ لافضل لعربی علی عجمی کے متعلق ابن ھمام صاحب فتح القدیر فرماتے ہیں کہ نکاح کے معاملہ میں کفو کا لحاظ لازم ہے: **قلنا مارویناه یوجب حمل مارووه علی الآخرة جمعا بین الادلة**۔اھک......[1]

لیکن میرے خیالِ ناقص میں فقہا کرام کا مسئلہ کفو کو صرف شرفا اور امراء کے لیے لازم سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ فقہا نے اولیا کو فسخ نکاح کا اختیار اس لیے دیا ہے کہ ان کی بے عزتی ہوتی ہے اور انہیں عار لاحق ہوتی ہے۔

کیا غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی اور اسے عار لاحق نہیں ہوتی؟ لہٰذا یہ تصور کہ اسلام میں ذات پات کا کوئی سوال نہیں، یہ صرف ان لوگوں کا خیال ہوسکتا ہے جن کی ذات پات کوئی نہ ہو۔

۲۔انعقادِ نکاح اور چیز ہے اور اظہار واثباتِ نکاح عندالقاضی اور چیز ہے۔شریعت نے گواہ اظہارِ نکاح اور اثبات کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔لہٰذا جن گواہوں کو اظہارِ نکاح منع کیا جائے یا وہ خود ایسا کریں کسی مصلحت کی بنا پر تو یہ اخفا ہوگا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: **اَعۡلِنُوۡا هٰذَا النِّکَاحَ وَاجۡعَلُوۡهُ فِیۡ الۡمَسَاجِدِ واضربوا علیهِ بالدُّفوفِ** ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اس نکاح کا اعلان کرو اور مسجدوں میں نکاح کرو اور اس پر دف بجاو۔[2]

وعنه قال فصل مابین الحلال والحرام الصوت والدف فی النکاح

۱۔(فتح القدیر۔ج2ص418۔باب الکفاء)

۲۔(مشکوۃ شریف۔ج2ص272)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ حلال وحرام کے درمیان فرق نکاح میں آواز اور دف ہے۔[1]

لہٰذا اخفا اعلان کے منافی ہے جس کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

۳۔ نکاح کے گواہ شاہد حسبہ ہوتے ہیں۔ یعنی خدا واسطے کے گواہ، اور اگر وہ اس واقعہ کی اطلاع نہ دیں، قاضی ان کو رد کرسکتا ہے۔ یعنی ان کی شہادت قابلِ قبول نہیں رہتی۔ مثلاً تن بخشی اور ایسے خفیہ نکاح عرف میں نکاح نہیں کہلاتے اور عرف نص کا درجہ رکھتی ہے۔

۴۔ صرف اقرارِ نکاح سے نکاح نہیں ہوجاتا اگر پہلے باقاعدہ نکاح منعقد نہ کیا گیا ہو۔ فتح القدیر میں ہے: **رجل وامرءة اقراه بالنكاح بحضرة الشهود فقال هی امرءتی وانا زوجها اوقالت هو زوجی وانا امرء ته وقال الآخر نعم لا ينعقد النكاح بينهما لان الاقرار اظهار لما هو ثابت۔ فهو فرع الثبوت۔**

ترجمہ: اگر گواہوں کی موجودگی میں مرد اور عورت نے نکاح کا اقرار کیا مرد نے کہا کہ وہ میری بیوی ہے اور میں اس کا خاوند ہوں یا عورت نے کہا کہ وہ میرا زوج ہے اور میں اس کی بیوی ہوں اور دوسرے نے کہا ہاں تو ان کے درمیان نکاح منعقد نہیں ہوگا کیونکہ اقرار اظہار ہے اس چیز کا جو ثابت ہو اور یہ ثبوت کی فرع ہے۔[2]

لہٰذا یہ اقرار کاذب ہوگا۔ لہٰذا ایسی صورت میں مسماۃ مذکورہ منکر ہے، گواہوں نے اخفا کیا ہے اور یونین کونسل نے اس کی تصدیق نہیں کی اور انگوٹھا بھی نہیں ملتا تو یہ نکاح ثابت نہیں ہوسکتا۔ باقی رہا صرف یہ مفروضہ کہ حنفیوں کے نزدیک عورتِ بالغہ خود مختار ہے اور وہ

---

[1] ۔ (مشکوۃ شریف۔ باب اعلان النکاح والخطبۃ والشرط ج2 ص272)

[2] ۔ (فتح القدیر۔ ج3 ص104، 105، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

جہاں چاہے کفو یا غیر کفو سے نکاح کرسکتی ہے یا توڑ سکتی ہے تو یہ بھی غلط ہے۔

فتح القدیر میں ہے : **وحاصل ماعن علماءنا فی ذالک سبع روایات روایتان عن ابی حنیفة علیہ الرحمۃ تجوز مباشرة العاقله البالغه عقد نکاحها ونکاح غیر ها۔ مطلقا اِلاَّ انَّه خلاف المستحب و هو ظاهر المذهب، وروایة الحسن عنه ان عقدت مع کفو جاز و مع غیرها لا یصح واختیرت للفتویٰ و عن ابی یوسف ثلاث روایات لایجوز مطلقا اذا کان لها ولی ثم رجع الی الجواز مطلقا من الکفو وغیره وعن محمد روایتان انعقاده موقوفا علی اجازة الولی ان اجاز نفذ والا لا۔**

ترجمہ: خلاصہ یہ ہے کہ اس بارے میں ہمارے علماء کرام سے سات روایات آئی ہیں امام اعظم ابوحنیفہ سے دو روایتیں کہ عاقلہ بالغہ کا اپنا اور غیر کا نکاح کرنا جائز ہے ہاں یہ مستحب کے خلاف ہے۔اور یہی ظاہر مذہب ہے اور حسن کی روایت امام صاحب سے اس طرح ہے کہ اگر کفو کے اندر نکاح کیا تو نکاح جائز ہے اور غیر کفو میں نکاح صحیح نہیں ہے۔اور فتوی کے لیے اسی کو مختار سمجھا گیا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے تین روایتیں آتی ہیں کہ جب عورت کا ولی موجود ہو تو اس کا نکاح مطلقا جائز نہیں پھر انہوں نے اس بات کی طرف رجوع کیا کہ کفو کے ساتھ ولی کی موجودگی میں نکاح جائز ہے اور غیر کفو میں جائز نہیں پھر انہوں نے مطلقا جواز کی طرف رجوع کیا۔ چاہے نکاح کفو میں ہو یا غیر کفو میں۔اور امام محمد صاحب سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں کہ اس کا نکاح ولی کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر ولی اجازت دے دے تو نکاح نافذ ہوگا وگرنہ نکاح باطل ہوگا۔[1]

واما ماذکره الطحاوی والکرخی من ان قوله (ابی یوسف) المرجوع

---

[1]۔(فتح القدیر۔ ج3 ص157، باب الاولیا والکفاء)

الیه عدم الجواز وهذا هو المختار للفتوی لفساد الزمان۔ واللّٰہ ولی الرشاد۔

سوال ۱۲۸

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو دو طلاق دیں اور پھر عدت گزر جانے کے بعد کئی سال بعد پھر نکاح کیا اور پھر دو طلاق دے دیں۔ تو کیا اس عورت سے اس کا نکاح بغیر تحلیل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب

ہوسکتا ہے کیونکہ پہلے نکاح سے جو محلیت اور حلت حاصل تھی وہ ختم ہو چکی ہے اور ملک مستحدث نے جو طلاق دی گئی ہے اس کا پہلے نکاح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

بدیں وجہ تحلیل کی ضرورت نہ ہوگی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتبِ فقہ میں جو منقول ہے: **ان الزوج الثانی یهدم مادون الثلاث**...... اور امام محمدؒ کا خیال ہے کہ زوجِ ثانی تین سے کم کو نہیں گرا سکتا ہے یعنی بصورت نکاح جدید اس شخص کو بقیہ طلاق کا اختیار ہو گا۔ اور اس صورت میں مغلظہ ہو جائے گی اور بغیر تحلیل اس کا نکاح ناجائز ہوگا۔ اولاً تو ان دو صورتوں میں تطبیق ہرگز نہیں ہے اور مقیس علیہ کے لیے مطابقت شرط ہے۔ ثانیاً متون میں شیخین کا قول منقول ہے اور فتویٰ کے لیے متون مقدم ہوتی ہے۔

شامی میں ہے: **والعمل بالمتون۔ وهکذا فی الدر۔**[1]

ثالثاً مدارِ مسئلہ اس پر ہے کہ اگر محلیۃ نکاح اور حلت سابقہ موجود ہو تو طلاقیں آپس میں

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ ج4 ص376)

منتظم ہوسکتی ہیں ورنہ نہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل حوالہ جات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے۔

۱۔ عالمگیری میں ہے: **شرطه (اے شرط وقوع الطلاق) قیام القید فی المرءة نکاح او عدة والثانی قیام حل محل النکاح حتی لو حرمت بالمصاهرة بعد الدخول بها حتی و جبت العدة فطلقها فی العدة لم یقع لزوال الحل واذا طلقها ثم راجعها یبقی الطلاق وان کان لا یزیل الحل و القید فی الحال لانه یزیلها فی المآل حتی انضم الیه ثنتان کذا فی محیط السرخسی۔**

ترجمہ: طلاق کی شرط یہ ہے کہ عورت کے ساتھ قید باقی ہو چاہے وہ نکاح والی ہو یا عدت والی چنانچہ اگر دخول کے بعد حرمت مصاھرہ کے ساتھ وہ حرام ہوگئی اور عدت واجب ہوئی پھر عدت میں طلاق دی تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ حلیت زائل ہوگئی اور اگر عورت کو طلاق دے دی پھر اس سے رجوع کرلیا تو طلاق باقی رہے گی اگرچہ وہ فی الحال حلیت کو زائل نہیں کرتی اس لیے کہ وہ آنے والے زمانے میں اس کو زائل کرے گی یہاں تک کہ اگر اس کے ساتھ دو طلاقیں ملائے تو وہ ان دونوں کو رفع کرے گا یہ محیط سرخسی میں ہے۔[۱]

۲۔ **وفی نور الانوار اذا طلق الغیر المدخول بها انت طالق و طالق و طالق لایقع عنده الا واحدا لانه لم یبق المحل للطلاق لوقوع الطلاق الواحد فعلم ان جمع الطلاق الواحد بالواحد اوالرجعی بالبائن و جود الحل الاول والالا۔**

۱۔ (فتاوی عالمگیری۔ ج 1 ص 381، الا باب اول فی تفسیرہ ورکنہ وشرطہ)

خلاصہ عبارت: غیر مدخول بہا عورت کو اگر مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ طلاق دی تو ایک ہی طلاق واقع ہوگی کیونکہ ایک طلاق کے بعد طلاق کا محل باقی نہیں رہتا۔[1]

۳۔ **فی جملة کتب الفقه حیلة اسقاط الطلاق المعلق تنجیز الطلاق البائن و بعد العدة وجدا الشرط فلا یقع الطلاق المعلق وان کان ثلثا لانهالم یبق محلا لوقوع الطلاق المعلق بوجه زوال المحل الاول**

خلاصہ عبارت: فقہ کی کتابوں میں طلاق معلق کو ساکت کرنے کا ایک حیلہ یہ ہے کہ منجز طلاق بائن دے دینا اور پھر عدت کے بعد اگر شرط پائی جائے تو طلاق معلق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ تین طلاقیں ہوں کیونکہ طلاق معلق کے پائے جانے کی وجہ سے طلاق کا محل باقی نہ رہا۔

۴۔ **ان المتون مقدم علی الشروح و فی کل المتون ان الزوج الثانی یهدم ما قبله عنده و عند ابی یوسف وعند محمد مادون الثلاث لا یهدم وهذا هو التوانة المخالفین فی هذا المسئلة لوقوع التحلیل۔ حاشالِلّٰه۔ لان بینهما بون بعید والتطبیق للقیاس شرط لازم والثانی فتوی علی قول الشیخین۔**

خلاصہ عبارت: متون شروح پر مقدم ہے اور تمام متون میں یہ بات آتی ہے کہ دوسرا خاوند پہلے والی طلاق کو شیخین کے نزدیک گرادیتا ہے اور امام محمد صاحب کے نزدیک تین طلاقوں سے کم کو نہیں گراتا۔ فتوی اس مسئلہ میں شیخین کے قول پر ہے۔

۵۔ عالمگیری میں ہے: **ولو طلقها واحد ة ثم راجعها ثم قال جعلت تلك التطلیقة بائنة لاتصیر بائنة ولو قال بعد الدخول اذا طلقتك واحدة**

---

[1]۔(نورالانوار۔ص123)

فهی بائن اوهی ثلاث فطلقها واحدة فانه یملک الرجعة ولا یکون بائنا۔

خلاصہ عبارت: اگر اس کو ایک طلاق دی پھر اس سے رجوع کیا پھر کہا کہ میں نے اس طلاق کو طلاق بائنہ کیا ہے تو یہ بائنہ نہیں ہوگی اور اگر دخول کے بعد کہا جب میں تجھے ایک طلاق دوں تو پس وہ بائن ہے یا تین طلاقیں۔ پھر طلاق دی تو یہ رجوع کا مالک ہوگا اور طلاق بائن نہیں ہوگی۔[1]

۶۔ ہدایہ اور فتح القدیر میں ہے: **ولو قال بها انت طالق کلما شئت فلها ان تطلق نفسها واحدة بعد واحدة حتی تطلق نفسها ثلاثاً حتی لو عادت الیه بعد زوج آخر فطلقت نفسها لم یقع شئی لانه ملک مستحدث۔**

ترجمہ: اور اگر اس کو کہا تو جب چاہے طلاق والی ہے تو اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کے بعد دوسری طلاق دے یہاں تک کہ تین طلاقیں پھر اگر دوسرے خاوند سے نکاح کرنے کے بعد پہلے خاوند کے نکاح میں لوٹ آئی اور اپنے آپ کو طلاق دی تو کوئی چیز واقع نہیں ہوگی کیونکہ یہ ملک جدید ہے۔[2]

۷۔ **فی تحقیق کلما فان تزوجها بعد زوج آخر و تکرر الشرط لم یقع شئی لانه استوفیٰ حقه من التطلیقات المملوکة اوکما قال**

۸۔ فتح القدیر میں ہے: **وان قال لها ان دخلت الدار فانت طالق ثلاثا فطلقها ثنتین وتزوجت بزوج آخر و دخل بها ثم عادت الی الاول فد خلت الدار طلقت ثلاثا عند ابی حنیفة و عند ابی یوسف وقال محمد هی**

---

[1]۔(فتاوی عالمگیری۔ص373)

[2]۔(فتح القدیر۔ج3ص436)

طالق مابقی من الطلاق۔

ترجمہ: اگر اس کو کہا کہ تو دار میں داخل ہوئی تو تجھے تین طلاقیں ہیں پھر اس نے دو طلاقیں دیں اور عورت نے دوسرے خاوند سے نکاح کیا اور دوسرے خاوند نے اس سے دخول بھی کیا پھر یہ پہلے خاوند کی طرف لوٹی اور دار میں داخل ہوئی تو شیخین کے نزدیک اس کو تین طلاقیں ہوں گی اور امام محمد صاحب کے نزدیک جو طلاق باقی ہے وہی واقع ہوگی۔

۹۔ **وفی هذا الصفحة وان قال لها ان دخلت الدار فانت طالق ثلاثا ثم قال لها انت طالق ثلاثا فتزوجت غيره ودخل بها ثم رجعت الی الاول فدخلت الدار لم يقع شئی۔**

ترجمہ: اور اسی صفحہ پر ہے کہ اگر عورت کو کہا کہ تو دار میں داخل ہوئی تو تجھے تین طلاقیں ہیں پھر اس کو کہا تجھے تین طلاقیں ہیں اس نے دوسرے خاوند سے نکاح کیا اور دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ جماع بھی کیا پھر وہ پہلے کے نکاح میں آئی اور دار میں داخل ہوئی تو کوئی چیز واقع نہیں ہوگی۔[1]

ولنا ان جزاء طلقات هذا الملک۔ لانها هی المانعة لان الظاهر عدم مايحدث واليمين تعقد للمنع او الحمل واذا كان الجزاء ماذكرناه وقدفات بتنجيز الثلاث المبطل للمحلية فلا يبقى اليمين۔ بخلاف مااذاابانهالان الجزاءباق لبقاءمحله...

اور آگے چل کر لکھتا ہے: وبطلان الحلية للجزاء يبطل اليمين فهذا كذلک وهذا هو المدار المسئلة المعهودة انظر يا اخی ولا تجهل لان

---

[1]۔ (فتح القدیر۔ج 3 ص 457، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

الجهل کله شوم۔

خلاصہ عبارت: ہماری دلیل یہ ہے کہ ان طلاقوں کی جزاء وہ ملک ہے کیونکہ وہ مانع ہے اور یمین منع کے لیے منعقد ہوتی ہے۔ اور جس وقت جزا وہ چیز ہے جس کا ہم نے ذکر کیا تو تحقیق وہ ان تین طلاقوں کے ساتھ جو کہ محل کو باطل قرار دینے والی ہیں وہ جزاء فوت ہو جائے گی تو یمین باقی نہ رہے گی۔ ہاں جس وقت بائن طلاق دی تو یہ معاملہ الگ ہے کیونکہ جزاء محل کے باقی ہونے کی وجہ سے باقی ہے۔ اور جزاء کے لیے محل کا باطل ہونا قسم کو باطل قرار دیتا ہے۔[1]

۱۰۔ شرح وقایہ باب تفویض الطلاق ج ۲ میں ہے کہ اگر کوئی شخص کلما شئت کے ساتھ عورت کو طلاق دینے کی اجازت دیتا ہے تو وہ تین طلاق اکٹھی بھی نہیں دے سکتی کیونکہ کلما کا عموم افعال اور عموم زماں کے لیے موضوع ہے لیکن ایک ایک کر کے طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے اور اسی طرح اگر وہ دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد پھر پہلے خاوند کے پاس واپس آئے تو اسے تفویض سابق جو کلما کے ساتھ حاصل تھی، سے پھر طلاق دینے کا اختیار نہ ہو گا کیونکہ بقول صاحب عمدۃ الرعایہ یہ ملک مستحدث ہے لہٰذا پہلے اختیار کا تعلق اس پہلے نکاح کے ساتھ تھا نہ ملک جدید کے ساتھ۔ ہذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

(مولوی ناکارۂ خلائق) جناب احمد نور صاحب لکھتے ہیں کہ بہشتی زیور میں مولوی اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے عورت کو ایک طلاق رجعی دے دی پھر میاں راضی ہو گیا اور رجوع کر لیا۔ پھر دو چار برس بعد غصہ آ گیا اور ایک طلاق دے دی۔ پھر غصہ اتر گیا اور عورت کو روک لیا۔ تو یہ دو ہو گئیں۔ پھر اگر کبھی ایک اور طلاق کہے گا تو تین

۱۔ (فتح القدیر۔ ج 3 ص 458)

طلاق ہو جائیں گی۔ لہٰذا بعد میں بغیر دوسرے خاوند کے اس کا دوبارہ نکاح نہ ہو سکے گا۔ اھ...... یہ ہے اس ناکارۂ خلائق کی روشن دلیل جس کو یہ بھی نظر نہیں آیا کہ بات ہو رہی ہے دو طلاق دینے کے بعد عدت گزر جانے کی اور بائن ہو جانے کے بعد پھر نکاح کرنے کی، اگر اس نے ایک طلاق یا دو طلاق کے بعد رجوع کر لیا تو محلیۃ اور ملک اول قائم رہنے کی وجہ سے وہ طلاقین ضرور اکٹھی ہوں گی، **سوال از آسماں اور جواب از ریسماں...**

سبحان اللہ! اور پھر نوٹ دے کر دوبارہ لکھتے ہیں: شوہر اول تجدیدِ نکاح سے ہادم طلاق نہیں۔ ہاں شوہر ثانی ہادم طلاق ہے۔ **ھکذا فی کتب الفقه**۔ کاش اس دعویٰ پر کوئی فقہ کی کتابوں سے ایک جزی پیش کر دیتے لیکن بہشتی زیور سے دیکھ کر مسائل کا جواب لکھنے والے بچارے ایسی نازک باتوں پر کب غور کر سکتے ہیں۔ کتب فقہ سے ممکن ہے جناب کا اشارہ "**ان الزوج الثانی یھدم مادون الثلاث**" کی عبارت کی طرف ہو، جو کنز میں ہے، تو عرض ہے کیا اس کا مطلب ہے کہ دو طلاق بغیر حلالہ نہیں اٹھ سکتیں۔ **یالیت قومی یعلمون**۔

اس طرح مولوی غلام حسین صاحب آف درکھاناں بھی لکھتے ہیں: تجدیدِ نکاح سے پہلی طلاق ختم نہیں ہوگی۔ ہدم طلاق کے لیے زوج الثانی کا نکاح اور دخول شرط ہے۔ گویا ان کے نزدیک بھی دو طلاقوں کو ختم کرنے کے لیے حلالہ شرط ہے۔ ان کا کہنا ہے آئمہ ثلاثہ کا اتفاق ہے کہ نکاح ثانی حلت جدید موجود نہیں کر سکتا بلکہ "مادون الثلاث" باقی رہیں گی۔ (یہی نکتہ قابلِ ثبوت ہے)۔ جس پر ان حضرت نے کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی۔ غالباً ان کے نزدیک وہی سابقہ عبارت نص ہے حالانکہ اگر کوئی شخص دو طلاق دے کر عورت کو ترک کر دیتا ہے اور عدت گزر جاتی ہے اور اجنبیہ ہو جانے کے بعد پھر ایک طلاق دے دے تو وہ واقع ہو جانی چاہیے کیونکہ ان کے نزدیک ملک سابق اور محلیت قائم ہے۔ اسے تو زوجِ ثانی ہی

گرا سکتا ہے۔ سبحان اللہ! اسی طرح علامہ کاظمی صاحب جیسے محقق اور جلیل القدر عظیم المرتبت انسان نے بھی بغیر تعمق فرما دیا ہے کہ اس شخص کے نکاح ثانی سے حل جدید متحقق نہیں ہوئی، لہٰذا مغلظہ ہو جائے گی۔

کیا دو طلاق کے بعد حل جدید ثابت کرنے کے لیے حلالہ ضروری ہے؟

''**فان طلقها**'' کا لفظ تو ملکیت اول کی موجودگی میں انضمام طلاق ثابت پر دال ہے نہ کہ اس پر کہ زوجہ ثانی کا دخول ہی تجدید حلت ثابت کر سکتی ہے۔

انبار میں سے یہی تین رقعے قابلِ غور تھے جن کی حقیقت معلوم...... **اللّٰھم أَرِنَا الحَقَّ حقّاً وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَأَرِنَا البَاطِلَ بَاطِلاً** ......آج ''**الحق یعرف بالرجال**'' کا زمانہ ہے، لہٰذا خاموشی اور منہ بند کر لینے میں عافیت ہے۔ (۲۲ جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ)

تفسیر خازن میں ''**فان طلقها**'' یعنی ''**الطلقة الثلالثة فلا تحل له من بعدای لاتحل له رجعتها بعد الثلاث حتی تنکح زوجا غیره**''[1]

دو طلاق کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ بغیر حلالہ زوج اول کے نکاح ثانی سے حلت جدید متحقق نہ ہو گی۔ یہ دعوٰی بلا دلیل ہے جس سے تفسیر کے سابقہ الفاظ بالکل ابی ہیں۔

کنز الدقائق میں ہے: **قبل الایلاء و فی شرح النقایة ولقد صدق قول صاحب الاسرار مسئلة تخالف فیها کبار الصحابة** رضی اللہ عنہ **یعوز فقها و یصعب الخروج عنها**[2]

۱۔ (تفسیر خازن۔ ج 1 ص 94 آیت نمبر 230)

۲۔ (کنز الدقائق۔ ص 127)

اس مسئلہ میں قابلِ غور باتیں:

''الطلاق مرتان'' کا حکمِ خداوند صرف ایک بار کے لیے صادر نہیں ہوا بلکہ جب بھی مغلظہ ہوئے بغیر پھر نکاح کرے گا، اس کے لیے یہی حکم ہوگا ورنہ دوسرا حکم قرآن میں دکھایئے۔''**فان طلقها**'' سے مراد بعد از امساک بالمعروف فی العدۃ تیسری طلاق کہے تو حلالہ لازم ہوگا ورنہ دو طلاق کے بعد اگر عدت گزر جائے اور پھر تیسری طلاق کہے تو کیا کسی امام کے نزدیک واقع ہوگی؟ ہرگز نہیں کیونکہ جب حلت اور محلیۃ باقی نہیں رہی۔ اگر ملک اور محلیۃ باقی ہے تو اسے لازمی سابقہ دو طلاقوں سے منظم ہونا چاہیے۔ اگر ملک ختم نہیں ہوا تو پھر تجدید نکاح کی ضرورت کیوں ہے؟

کیا بغیر تجدید نکاح بھی اس عورت سے وطی کر سکتا ہے؟ اگر نہیں کر سکتا بوجہ حلت ختم ہو جانے کے تو پھر لازماً دوسرے نکاح سے حل جدید متحقق ہوگی۔

''**ان الزوج الثانی یهدم دون الثلاث**'' کا اگر یہ معنی ہے کہ دوسرے مرد کا نکاح اور دخول ہی دو طلاقوں کو گرا سکتا ہے تو پھر دو طلاق کے اثر کو ختم کرنے کے لیے حلالہ ضروری ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ فقہ کا یہ جملہ اس بات سے ساکت ہے کہ زوج اول اگر نکاح جدید کرے تو حلت جدید متحقق ہوگی یا نہیں؟ بصورت عدم تحقق یہ مفہوم مخالف ہوگا کہ زوجِ ثانی تو حلت جدید پیدا کر سکتا ہے، زوج اول نہیں اور مفہوم مخالف ہمارے اصول پر حجت ہی نہیں ہے۔

سوال ۱۲۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ جلسہء وعظ یا جمعہ کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر بلند آواز سے مل کر صلاۃ وسلام پڑھتے ہیں، جائز ہے یا ناجائز؟ ایک شاہ

صاحب فرماتے ہیں کہ مل کر بلند آواز سے ہاتھ باندھ کر صلاۃ وسلام پڑھنا بالکل ناجائز ہے۔اس کی دو دلیلیں وہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر سے **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا** کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس آیت شریف جس میں صلاۃ وسلام کا حکم فرمایا گیا ہے، وہ کس طرح پڑھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ الی الآخر**۔آیت سے صرف وہی صلاۃ وسلام مراد ہوسکتا ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے، دوسرا نہیں۔

۲۔ ایک وعظ کی کتاب میں آیت **اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خفية** کے ماتحت انہوں نے دعا کو چیخ چیخ کر پڑھنے سے منع فرمایا ہے لہٰذا صلاۃ وسلام کا یہ طریقہ ناجائز ہے

جواب

۱۔ **حدثنا یعقوب بن حمید بن کاسب حدثنا عبید اللہ بن عبد اللہ الاموی عن صالح بن محمد بن زائدہ قال سمعت القاسم بن محمد یقول کان یستحب لرجل اذا فرغ من تلبیته ان یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔**

ترجمہ: قاسم بن محمد کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ انسان جب تلبیہ سے فارغ ہو تو اس کے لیے درود شریف پڑھنا مستحب ہے۔[1]

۲۔ **عن علی بن حسین عن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذا مررتم بالمساجد فصلوا علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔**

---

[1]۔(جلاء الافہام۔ص89)

ترجمہ: حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جب تم مسجدوں سے گزرو تو درود پڑھو۔[1]

۳۔ **عن ابن اسحاق قال سمعت سعید ابن حجران قال قلت لعلقمة مااقول اذا دخلت المسجد قال تقول صلی اللّٰہ وملائکته علی محمد السلام علیک ایها النبی ورحمته اللّٰہ وبرکاته**

ترجمہ: سعید بن حران کہتے ہیں جب میں مسجد میں داخل ہوں تو مجھے کیا کہنا چاہیے۔انہوں نے جواب دیا کہ یہ کہو **السلام علیک ایها النبی ورحمته اللّٰہ وبرکاته**۔[2]

۴۔ طوافِ کعبہ کے بعد حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ جب تم کعبہ شریف کے پاس آؤ تو سات دفعہ طواف کرو پھر مقامِ ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز پڑھو پھر صفا پر کھڑے ہو کر کعبہ شریف پر نظر ٹھہرا کر سات دفعہ تکبیر پڑھو اور ہر دو تکبیروں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھو پھر اپنے لیے دعا مانگو پھر مروہ پر اسی طرح کرو۔

۵۔ **عن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص انه سمع النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول اذا اسمعتم الموذن فقولو مثل مایقول ثم صلوا علی فانه من صلے علی صلاة صلی اللّٰہ علیه عشرا،** ......

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا وہ فرماتے ہیں جب تم موذن کو سنو تو تم وہ کہو جو موذن کہتا ہے پھر تم مجھ پر درود

۱۔(جلاء الافہام۔ص89)

۲۔(جلاء الافہام۔ص89)

پڑھو، بے شک وہ جو مجھ پر درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔[۱]۔ یہ سب احادیث مبارکہ وہابیہ کے امام ابن قیم نے جلاء الافہام میں نقل کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ صلاۃ وسلام طواف، اذان، رویت مساجد ذکر پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر باعثِ ثواب وبرکت ہے۔

۶۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص دوست رکھتا ہے کہ اس کے لیے انعام واکرام کا پیمانہ بھر کے مکمل کردیا جائے تو وہ جب درود بھیجنے لگے تو کہے **اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاَزْوَاجِہٖ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَذُرِّیَّتِہٖ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔**[۲]

مندرجہ بالا مختلف احادیث سے معلوم ہوا کہ ابن کثیر نے جو حدیث نقل فرمائی ہے، وہ بھی صحیح ہے لیکن اس میں صرف نماز کے اندر جو درود شریف پڑھا جاتا ہے، وہ مراد ہے۔ بندہ نے جو چند احادیث نقل کی ہیں، یہ اختصار کی وجہ سے ہیں ورنہ سینکڑوں روایات ہیں جن میں درود شریف مختلف الفاظ سے منقول ہے۔

۷۔ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ذکرِ جہر خواہ کوئی ذکر ہو، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سوا ان مواقع کے ثبوت جہر نص سے وہاں مکروہ ہے اور صاحبین اور دیگر فقہا ومحدثین جائز کہتے ہیں اور مشرب ہمارے مشائخ کا اختیار مذہب صاحبین ہے۔[۳]

۱۔(مشکوۃ شریف۔ج 1 ص 65، باب فصل الاذن واجابۃ الموذن)

۲۔(مشکوۃ شریف۔ ص 79)

۳۔(فتاوی رشیدیہ۔ج 3 ص 104)

والسلام دلائل الخیرات جیسے اولیاء اللہ کے چاروں سلسلے ہی روز پڑھنا باعثِ ثواب سمجھتے ہیں، وہ سب مختلف درود شریف ہیں جن کے متعلق حضرت سلیمان جزولی مولف کتاب کا دعویٰ ہے کہ ان سب درودوں کی سند آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتی ہے جو میں نے بخوفِ طوالت نقل نہیں کی۔

باقی رہی دوسری دلیل کہ "**اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً**" چیخ کر دعا نہیں مانگنی چاہیے، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اس آیہ شریف میں دعا کا ذکر ہے نہ کہ صلاۃ و سلام کا۔ بے شک دعا میں تضرع اور اخفا بہتر ہوتا ہے۔

تفسیر روح البیان میں ہے: **اے متضرعین متذللین مخفین الدعاء لیکون اقرب الی الاجابۃ** ۔ترجمہ: عاجزی کرنے والے دعا کو پوشیدہ طریقے سے مانگنے والے تا کہ ان کی دعا جلدی قبول ہو۔[1]

تفسیر خازن میں ہے: **والادب فی الدعا ان یکون خفیا لھذہ الایۃ** ۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **اما رفع الصوت بالذکر جائز کما فی آذان والخطبۃ والجمعۃ والحج ۔الخ**۔

مندرجہ بالا آیات واحادیث واقوالِ فقہ سے واضح ہے کہ درود شریف کا اذان، جمعہ اور مجالسِ خیر کے اختتام پر مل کر بلند آواز سے صلاۃ وسلام پڑھنا ہرگز منع نہیں ہے، باعثِ ثواب وبرکت ہے کیونکہ درود پاک ذکر ہے اور ذکر ہر طرح جائز ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ارتعو ریاض الجنۃ** ،یعنی بہشتوں کے باغ میں چرا کرو۔ عرض کیا گیا کہ بہشت کے باغ کیا ہیں؟ فرمایا: حلق الذکر، یعنی جہاں چند لوگ مل کر ذکر کر رہے ہوں۔ یہ بالکل مختصر عرض ہے ورنہ دلائل کے انبار موجود ہیں۔

---

[1]۔(تفسیر روح البیان۔ج 3 ص 177)

سوال ۱۳۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک شخص سے ماں اور ماموں نے بالجبر طلاق نامہ جو پہلے لکھا جا چکا تھا، اس پر دستخط کروائے جو اس نے نہایت مجبوری سے کیے کیونکہ اس کی والدہ اپنی خودکشی کی دھمکی دیتی تھی۔ دستخط کرنے کے بعد اس نے زہر کھالی مگر ڈاکٹروں نے اسے بچا لیا۔ کیا اس کتابت اور طلاق نامہ پر دستخط کرنے سے اس کی بیوی مطلقہ ہو جائے گی حالانکہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ اکراہ سے کوئی عمل کیا جائے، اس پر مواخذہ نہیں ہوسکتا جیسا کہ کلمہء کفر ہے۔ طلاق تو کفر سے ادنیٰ شئے ہے اور یہی امام شافعیؒ اور ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے۔ حضرت امام صاحب کے نزدیک بھی تلفظ بالطلاق بالجبر پر تو وقوعِ طلاق کا حکم ہے نہ کہ کتابتِ بالجبر پر۔

بحر الرائق میں ہے: **رجل اکرہ بالضرب والحبس علی ان یکتب طلاق امراتہ وکتب فلانة بنت فلان طالق لا تطلق**، الخ...... اب آپ اپنی رائے سے مستفید فرماویں۔ (مولوی فقیر عبید اللہ صاحب از موچھ، ۹ مئی ۱۹۷۲ء)

جواب

بے شک صاحب! بحر الرائق نے مطلقاً لکھا ہے لیکن فتاویٰ عالمگیریہ اور قاضی خان اور خلاصۃ الفتاویٰ میں تصریح ہے:

''**رجل لو أكره بالضرب و الحبس**'' اور صاحب بحر کے اطلاق سے بھی اکراہ متعارف مراد ہوگا اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں، ماموں اور والدہ سے اکراہ مذکور کا پایا جانا مفقود ہے، لہٰذا وقوعِ طلاق کو ترجیح ہوگی میرے خیالِ ناقص میں۔[1]

---

[1] ۔(فتاوی عالمگیری/ فتاوی قاضی خان۔ص 573 / خلاصۃ الفتاوی۔ج 1 ص 91)

آپ دیگر اصحابِ علم سے بھی مشورہ فرماویں۔ میرے لیے زیادہ کتب کی ورق گردانی آج کل مشکل ہے۔ ھداکم اللہ تعالیٰ

سوال ۱۳۱

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اندریں مسئلہ کہ نانی نے اپنے نواسے کو اپنا دودھ چپ کرانے کے لیے پکڑایا۔ کسی نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو کہیں کل آئندہ رشتوں میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے تو اس نے جواب دیا کہ میرا دودھ خشک ہے اور کچھ بھی نہیں آتا۔ بچہ رورو کر ہلکان ہوتا ہے، اس لیے میں اسے چپ کرانے کے لیے پکڑا دیتی ہوں۔ کیا اب اس لڑکے کو اپنی خالہ کی لڑکی نکاح کی جاسکتی ہے؟ بینوا رحمکم اللہ تعالیٰ

(سائل از چک نمبر 1 ایم ایل)

جواب

بحر الرائق میں ہے۔ وفی القنیہ **امرءة کانت تعطی ثدیھاصبیة واشتھر ذلک بینھم ثم تقول لم یکن فی ثدی لبن حین القمتھا تدین** ......

ترجمہ: قنیہ میں ہے کہ ایک عورت نے اپنا پستان بچی کے منہ میں دیا اور یہ بات لوگوں میں مشہور ہوگئی پھر عورت نے کہا جس وقت میں نے پستان منہ میں دیا اس وقت اس میں دودھ نہیں تھا۔ تو عورت کی تصدیق کی جائے گی۔[1]

یعنی اس عورت کی بات کو دیانۃً درست سمجھا جائے گا۔

کیونکہ ''**ولا یعلم ذلک الامر الامنھا جاز لاینھیٰ ان یتزوج بھذہ**

[1]۔(بحر الرائق۔ ج3 ص222۔ کتاب الرضاع)

الصبية'' اورفتویٰ ہمیشہ دیانت پر دیا جاتا ہے۔لہٰذا بلاشبہ اس لڑکے کا نکاح خالہ کی لڑکی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

سوال ۱۳۲

عن بعض الاخوان والخلان هل يجوز الاسقاط قبل خمسة اشهر ام لاللضرورة۔ اے اسقاط الحمل۔

ترجمہ: بعض بھائیوں اور بعض دوستوں کی طرف سے سوال کیا گیا کہ آیا پانچ ماہ سے قبل ضرورۃ حمل ساقط کرانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب

فتاوی شامی میں ہے: **قالوا يباح اسقاط الولد قبل اربعة اشهر ولو بِلا اذن الزوج۔**

ترجمہ: علماء کرام نے فرمایا کہ حمل کا چار ماہ سے قبل گرانا جائز ہے اگرچہ خاوند کی اجازت نہ بھی ہو۔[1]

وقال العلامة الشامی وفی کراهية الخانية لااقول بالحل۔ قال العلامة الشامی رحمهم الله تعالیٰ ان قاضی خان مسبوق کامر من التفقه ونقل عن ابن وهبان فاباحة الاسقاط محمول علی حالة العذر اوانها لاتاثم اثم القتل اه۔

ترجمہ: ابن ہبان سے منقول ہے کہ حمل کا گرانا عذر کی حالت میں جائز ہے یا اس کا

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔ج2ص412،)

مقصد یہ ہے کہ اس سے قتل کا گناہ نہیں ہوگا۔[1]

وھذا ھو القریب من الفھم۔ وعلی ھذا النھج مسئلة

ترجمہ: یہ سمجھ کے قریب ہے اور اسی بناء پر مسئلہ ہے۔

"برتھ کنٹرول": **هو فی زماننا معروف وقد صرف علیه حکومتها وحکومت الامیریکیه قریبا من الآف الآف ڈالر وقد جعلوه مسئلة المعاش و الرزق۔**

ترجمہ: برتھ کنٹرول یہ ہمارے زمانے میں مشہور ہے اور تحقیق اس پر حکومت نے اور امریکیہ حکومت نے کروڑوں ڈالر خرچ کیے اور اس کو معیشت اور رزق کا مسئلہ بنایا۔

سوال ۱۳۳

غالباً یہ فتویٰ قاضیانِ مٹھہ ٹوانہ کا ہے۔ دلچسپ ہے، اس لیے اس کی نقل کر دی گئی ہے۔ یہ نقل مجھے مولوی غریب الٰہی پیش امام اوکھلی موہلہ نے دریافت مسئلہ کے لیے بھیجی ہے۔ (مسئلہ حیلہ واسقاط)

جواب

بوقت ضرورت شرعی حیلہ کرنا جائز ہے۔ قرآن حکیم اور احادیثِ صیحہ میں اس کا ثبوت موجود ہے۔

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا تھا کہ بنیامین اپنے پاس رکھیں اور راز بھی نہ کھلے سو اس کے لیے ایک حیلہ فرمایا جس کا ذکر پارہ **وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ** میں مذکور ہے۔

---

[1]۔ (فتاویٰ شامی۔ ج2 ص412)

۲۔ اس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی بیوی کو سو(100) کوڑے ماروں گا۔اللہ کریم نے انہیں ایک حیلہ تعلیم فرمایا تھا کہ تم ایک جھاڑو لے کر ان کو مارو اور اپنی قسم نہ توڑو: **وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ**

۳۔ زکوٰۃ کا مال اگر مساجد پر لگانا ہو تو عندالضرورۃ ایک مسکین کے ذریعہ مسجد پر خرچ کیا جاسکتا ہے، تسلی کے لیے دیکھیے بہشتی زیور از مولوی تھانوی ، یہ بھی ایک حیلہ ہے۔

۴۔ قرآن حکیم روزے کے فدیہ کا حکم ہے **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ** ۔مجبور بوڑھا جب روزہ رکھنے کے قابل نہ رہے تو ہر روزے کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے اور نماز روزے سے زیادہ مہتم بالشان ہے۔

شرح وقایہ میں ہے: **وفدية كل صلاة كصوم يوم وهو الصحيح۔**

ترجمہ: ہر نماز کا فدیہ ایک دن کے روزے کی طرح ہے اور وہی زیادہ صحیح ہے۔[۱]

شرح الیاس میں ہے: **ويعتبر كل صلوٰة فائت كصوم يوم اے كفدية يوم فتح القدير طحطاوی علی مراقی الفلاح۔**

نورالایضاح کمافی اسقاط الصوم والصلوٰۃ میں فدیہ نماز روزہ کا ثابت ہے۔

اشباہ والنظائر، بحر الرائق ، عینی شرح کنز، جامع الرموز، فتاویٰ قاضی خان، مخالفین کے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب الدرجات پر لکھتے ہیں: حیلہ اسقاط علماء نے مفلس کے لیے وضع کیا ہے۔ چونکہ ہر نماز روزہ کا فدیہ ادا کرنا ہر شخص کی طاقت سے باہر ہے، اس لیے علماء نے اسقاط واجبات کا حیلہ ذکر فرمایا ہے۔

انواع بارک اللہ ص ۲۶۶-۲۶۷ پر ہے:

باراں سال نبالغ مرداں کڈھ حسابوں لیون

۱۔(شرح وقایہ۔ج1ص315، کتاب الصوم بیان فدیۃ الصوم)

عمر زنان نو سال گھٹاون باقی فدیہ دیون
ہر نماز تے روزے بدلے کنک اَدھ ٹوپہ آئی
جیوں کر باب قضایاں اندر سب بیان تھیائی
ہے بہت قضایاں ترکہ تھوڑا حیلہ روا بتاون
سب فدیے دی کنک جو آوے قیمت کل بناون
قیمت کرن روپے کنکوں چیز لون فر کائی
یا مصحف قیمت قدر معین دیون بہر خدائی
فر ولی مسکین نوں بخشے ولی دیوے استائیں
مڑ مڑ دیوے موڑے اینویں قیمت کل پوجائیں
ایہ حیلہ وقت ضرورت ہے جس ترکہ ہووے تھوڑا
جے ترکہ بہت تا گندم دیون ثلثوں پھٹ نہ پھوڑا

انواع ص ۱۴۲ پر ہے:

دفنوں پیش دعا تصدق روا ایہی قرآن
اے جو کوئی نیت میت جائز کتب عیان

حاشیہ پر ہے یعنی قرآن مجید خواندہ بخشیدن بمیت یا مصحف بیکے دادن برائے میت ......عاقل کے لیے اتنا کافی ہے اور جاہل کے لیے دفتر بھی بے سود ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

سوال ۱۳۴

کیا نیابتہً حج کرنے والا میقات پر آمر بالحج کی طرف سے دوسرے آدمی کو احرام

بندھوا سکتا ہے یا نہیں؟ وہ خود اپنے حج کا احرام باندھ لے؟

(سائل مولوی محمد صادق از ڈھڈ یانوالہ، مارچ ۱۹۷۳ء)

جواب

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **اذا مرض المامور بالحج فی الطریق لیس له دفع المال الی غیره لحج ذلک الغیر عن المیت الااذا اذن له بذلک بان قیل له وقت الدفع اصنع ماشئت۔**

ترجمہ: جس وقت حج بدل کرنے والا راستے میں بیمار ہو جائے تو اس کے لیے دوسرے شخص کو حج کی ادائیگی کے لیے مال دینا جائز نہیں ہے ہاں اگر اس پہلے شخص کی اجازت ہو تو پھر مال دے سکتا ہے اجازت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کہے کہ تو جو چاہے وہ کر۔[۱]

بحر الرائق میں ہے: **واشار المصنف ان المامور فی کل موضع یصیر مخالفا فانه یضمن النفقة۔**

ترجمہ: مصنف نے اشارہ فرمایا کہ جس جگہ مامور (حج بدل کرنے والا) حج بدل کرانے والے کی مخالفت کرے گا تو خرچے کا ضامن ہوگا۔[۲]

بحر الرائق میں ہے: **ولیس للمامور ان یامر غیره بما امربه عن الآمر وان مرض فی الطریق الا ان یکون وقت الدفع قیل له اصنع ماشئت۔**

ترجمہ: مامور کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے علاوہ کو حکم دے کہ وہ آمر یعنی حکم دینے والے سے حج کرائے اگر چہ مامور راستے میں بیمار ہو جائے ہاں اگر آمر نے اس کو مال دیتے

۱۔(فتاوی شامی۔ج2ص262،مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

۲۔(بحر الرائق۔ج3ص63۔باب الحج عن الغیر)

ہوئے کہا کہ تو جو چاہے وہ کر تو پھر جائز ہے۔[1]

ان حوالہ جات سے صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شخص آمر کے مخالفت کی وجہ سے نفقہ کا ضامن ہوگا۔

ثانیاً کوئی شخص نیابۃً قابلِ اعتماد اور دیانت دار شخص کو جس میں اسے کوئی خصوصیت نظر آتی ہے، نیابۃً حج پر بھیجتا ہے تو اس کا ''**اصنع ماشئت**'' کہنا بالکل لغو اور فضول ہے اور عرفِ عام کے مخالف ہے۔ عرف کو نص کا درجہ حاصل ہے۔ ہاں صراحۃً اذن عام ثابت ہو تو بقول فقہا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۱۳۵

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ اذان سے بعد یا پہلے ''**اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہ**'' کہنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اسے بدعت حرام اور اذان میں اضافہ کہہ کر اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ براہِ کرم مدلل جواب سے ممنون فرماویں۔

(سائل از آدھی سڑی تھل، ضلع سرگودہا)

جواب

بندہ نے اس جواب کے لیے کچھ باتیں تمہیداً عرض کی ہیں جو اس جواب کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ وہ بصورت اشتہار ان شاء اللہ تعالیٰ پیش کی جائیں گی۔ یہاں مختصراً صرف چند دلائل مشتے نمونہ از خروارے عرض کیے دیتا ہوں تاکہ طلباء و علماء کے کام آسکیں۔

---

[1] (بحر الرائق۔ ج 3 ص 64۔ باب الحج عن الغیر)

۱۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں: **اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ، یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔** اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ کے ذریعے مومن کے لیے صلوٰۃ وسلام کیلئے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا۔ نماز کے لیے، وضو کے لیے، تلاوت کے لیے، حج کے لیے، روزہ کے لیے تو وقت مقرر ہے لیکن درود پاک کے لیے کسی وقت کی پابندی مقرر نہیں کی گئی۔ ہاں ہم عقلاً اس اطلاق سے ان حالات کا استثنیٰ کریں گے جہاں بے ادبی کا ارتکاب ہوسکتا ہے مثلاً برہنہ حالت میں، غسل خانے میں، پیشاب کرتے وقت، کوڑے اور گندگی کے ڈھیر پر صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھنا چاہیے جیسا کہ ''**اقیموا الصلوٰۃ**'' کا مطلق حکم ہے لیکن بغیر وضو نماز پڑھنا مکروہ وقت میں جنبی اور حائضہ کو مستثنیٰ کیا جائے گا۔

۲۔ علامہ ابن قیم جو فرقہ ء وہابیہ کے امام ہیں، انہوں نے اپنی کتاب جلاء الافہام میں ایک حدیث نقل کی ہے،: **عن عبداللّٰہ بن عمرو ابن العاص انه سمع النبی صلی اللّٰہ علیه واله وسلم یقول اذا سمعتم الموذن فقولوا مثل مایقول ثم صلوا علی صلوۃ صلی اللّٰہ علیه عشرا** (الحدیث)۔[۱]

سبحان اللہ! یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جب موذن اذان دے تو تم بھی وہی کلمے زبان پر لاؤ جو وہ کہہ رہا ہے اور پھر جب اذان ختم ہوجائے تو تم سب مل کر ''ثم صلوا'' یعنی موذن اور سننے والے سب میری ذات پر درود پاک پڑھو تو اللہ تعالیٰ تم پر دس دفعہ درود بھیجے گا۔ صاحبِ ایمان کے لیے تو میرے خیال میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہٹ دھرم کو اللہ تعالیٰ ہی ہدایت فرمائیں۔

---

[۱]۔(جلاء الافہام۔ص 71، حدیث 104)

۳۔ علامہ شامی نے باب سنن الوضوء میں فرمایا: **الاصل فی الاشیاء الاباحۃ......**

ترجمہ: اشیاء میں اصل اباحۃ ہے۔[1]

یعنی جس کام کو شریعتِ مطہرہ نے منع نہیں فرمایا، وہ مباح اور جائز ہے اور جو مباح کام نیتِ خیر سے کیا جائے، وہ مستحب ہو جاتا ہے۔ ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

الفرق بین العبادۃ والعادۃ ھو نیۃ المتضمنۃ للاخلاص کما فی الکافی۔

ترجمہ: فرق عبادت اور عادت کے درمیان نیت ہے جو اخلاص کے ساتھ متضمن ہو جس طرح کافی میں ہے۔[2]

درالمختار میں بحث مستحبات الوضو میں لکھا ہے: **مستحبہ مافعلہ النبی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **مرۃ و ترکہ اخری و مااحبہ السلف۔** یعنی جس کام کو اگلے لوگوں نے اچھا جانا ہے وہ مستحب کیونکہ **قال علیہ الصلوٰۃ والسلام ما راہ المومنون حسنا فھو حسن ھکذا قال علامۃ الشامی**[3]

۔لہٰذا اذان سے پہلے یا بعد میں صلوٰۃ وسلام پڑھنا مستحب امر ثابت ہوا۔

۴۔ اذان کہنا عبادت ہے کیونکہ شہادتین اصل ایمان ہیں اور اللہ اکبر کا کلمہ تصدیقِ شہادت ہے اور ہر عبادت سے پہلے اور بعد میں درود پاک پڑھنے کا حکم ہے۔ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ **الدعا ھی العبادۃ** اور مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ کوئی دعا جس سے پہلے اور بعد درود پاک نہ پڑھا جائے، وہ قبول نہیں ہوتی۔ **او کما قال** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1]۔(فتاوی شامی۔ج1 ص77)

[2]۔(فتاوی شامی۔ج1 ص76،)

[3]۔(فتاوی شامی۔باب الاذن، ص272)

۔اذان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ** یعنی اذان دینا احسن الاقوال ہے، دعوتِ الٰہی اور عملِ صالح ہے۔

۵۔ بعض لوگ شیطان کی طرح یہ وسوسہ ڈالتے ہیں کہ اس کا ثبوت قرونِ اولیٰ میں موجود نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ شریف میں ہر نماز کے بعد معلمین حجاج کرام کو مواجہہ شریف کے سامنے صف بستہ کر کے صلوٰۃ وسلام پڑھواتے ہیں، اور اسے بدعت کے ٹھیکیدار نجدی بھی منع نہیں کرتے۔ اس کا ثبوت قرونِ اولیٰ میں کہاں موجود تھا؟ سوا اس کے کہ دنیا بھر کے مسلمان اسے اچھا سمجھتے ہیں اور مسلمان جس کارِ خیر کو اچھا سمجھیں، وہ اچھا ہے۔ یہ کوزے، یہ مصلے، یہ روشنیاں، یہ بجلی کے پنکھے، یہ لاؤڈ اسپیکر اور آب رسانی کے وسائل سب حرام ہونے چاہئیں کیونکہ یہ سب چیزیں قرونِ اولیٰ میں موجود نہیں تھی۔ اسی طرح مدارسِ علمیہ، علوم عقلیہ ونقلیہ یہ سب بعد کی پیداوار ہیں اور آج لاکھوں روپے کارِ ثواب سمجھ کر ان کاموں پر صرف کیے جا رہے ہیں، اور عقلاً ونقلاً یہ کام بالاتفاق لازم وواجب سمجھے جا رہے ہیں۔

٦۔ بہت سی چیزیں فرض وواجب تو نہیں، مستحب یا مباح کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اگر ان کا انکار یا مخالفت شروع ہو جائے تو پھر ان کا کرنا ضروری ہو جاتا ہے جیسا کہ مدحِ صحابہؓ ایجی ٹیشن کے زمانہ میں علمائے دیوبند سے دریافت کیا گیا۔ یہ کام کو فرض صحابہؓ یا سلف نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا تو انہوں نے متفقہ فتویٰ دیا تھا کہ دراصل تو یہ فرض نہیں تھا لیکن اب اس کی ممانعت شروع ہو گئی ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے جیسا کہ گائے کا ذبیحہ بقرعید پر فرض تو نہیں، دنبہ بکری وغیرہ بھی ذبح کیے جا سکتے ہیں، لیکن اگر اس کی ممانعت کی جائے تو پھر گائے کا ذبح کرنا اظہارِ حق کے طور پر لازم ہو

جائے گا۔ اسی طرح اذان سے پہلے اور بعد میں تھوڑے وقفہ کے ساتھ ''**کما سیاتی صلوٰۃ وسلام**'' کہنا ضروری ہے اور بہت سے مقاموں پر تو اس مقیاس سنیت نے وہابیوں پر سے مکر کی کھال اتار لی جسے انہوں نے حنفیت کے پردے میں اہل سنت کی اماموں کے لیے دیہاتوں میں اوڑھ رکھی تھی۔

۷۔ خلاصۃ المرام: جس کام کی قرآن مجید نے اجازت دی ہے بلکہ حکم فرمایا ہے، اور حدیث شریف نے اس کی فضیلت فرمائی ہے اور فقہ حنفی میں اس کا جواز موجود ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں کہ تثویب یعنی اذان کے بعد پھر اعلان کرنا کہ نماز تیار ہے، متاخرین علماء وفقہا اور ائمہ حنفیہ نے اسے مستحسن سمجھا ہے، شریعت نے اس کے لیے کوئی خاص الفاظ وضع نہیں کیے بلکہ جو وہاں کا عرف ہے۔[1]

مثلاً ''**الصلوٰۃ الصلوٰۃ قامت قامت یا الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللّٰہ** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' جائز ہے۔

فرمایا: **بما تعارفوہ کتنحنح اوقامت قامت او الصلوٰۃ الصلوٰۃ وَلَو حدثوا علاما مخالفا لذلک جاز نھر عن المجتبیٰ**، اھ ک علامہ شامی اور علامہ مذکور ان سب کی دلیل تعارف اور توارث قرار دی ہے۔ **لان المتوارث لایکون مکروھا ، اور، ما راہ المومنون حسنا فھوحسن** ، اور اس کی تائید وتصحیح حضرت امام یوسفؒ، قاضی خان، غرر الاذکار، نہایۃ، برجندی ابن ملک نہر بحر، علامہ عبدالغنی نابلسی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین سے نقل کی ہے لیکن میرے خیالِ ناقص میں بہتر ہے کہ اذان پہلے اور بعد تھوڑے وقفہ کے ساتھ جو تین چھوٹی آیتوں سے بھی کم ہو، **اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہ** وغیرہ کہے، بالکل متصلاً

---

[1]۔ (فتاوی شامی۔ ج1 ص272)

ملا کر نہ کہے تا کہ اذان میں اضافہ کا شبہ نہ ہو۔

(رمضان شریف ۱۳۹۴ھ)

سوال ۱۳۶

محترم المقام حضرت مولانا زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جس شخص نے پہلے فریضہء حج ادا نہ کیا ہو اور نہ اس کے پاس مال ہو وہ شخص اپنی والدہ عجوزہ مریضہ کی طرف سے حج کرنے گیا ہوا ہے۔ اس علاقہ کے علماء کے مابین شدید اختلاف ہے۔ کچھ جواز حج بدل کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں مشکوٰۃ شریف میں ہے: **ثم عن بشره دل على ان الصرورة لا يحج عن غيره** (صرورۃ اس کو کہتے ہیں جس کے پاس مال زاد و رحلۃ نہ ہو) **اليه ذهب الاوزاعی والشافعی واحمد و ذهب مالک واصحاب ابی حنیفة** علیہ الرحمۃ **الى انه يحج** [1]

اور درالمختار علی الشامی میں ہے۔ **لكنه يشترط الصحة النيابته اهلية المامور بصحة الافعال ثم فرع اليه بقوله فجاز حج الصرورة**۔ دوسرے یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔[2]

لہٰذا براہِ کرم آپ مدلل طور پر اس خدشہ کا ازالہ فرماویں اور اس کو دینی خدمت سمجھتے ہوئے اپنی تحقیقِ انیق سے مفصل بحوالہء کتب جواب مشکور فرما کر سعادتِ دارین حاصل فرماویں۔

(المفتی حافظ عبدالحلیم، شمالی چاہ عباسیا نوالی، مدرسہ عربیہ اشرف المدارس)

۱۔(مشکوٰۃ شریف۔ ص 222 حاشیہ 7)

۲۔(درالمختار علی الشامی۔ص 331)

جواب

بحر الرائق میں ہے: **ثم المصنف رحمه الله لم يقيد الحاج عن الغير بشئى ليفيد انه يجوز احجاج الصرورة وهو الذى لم يحج اولا عن نفسه لكنه مكروه۔**

ترجمہ: پھر مصنف علیہ رحمہ نے غیر کی طرف سے حج کرنے والے کو کسی چیز کے ساتھ مقید نہیں کیا تا کہ یہ اس چیز کا فائدہ دے کہ حج صرورۃ جائز ہے اور حج صرورۃ یہ ہے کہ حج کرنے والے نے استطاعت کے باوجود اپنی طرف سے حج نہ کیا ہو تو یہ (حج صرورۃ) مکروہ ہے۔[1]

لیکن مکروہ اس صورت میں ہوگا جب وہ خود زاد و رحلۃ کا مالک ہو، ورنہ نہیں۔ آگے لکھتے ہیں: **والافضل احجاج الحر العالم بالمناسک الذى حج عن نفسه وهو يدل على انها كراهة تنزيه والا قال ويجب احجاج الحر الى آخره والحق۔ انها تنزيهية على الآمر تحريمية على الصرورة المامور الذى اجتمعت فيه شروط الحج اے (زادوالراحلة) و لم يحج عن نفسه والله سبحانه اعلم بالصواب ......**

ترجمہ: اس شخص کو حج کرانا افضل ہے جو مناسک کو جاننے والا ہو اور اس نے اپنی طرف سے حج بھی کر لیا ہو اور یہ دلیل ہے اس کی کہ یہ مکروہ تنزیہی ہے وگرنہ ماتن یجب احجاج الحر الی آخرہ فرماتے اور حق یہ ہے کہ یہ آمر پر مکروہ تنزیہی ہے اور صرورت جس کو حج کا حکم دیا گیا ہے اور جس میں حج کی شرائط بھی پائی گئی اور اس نے حج نہ کیا ہو تو اس کے لیے

---

[1]۔(بحر الرائق۔ص69)

مکروہ تحریمی ہے۔[1]

علامہ شامی نے بحر کے حاشیہ پر لکھا ہے:

والذی یقتضیه النظر ان حج الصرورۃ عن غیرہ ان کان بعد تحقق الوجوب علیه بملک الزاد والراحلة والصحة فھو مکروہ کراھته تحریم علیه......

خلاصہ عبارت: قیاس جس چیز کا تقاضہ کرتا ہے کہ حج صرورۃ غیر کی طرف سے اگر اس پر واجب ہونے کے بعد ہوتو یہ مکروہ تحریمی ہے۔[2]

فتح القدیر میں ہے: **والا فضل احجاج الحر العالم بالمناسک الذی حج عن نفسه حجة الاسلام و ذکر فی البدائع کراھته احجاج الصرورۃ (اے الذی له مال و اجمعت فیه الشرائط۔)**

ترجمہ: اور اس شخص کو حج کرانا افضل ہے جس نے اپنی طرف سے حج کرلیا ہو اور حج کے مناسک کو بھی جاننے والا ہو۔ اور بدائع میں حج صرورۃ کی کراہت کو ذکر کیا گیا ہے۔[3]

ھذا مختصراً و ما قال علامہ شامی فیه طوالة کثیرۃ۔ فانظرو و اثمه ھداکم اللّٰہ تعالیٰ۔ (جنوری ۱۹۷۷ء)

سوال ۱۳۷

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ نذر مروج شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۱۔ (بحر الرائق۔ ج 3 ص 69، 70، باب الحج عن الغیر)

۲۔ (بحر الرائق۔ ج 3 ص 69، 70، باب الحج عن الغیر)

۳۔ (فتح القدیر۔ ج 3 ص 72، باب الحج عن الغیر، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

جواب

نذر عرفاً منوتی کو کہتے ہیں۔ اس کی سات قسم ہیں۔

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ میری فلاں مراد پوری فرما دیں تو میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے روزہ رکھوں گا۔

۲۔ الٰہی بحرمت اپنے مقبول انسانوں کے یا فلاں بزرگ کے میرا یہ کام سرانجام فرما دے تو میں روزہ رکھوں گا یا صدقہ دوں گا۔

۳۔ اے اللہ کے ولی! تمہاری دعا اللہ تعالیٰ کی جناب میں مقبول ہے۔ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ اگر میرا کام ہو گیا تو میں فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا اور ثواب آپ کی روح کو بخشوں گا۔

۴۔ اگر اللہ تعالیٰ نے میرا فلاں کام حسبِ منشاء کر دیا تو میں فی سبیل اللہ فلاں فقیر کے مجاوروں کو اتنی رقم پیش کروں گا۔

۵۔ الٰہی میری حاجت پوری ہو تو مسجد میں فرش بنوا دوں گا۔

یہ سب اقسام شرعاً جائز ہیں اور ان کی وفا واجب ہو گی۔

۶۔ میں اللہ واسطے یہ بکرا یا دنبہ فلاں فقیر کی جگہ اپنے برادری کو ساتھ لے جا کر ذبح کروں گا، خود بھی اور ساتھ جانے والوں کو بھی کھلاؤں گا اور مجاوروں کو بھی کچھ دوں گا۔ یہ قسم اگر ساتھ جانے والے صدقہ کے قابل نہیں ہیں تو یہ نذر واجب نہیں ہو گی۔ یہ صرف ایک رسم ہے۔ اس سے گناہ گار تو نہیں ہوتا لیکن وہاں جانا بھی لازم نہیں۔ یہاں گھر میں ہی اس فقیر کی ارواح فی سبیل اللہ ذبح کر کے مساکین کو کھلا دے تو زیادہ ثواب ہو گا۔

۷۔ اے فقیر مجھے بیٹا دو یا میرا کام کرو تو تمہارے نام کا بکرا دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا نہ نام لیتا

ہے نہ نیت میں ہے، تو یہ ناجائز ہے، حرام ہے۔

جانور ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے، غیر کا نام نہ لے تو صرف وہاں لے جانے سے حرام نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ . . .**

عرف نذر بمعنی ہدیہ ہے جیسا کہ عوام کہتے ہیں ''نذر اللہ نیازِ حسینؓ'' ...... حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ، یہ مجازاً صدقہ ہے، خادمان اولیاء اللہ پر شرعاً اعتبار معنی کے ہوتا ہے، لفظ کا نہیں جیسا کہ فقیر کو زکوٰۃ کا مال صدقہ یا قرض کے نام سے دے دے تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مفصل تحقیق ہدیہ ء فدیہ میں سید عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ام سعد کے کنویں کی طرح ہے۔ حدیث شریف میں ہے: **نذر رجلا ان ینحر ابلا الی آخر الحدیث۔**

سوال ۱۳۸

نذر عبادت ہے، غیر کے لیے کس طرح جائز ہے؟

جواب

یہ صرف نسبت غیر کی طرف مجازاً کرنے سے حرمت لازم نہیں آ جاتی۔ کسی مسلمان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا عباداتِ غیر کا تصور بھی نہیں آ سکتا بلکہ ایصالِ ثواب مقصود ہوتا ہے۔ مطلق نسبت کو ام سعد کے کنویں میں بھی ہے اور ''**انما الصدقات للفقراء**، الخ'' ...... میں بھی ہے۔ نمازِ جنازہ، نمازِ عید، حج البیت، زکوٰۃ سونے کی، یہ سب نسبتیں ہیں، کیا پھر

یہ سب عبادات باطل ہوجائیں گی؟...... انَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ

سوال ۱۳۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ زید نے اپنی بیوی کو چھ (۶) یا اسی (۸۰) یا سو (۱۰۰) یا ہزار (۱۰۰۰) طلاقیں دی ہیں۔ طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب

واما وقوع الثلاث علی غیر المدخول بها اذا قال انت طالق احدی و عشرین بما لو قال انت طالق احدی عشر فانه یقع الثلاث بالاتفاق۔ بیان طلاق غیر مدخوله

خلاصہ عبارت: جب غیر مدخول بہا کو کہا کہ تجھے اکیس طلاقیں ہیں تو تین طلاقیں بالاتفاق واقع ہوں گی۔[1]

ان الوصف متی قرن بالعددکان الوقوع بذکر العدد و انما یقدر المصدر محذوفاً لان الوصف نعت المرأة وهی غیر متعددة فلا بدمن تقدیر شئی یحتمل التعدد والمصدر اولیٰ بذالک لدلالة الوصف علیه فاذا کان الواقع مصدراً محذوفاًلم یکن قوله انت طالق ایقاعاً علی حدة والالزاد عدد الطلاق وهو غیر مشروع فیقعن جملة صار الکل کلاماًواحداً۔ عنایته

ترجمہ: کہ وصف کو جب عدد کے ساتھ ملایا تو طلاق کا وقوع عدد کے ذکر کے ساتھ ہو گا۔ اور بہرحال مصدر مقدر ہوگا کیونکہ وصف یہ عورت کی صفت ہے حالانکہ عورت متعدد نہیں

۱۔ (ملخص از درمختار، باب الطلاق غیر مدخول بہا)

تو ایسی چیز کو مقدر کرنا ضروری ہے جس میں تعدد کا احتمال ہو تو مصدر اس بات کے زیادہ لائق ہے کیونکہ وصف اس پر دلالت کرتا ہے پھر جب واقع مصدر محذوف ہے تو اس کا قول انت طالق یہ علیحدہ طور پر واقع کرنا نہیں ہوگا اور اگر لفظی زیادتی مراد ہو طلاق کا عدد زیادہ ہوگا اور یہ غیر مشروع ہے تو تمام طلاقیں واقع ہوں گئیں اور یہ سب کا سب ایک ہی کلام کہلائے گا۔[1]

قولہٗ والالزاد عدد الطلاق وھو غیر مشروع (حاشیہ سعدی چلپی)

اقول قیل ان ارید الزیادة وقوعاً فلا نسلم ذالک لان الواقع ثلاث لاغیر کما اذا قال للمدخول بھا انت طالق الفاً۔ وان ارید الزیادة لفظاً فلا نسلم کونه محذوراً۔[2]

عن مالک بلغه ان رجلا قال لابن عباس انی طلقت امرأتی مائة تطلیقة فماذا تری علی فقال ابن عباس طلقت منک ثلاث و سبع و تسعون اتخذت بھا ایات اللّٰه هزوًا۔

ترجمہ: ایک شخص نے ابن عباس سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاق دی حضرت عبداللہ ابن عباس نے جواب دیا کہ وہ تین طلاق میں تجھ سے بائن ہوگئی اور ستانوے طلاق سے تو نے اللہ کی آیتوں سے مذاق کیا۔[3]

وفی موطا ایضاً بلغه ان رجلا جاء الی عبداللّٰه ابن مسعود فقال انی طلقت امرأتی ثمانیه تطلیقات فقال ما ذاقیل لک فقال قیل لی انها قد بانت منی قال صدقوا هو مثل مایقولون۔

---

[1]۔(فتح القدیر۔ ج 3 ص 393، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

[2]۔(فتح القدیر۔ ج 3 ص 392، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

[3]۔(موطاء امام مالک۔ ص 404، باب ماجاء فی البتۃ)

ترجمہ: ایک شخص حضرت عبداللہ ابن مسعود کے پاس آیا اس نے کہا کہ میں نے اپنی عورت کو آٹھ طلاقیں دی حضرت عبداللہ ابن مسعود نے کہا لوگوں نے تجھ سے کیا کہا وہ بولا مجھ سے یہ کہا کہ تیری عورت تجھ سے بائن ہوگئی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے کہا کہ انہوں نے سچ کہا ہے۔[1]

حدثنا حفص عن الاعمش عن ابراهيم عن علقمة عن عبدالله ابن مسعود انه ساءل عن رجل طلق امرءته مئة تطليقة قال حرمتها ثلاث وسبع و تسعون عدوان

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا کہ جس نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ تین طلاقوں سے حرام ہوگئی اور ستانوے طلاقیں زیادتی ہیں۔[2]

وروٰی وکیع عن الاعمش عن حبیب بن ثابت قال جاء رجل الی علی ابن ابی طالب فقال انی طلقت امرأتی الفاً فقال له علی رضی الله عنه بانت منک بثلاث واقسم سائرهن علی نسائک

ترجمہ: ایک شخص حضرت علی المرتضیٰ کے پاس آیا اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ آپ سے تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہوگئیں اور باقی طلاقوں کو اپنی عورتوں کے درمیان تقسیم کردو۔[3]

وروٰی وکیع ایضاً عن معاویة بن ابی یحییٰ قال جاء رجل الی عثمان

---

[1]۔(موطاء امام مالک۔ص 404، باب ماجاء فی البتۃ)

[2]۔(مصنف ابن ابی شیبہ۔ص 521 باب فی الرجل، یطلق امراتہ مئۃ اوالف فی قول واحد)

[3]۔(مصنف ابن ابی شیبہ۔ص 521 باب فی الرجل، یطلق امراتہ مئۃ اوالف فی قول واحد)

بن عفان فقال طلقت امرأتی مئه فقال ثلاث یحر منها علیه۔

ترجمہ: ایک مرد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں تو آپ نے فرمایا کہ تین طلاقوں نے اس عورت کو تجھ پر حرام کر دیا۔[1]

واسند عبدالرزاق عن عبادة ابن الصامت ان اباه طلق امرأته الف تطلیقة فانطلق عبادة فسئل صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم فقال رسول اللّٰہ ﷺ بانت بثلاث فی معصیة اللّٰہ تعالیٰ و بقی تسعمائة وسبع تسعون عدو انا ان شاء عذبه اللّٰہ، و انشاء غفرله ۔طلاق واقع ہوگئی ہے۔عورت مطلقہ مغلظہ ہوگی۔

عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ ان کے باپ نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دی تو عبادہ بن صامت نے اللہ کے محبوب ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو آقا علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ وہ تین طلاقوں کے ساتھ اللہ کی نافرمانی میں بائن ہوگئی اور باقی نو سو ستانوے طلاق یہ زیادتی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو سزا دے اور اگر چاہے تو معاف فرمائے۔

سوال ۱۴۰

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اندریں مسئلہ کہ ایک مولوی صاحب نے نکاح پڑھاتے وقت عورت کی ماں کا نام لیا ہے اور الفاظ ایجاب کو تین دفعہ بھی نہیں دہرایا اور لڑکے نے قبولِ بالکل آہستہ کہا ہے جسے مجلس میں کسی نے نہیں سنا۔ وہ مولوی صاحب بضد ہیں کہ نکاح ہو گیا ہے۔ بعض دوسرے علماء نے اس نکاح کو ناجائز کہا ہے۔ آپ تحقیق

۱۔(مصنف ابن ابی شیبہ۔ص 522 باب فی الرجل، یطلق امراتہ مئۃ اوالف فی قول واحد)

فرمائیں کہ یہ نکاح صحیح ہے یا نہیں؟ وہ شخص پریشان ہے۔ اگر تجدید ضروری ہے تو وہ پھر تجدید کرے یا وہی کافی ہے۔ (سائل از شاہ عالم۔ ۱۵ محرم ۱۴۰۱ھ)

جواب

نکاح صحیح نہیں ہے کیونکہ صرف گواہوں کا مجلس میں حاضر ہونا کافی نہیں جیسا کہ نکاح خوان نے سمجھا ہے بلکہ ان کا سماع شرط ہے اور وہ بھی ایک ہی مجلس میں۔ اگر دو آدمیوں نے علیحدہ علیحدہ سنا ہے، مثلاً دوسرے کے سامنے وہی الفاظ دہرائے گئے ہیں تو بھی نکاح صحیح نہیں ہوتا۔ ہدایہ شریف کتاب النکاح میں ہے: **لان السماع فی النکاح شهادة ولا شهادة للكافر على المسلم فكانهما لم يسمعا كلام المسلم۔**

ترجمہ: نکاح کے اندر ایجاب وقبول کا سننا گواہی ہے اور مسلمان کے خلاف کافر کی گواہی معتبر نہیں ہے۔[1]

فتح القدیر میں ہے: **فلو ان الشهادة مجرد الحضور كما يعطيه ظاهر القدوری وقدمنا ممن قال به السعدی والاسبیجابی لم يتم ونص القدوری وغيره على اشتراط السماع ولانه المقصود بالحضور...**

وفی فتاویٰ قاضی خان اذا لم يسمعا كلامهما۔ ثم الشرط ان يسمعا كلامهما مع الفهم، الخ...

خلاصہ عبارت؛ شہادت حضور محض ہے اور امام قدوری اور ان کے علاوہ نے ایجاب وقبول کے سننے کی شرط لگائی ہے کیونکہ مجلس نکاح میں حاضر ہونے کا مقصد ایجاب وقبول کا سننا ہے۔[2] **فاعتبروا يا اولی الابصار...**

۱۔ (ہدایہ شریف کتاب النکاح ۔ج2ص326)

۲۔ (فتح القدیر۔ج3ص114)

سوال ۱۴۱

کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں مسئلہ کہ جو روافض پُشت در پُشت روافض نہیں بلکہ خود بخود درفض میں داخل ہوئے ہیں اہل کتاب ہیں یا مرتد؟

دوم: مولوی عبدالحی صاحب نے مجموعۃ الفتاوی میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی تحفہ اثنا عشریہ میں فرمایا ہے تکفیر کنندہ حضرت امیر یا منکر بہشتی بودن الثیان یا منکر خلافت باعتبار اوصاف دین مثل علم وتقوی وعدالت وورع کافر است اقول ومثلہ اصحاب الکبار خصوصا الثلثۃ رضی اللہ عنھم اھ ک۔۔۔

ہمارے ہاں اکثر روافض کا اصحاب ثلثۃ کے متعلق یہی عقیدہ ہے کیا وہ کافر ہیں یا نہیں؟

جواب

غایۃ الاوطار میں ہے کہ فاضل خیر الدین رملی نے روافض کے سب فرقوں اور معتزلہ کے سب گروہوں کو اہل کتاب میں درج کیا ہے۔اور اہل کتاب کے کفر میں کوئی شک نہیں لہذا رافضی بھی کافر ہوں گے اور رافضی کا سنیہ عورت سے نکاح ناجائز ہوگا اور سنی مرد کا رافضیہ عورت سے نکاح درست ہوگا یہ اعدال اقوال ہے۔اھ ک۔۔۔اسی صفحہ پر مصنف نے شارح وجیز سے نقل کیا ہے کہ جو مذہب کہ اس پر تکفیر وارد ہوتو اس مذہب کی عورت سے بھی نکاح ناجائز ہوگا کذا فی البحران ہر دو اقوال سے کونسا قول اعدل ہے اور قیاس عمل ہے جواب مستفید فرمادیں۔[۱] خیر الدین رملی کا قول اعدل اقوال ہے اور فوائد شرعیہ کے ساتھ اوفق ہے (مفتی کفایت اللہ)

۱۔(غایۃ الاوطار۔ج 2 ص 18)

باب دوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

أَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیم۔اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا

(الاحزاب:۵۶)

اَفۡضَلُ الصَّلٰوۃِ عَلٰی مَنۡ ھُوَ بَاعِث الۡحَیَاۃ

مولانا مفتی محمد حسین شوقؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَفۡضَل الصَّلٰوۃِ عَلٰی مَنۡ ھُوَ بَاعِث الۡحَیَاۃ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الۡھَادِیۡ والصَّلٰوۃُ عَلَی النَّبِیِّ الۡمَھۡدِیۡ

محترم المقام شاہ صاحب نے جو کتابیں حوالوں پر نشان لگا کر بھیجی ہیں، مجھے ان سے دو باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب صلوٰۃ مطلوبہ ءخداوندی سے دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیۡتَ عَلٰی اِبۡرَاھِیۡمَ

لہٰذا بصیغہء **اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیۡکَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہ** صلوٰۃ پڑھنی ناجائز یا خلافِ سنت ہے۔ (۲)

روضہءاطہر پر حاضر ہوکر جو صلوٰۃ پڑھی جائے، وہ تو آپ خود سنتے ہیں لیکن دور سے جو صلوٰۃ پڑھی جاتی ہے، وہ آپ نہیں سنتے، وہ پہنچائی جاتی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس طرح سے۔

جواباً عرض ہے کہ پایہءثبوت شرعی تین ہیں۔ قرآن، حدیث، عملِ امت یا اجماع

......اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (الاحزاب:۵۶)

یعنی ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ صلوٰۃ وسلام پڑھیں۔ کس وقت، کتنی مقدار میں، کون سے الفاظ سے۔ یہ پڑھنے والوں کے ذوق پر چھوڑا گیا ہے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے واضح فرمایا ہے:

کَمَا سَیِّاتِی (جناب عطاء اللہ شاہ بخاری سوکڑی۔ص:۱)

نماز کے لیے، وضو کے لیے، حج کے لیے، روزمرہ کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے لیکن اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا۔ ہاں ہم عقلاً ان حالات کا استثنٰی کریں گے جہاں بے ادبی کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔ مثلاً برہنہ حالت میں غسلخانہ میں، پیشاب کرتے وقت، کوڑے اور گندگی کے ڈھیر پر صلوٰۃ وسلام نہیں پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ **اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ** کا حکم مطلق ہے لیکن بغیر وضو نماز پڑھنا، مکروہ وقت میں نماز پڑھنا، جنبی اور حائضہ کو مستثنٰی کیا گیا ہے (۳)

نماز افضل العبادت ہے۔ اس میں جس صلوٰۃ کو مقدم کیا گیا ہے، وہ ہے **اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ** اور صلوٰۃ ابراہیمی کو جس کو آپ فقط ضروری سمجھ رہے ہیں، اسے **عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ** کے بعد پڑھنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صلوٰۃ بعینہٖ یا نداء اور کاف خطاب اگر کفر ونا جائز ہے تو اسے نماز جو افضل العبادات ہے، کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟...... جو کفر ہے، وہ ہر جگہ کفر ہے۔ خواہ نماز میں ہو، خواہ روضہء اطہر میں ہو...... ثانیاً حکمِ خداوندی صلوٰۃ ابراہیمی سے پورا نہیں ہوتا۔ اس میں صرف صلوٰۃ کا ذکر ہے اور سلام کا کوئی نہیں۔ آیت میں **صَلُّوْا** سے الصلوٰۃ اور **سَلِّمُوْا** سے السلام اور **عَلَیْہِ** سے علیک۔ گویا اسی طرح آیت پر پورا عمل ہوتا ہے...... ثالثاً مسند امام احمد اور جلاء الافہام میں ہے: **قال الحاکم صحیح علی شرط مسلم و اخرج ایضاً احمد و ابن خزیمه و دارقطنی و بیهقی ان هذه الالفاظ مرتبة محققة بالصلوٰۃ۔**[۱] ...... چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ سے جو روایت نقل کی گئی ہے،

۱۔(مسند امام احمد۔ج4 ص119 / وجلاء الافہام۔ص15 ابن حنان)

اس میں بھی تخصیص ہے۔

اِذَا کُنَّ فِیْ صَلٰوتِنَا گویا جن احادیث میں درودِ ابراہیمی کا ذکر ہے، وہ سوال بھی نماز میں درود شریف پڑھنے کے متعلق کیا گیا ہے۔ نہ کہ مطلق **کَمَا سَیَاتِی** (۳) میں۔ نہایت ادب سے التماس کروں گا کہ **اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ** کی صورت میں صلوٰۃ پانچ نمازوں کے بعد روضہء رسول پر آج کوئی بھی منع نہیں کرتے بلکہ معلمین ہر حاجی کو مواجہہ شریف کے سامنے لے جا کر دست بستہ بلند آواز سے **اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ** کہلواتے ہیں۔ ذرا سینہ پر ہاتھ رکھ کر، کلیجہ تھام کر جواب دیجئے کہ یہ کس حدیث اور کس آیت سے آپ نے اور انہوں نے ثابت کیا ہے؟ بارِ ثبوت آپ پر ہے۔ وہاں وہ درود شریف جو آپ مشکوٰۃ شریف اور موطا شریف سے ثابت کرتے ہیں، کیوں نہیں پڑھواتے؟ وہاں **اَللّٰھُمَّ صَلِّی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَاصَلَّیتَ عَلٰی اِبْرَاھِیمَ** والا درود کیوں نہیں پڑھواتے؟ ذرا یہ بھی واضح فرمائیں کہ یہ طریقہ کب سے شروع ہوا ہے؟ کیا قرونِ اولیٰ میں ایسا ہوتا تھا؟ اگر نہیں ہوتا تھا تو بدعت کے دشمنوں نے اسے کیوں رواج دے رکھا ہے؟ (۴)

علامہ شامی فرماتے ہیں۔

الأصل في الأشياء الإباحة۔ [۱]

یعنی جس کام کو شریعتِ مطہرہ میں منع نہیں فرمایا گیا، وہ مباح اور جائز ہے اور جو مباح کام نیتِ خیر سے کیا جائے، وہ مستحب ہو جاتا ہے۔

اوی شامی میں لکھتے ہیں:

اَلفَرقُ بَیْنَ الْعَادتِ وَالْعِبَادَۃِ ھُوَالنِیَّۃُ اَلْمتَضَمّنَۃُ الْاِخْلَاصُ کَمَا فِی

۱۔ (فتاوی شامی۔ ج 1 ص 75۔ باب سنن الوضوء)

اَلْکَافِی۔

یعنی عادت اور عبادت میں وہی اخلاص کی نیت ہی باعثِ فرق ہے یعنی جو کام نیتِ خیر و اخلاص سے کیا جائے، وہ عادت ہوگا (دوسرا عبادت)۔[1]

درالمختار مستحبات الوضو میں تحریر ہے...... **مستحبه مافعله النبی** ﷺ **مرة و ترکه اخری و مااحبه السلف**[2]...... جو کام آنحضرت ﷺ نے زندگی میں کبھی کیا ہے اور کبھی ترک کیا ہے، وہ مستحب ہے اور جسے سلف صالحین نے پسند کیا ہے، وہ بھی مستحب ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا: **ماراه المسلمون حسناً فهو حسن لکن قال العلامة الشامی**[3]...... لہٰذا اذان سے پہلے اور بعد میں صلوٰۃ وسلام پڑھنا بقول فقہا مستحب امر ثابت ہوا (۵)۔ اذان کہنا عبادت ہے اور ہر عبادت سے پہلے اور بعد میں درود شریف پڑھنا لازم ہے۔ کما قال صلی اللہ علیہ وسلم مشکوٰۃ شریف میں ہے......کوئی دعا جس سے پہلے اور بعد میں درود پاک نہ پڑھا جائے، وہ عبادت قبول نہیں ہوتی...... فرمایا: **ما من دعاء اِلاَّ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ السَّماء حِجاب یصلی علی النبی** (٦) ﷺ،[4]

آنحضرت ﷺ نے جس صلوٰۃ وسلام کا پڑھنا نماز میں مقدم اور ضروری فرمایا ہے، وہ یہی صلوٰۃ ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا ہے کہ ان الفاظ کو بطور انشاء پڑھے نہ بطور حکایت معراج یعنی اس وقت خیال کرے کہ میں اپنی طرف سے حضور کی ذات پر صلوٰۃ وسلام کہہ رہا ہوں اور انہیں اپنے سامنے تصور کرے کیونکہ

---

[1]۔(فتاوی شامی۔ج1ص76)

[2]۔(درمختار۔ج1ص9۔مستحبات الوضو)

[3]۔(فتاوی شامی۔ص272،باب الاذان)

[4]۔(مشکوۃ شریف۔ص79)

نورِ نبوت در ذاتِ مصلیاں ساری است، ورنہ اس کا ''التحیات'' صحیح نہ ہوگا اور درود پاک کے نفع سے محروم ہوجائے گا۔(۷)

بہت سے کام مستحب یا مباح ہوتے ہیں لیکن اگر ان کا انکار شروع ہوجائے تو پھر وہ واجب ہوجاتے ہیں۔ مدحِ صحابہؓ ایجی ٹیشن لکھنو کے دوران علماء دیوبند سے پوچھا گیا کہ سڑکوں پر صحابہؓ کی مدح کرتے جلوس نکالنا اور پھر قید ہونا کہاں ضروری ہے؟......

تو متفقہ طور پر علماء دیوبند نے یہی جواب دیا کہ اب واجب ہے جیسا کہ عید پر گائے کی قربانی فرض و واجب نہیں بھیڑ بکری کی قربانی بھی ہوسکتی ہے لیکن اگر اس کی ممانعت شروع ہوجائے تو پھر گائے کی قربانی لازم ہوجائے گی۔ اس طرح اذان سے پہلے اور بعد میں اگر صلوٰۃ وسلام ممنوع نہیں، نہ قرآن سے نہ حدیث سے صرف مستحب ہے اور مباح بھی ہے، تو اب جب اسے حرام وکفر کہا جارہا ہے، تو اس کا کرنا لازم ہوگا تاکہ شعارِ ایمان واسلام قائم رہے۔ آج بہت سی جگہوں پر جہاں منافق اپنے آپ کو اہلِ سنت کہہ کر مساجد کے امام بنے ہوئے تھے، اس مقیاسِ سنت نے ان گیدڑوں پر سے مکر کی کھال اتار لی ہے جو انہوں نے سیدھے سادے مسلمان دیہاتی سنیوں کو گمراہ کرنے کے لیے اوڑھ رکھی تھی۔ اب وہ احادیث سنیے جن میں ان الفاظ کی صراحت موجود ہے۔

1۔ حدثنا یعقوب بن حمید بن کاسب حدثنا عبید اللہ بن عبد اللہ الاموی عن صالح بن محمد بن زائدہ قال سمعت القاسم بن محمد یقول کان یستحب لرجل اذا فرغ من تلبیتہ ان یصلی علی النبی ﷺ۔

ترجمہ: قاسم بن محمد کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ انسان جب تلبیہ سے فارغ ہو تو اس کے لیے درود شریف پڑھنا مستحب ہے۔[1]

1۔(جلاء الافہام۔ص 89)

۲۔ **عن علی بن حسین عن علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ اذا مررتم بالمساجد فصلوا علی النبی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ترجمہ: حضرت زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جب تم مسجدوں سے گزروتو درود پڑھو۔[1]

۳۔ **عن ابن اسحاق قال سمعت سعید ابن حجران قال قلت لعلقمة مااقول اذا دخلت المسجد قال تقول صلی اللّٰہ وملائکتہ علی محمد السلام علیک ایھا النبی ورحمتہ اللّٰہ وبرکاتہ**

ترجمہ: سعید بن حجران کہتے ہیں جب میں مسجد میں داخل ہوں تو مجھے کیا کہنا چاہیے۔انہوں نے جواب دیا کہ یہ کہو **السلام علیک ایھا النبی ورحمتہ اللّٰہ وبرکاتہ**۔[2]

۴۔حضرت عمرؓ ابن خطاب سے روایت ہے کہ طواف کے بعد صفا پر کھڑے ہوکر کعبۃ اللہ پر نظر رکھو۔سات مرتبہ تکبیر پڑھواور ہر دو تکبیروں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھو پھراپنے لیے دعامانگو پھر مروہ پر بھی اسی طرح کرو۔

۵۔عبداللہ ابن عمرؓ ابن العاص سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپؐ نے فرمایا کہ جب موذن اذان کہے تم اسی طرح ان کلمات کو دہراؤ، پھر سب مل کر مجھ پر درود پڑھو **صَلُّوْا عَلَیَّ فَإِنَّہُ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ صَلاۃً صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ بِہٖ عَشْرًا** یہ سب احادیث علامہ ابن قیم رئیس الوہابین نے ذکر فرمائی ہیں۔خلاصہ یہ نکلا کہ طواف وسعی ،دخول مساجد، رویت مساجد اوراذان کے بعد کی طرح تمام کاموں میں صلوٰۃ وسلام اور

---

[1]۔(جلاء الافہام۔ص89)

[2]۔(جلاء الافہام۔ص89)

درود پاک کا پڑھنا باعثِ برکت وثواب ہے۔

(۱) جلاء الافہام میں ہے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا **من نسی الصلوٰۃ علی فقدا خطاء طریق الجنۃ** جو مجھ پر درود پڑھنا بھول گیا وہ بہشت کا راستہ بھول گیا۔[1]

(۲) فرمایا سب سے بڑا بخیل وہ ہے جس کے پاس میرا نام لیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہیں بھیجا **عَنْ اَبِی ذرِ اَنَّ الْبَخِیلَ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَيَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ** قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان سب احادیث میں درود پاک کا پڑھنا کسی وقت کا پابند نہیں کیا گیا۔

(۳) واثلۃ ابن اسقع سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: **ما مِن قَومٍ جَلَسوا مَجلِسًا فتَفَرَّقوا عن غَیرِ ذِکرِ اللہِ إلَّا تفرَّقوا عن جِیفۃِ حِمارٍ، وکان ذلك المَجلِسُ علیہ حَسرۃً یَومَ القیامۃِ** یعنی جو لوگ کسی مجلس میں اکٹھے ہوئے اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، نہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور نہ مجھ پر درود پاک پڑھا تو یہ مجلس ان کے لیے قیامت کے دن حسرت وارمان کا باعث ہو گی۔ (ذرا کلیجہ پر ہاتھ رکھ لیجئے)

جلاء الافہام کی ایک حدیث میں ہے: **اعَنْ اَبِی دردَاءِ اَکْثِرُوا الصَّلَاۃَ عَلَيَّ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَاِنَّہٗ مَشْھُوْدٌ تَشْھَدُہُ الْمَلَائِکَۃُ لَیْسَ مِنْ عَبْدٍ یُّصَلِّیْ عَلَيَّ اِلَّا بَلَغَنِيْ صَوْتُہٗ حَیْثُ کَانَ**[2] یعنی جمعہ کے دن مجھ پر درود بہت پڑھا کرو کیونکہ وہ حاضری کا دن ہے۔ فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں اور کوئی آدمی بھی مجھ پر درود شریف نہیں پڑھتا مگر اس کی آواز مجھ تک پہنچتی ہے وہ جہاں بھی ہو۔ ہم نے عرض کیا وفات کے بعد بھی؟

۱۔ (جلاء الافہام۔ ص 68)

۲۔ (جلاء الافہام۔ ص 73، حدیث نمبر 108)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہاں! وفات کے بعد بھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر ابنیاؑ کے جسموں کو خراب کرنا حرام کر دیا ہے۔ جلاء الافہام میں ہے: **اِنَّ مَلَکاً مُوکِلُ بِکُلِّ مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ النَّبِیِّ** صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم **حَتی یَبْلَغَه** [1]۔ اور آگے فرمایا: مجھ پر درود پڑھو **فَاِنَّ صَلوٰتَکُمْ تَبْلغنِی حَیْثُ کُنْتُمْ** یعنی تم جہاں بھی ہو تمہارا درود مجھ تک پہنچتا ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص دوست رکھتا ہے کہ اس کے لیے انعام واکرام کا پیمانہ بھر کے مکمل کر دیا جائے [2]۔ وہ جب ہم پر درود بھیجنے لگے تو کہے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّم وَبَارِک عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الاُمِّیِّ وَ اَزوَاجِه اُمَّهَاتِ المُومِنِینَ وَ ذُرِّیّٰتِه کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ غالباً یہ درود شریف کو کسی (معترض) اعتراض کرنے والے نے آج تک نہ پڑھا ہو گا۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے فتاوی رشیدیہ میں فرمایا کہ صلوٰۃ وسلام بصیغہ یا ندا محبت وشوق کی صورت میں جائز ہے جیسا کہ مجنوں نے کہا تھا: **بِاللهِ یَا ظَبیَاتِ القَاعِ قُلنَ لنَا.. لَیْلَایَ مِنکُنَّ، اَمْ لَیْلَی مِنِ البَشَر**۔ فتاوٰی رشیدیہ پر لکھتے ہیں کہ ذکر خواہ کوئی ذکر ہو، ظاہر ہے کہ صلوٰۃ بھی ذکر ہے۔ [3]

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سوا اِن مواقع کے جہاں ثبوتِ جہر نص ہے، مکروہ ہے اور صاحبین اور دیگر فقہاء محدثین کے نزدیک جائز ہے اور مشرب ہمارے مشائخ کا اختیار مذہب صاحبین ہے۔ والسلام

مولوی حسین احمد صاحب مدنی سے بابو محمد صدیق پپلانوی نے گاڑی میں دریافت

---

[1]۔ (جلاء الافہام۔ ص75، حدیث 111)

[2]۔ (مشکوۃ شریف۔ ص79)

[3]۔ (فتاوی رشیدیہ۔ ج3 ص12)

کیا جب وہ ڈیرہ اسماعیل خان میں کانگریس کی حمایت کے لیے جا رہے تھے، کہ یارسول اللہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا بھئی! جو پڑھتے ہیں وہ پوچھتے نہیں، جو پوچھتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔ کتنی سچی بات فرمائی ہے۔ علامہ شامی فرمایا ہے کہ تثویب یعنی اعلام بعد الاعلام آئمہ احناف اور فقہا متاخرین نے مستحسن سمجھا ہے۔[1]

شریعت نے اس کے لیے کوئی خاص الفاظ وضع نہیں کیے بلکہ جو وہاں کا عرف ہے مثلاً **الصلوٰۃ الصلوٰۃ، قامت، قامت، یاالصلوٰۃ و السلام علیک یارسول اللّٰہ** جائز ہے۔ **بماتَعَارفُوہ قامت قامت اوالصلوٰۃ الصلوٰۃ ولواحد ثواعلاماً مخالفاًلذلک جاز** (نہر عن مجتبیٰ)۔ سب فقہا نے تعارف اور توارث کو دلیل قرار دیا ہے۔ **لان المتوارث لایکون مکروھا اوماراہ المسلمون حسنا فھو عنداللّٰہ حسن۔** اور اس کی تائید و تصحیح امام ابو یوسفؒ، قاضی خاں، عزرالاذکار، نہایۃ برجندی، ابن ملک علامہ عبدالغنی نابلسی رحمھم اللہ اجمعین سے نقل کی ہے۔ تاریخ طبری میں ہے کہ جس دن خلافتِ ابوبکر صدیقؓ میں مسلمہ کذاب سے حضرت خالدؓ ابن ولید جنگ کر رہے تھے اور جنگ زور پکڑ گئی تھی، کبھی مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو جاتا تھا اور کبھی کفار کا، تو جیسا کہ ہر جنگ میں ایک لفظ (کوڈ) کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔[2] تاکہ مسلمان ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور وہ لفظ ہر جنگ میں مختلف ہوتا تھا، آج بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے، تو حضرت خالدؓ بن ولید نے تمام صحابہؓ کیلئے ''**یامحمداہ**'' کا لفظ مقرر فرمایا۔ اگر خطاب بلفظ یا نداء کفر ہوتا تو کم از کم صحابہؓ تو اس کو شعار نہ بناتے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی حرمین شریفین میں اگر دو آدمی آپس میں لڑنے لگیں تو تیسرا بلند آواز سے آ کر کہتا ہے ''صلِّ علی النبی'' اور فوراً آرام کر

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔ ج1 ص272)

[2]۔(تاریخ طبری۔ ج4 ص150)

لیتے ہیں، لڑائی بند کر دیتے ہیں۔ اس حدیث کو بیہقی نے اور اصبہانی نے ترغیب میں نقل کیا ہے۔ **قَالَ رَسُول اللّٰہ** ﷺ **من صلی علی مائة فی یومِ الجمعة ولیلة الجمعة قضی اللّٰہ لہٗ مائة حاجته سبعین فی حوائج الآخرة وثلثین من حوائج الدنیا ثم وکل اللّٰہ تعالیٰ بذالک ملکا یدخل علی فی قبری کمایدخل علیکم الهدایا مخبر من صلی علی باسمه و نسبه فاثبت عندی فی صحیفة البیضاء (بیهقی) ان علمی بعد موتی کعلمی فی حیاتی**۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن یا رات جو شخص درود پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی سو حاجتیں پوری فرماتا ہے۔ ستر آخرت کی اور تیس دنیا اور اس کام کے لیے فرشتہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے جو میری قبر میں داخل ہو کر اس درود پڑھنے والے کا نام اور نسب کی خبر دیتا ہے کہ فلاں ابن فلاں نے آپ کی ذات پر درود بھیجا ہے جو تحفہ کی شکل میں میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور پھر میں اس شخص کا نام و پتہ سفید رجسٹر میں درج کر لیتا ہوں اور میرا علم موت کے بعد اسی طرح بڑھتا ہے جس طرح زندگی میں بڑھتا ہے یعنی علم وحضور کی کیفیات میں موت وحیات کا کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اُمْ حَسِبَ الَّذِینَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاء مَّحْیَاهُم وَمَمَاتُهُمْ۔ نافع ابن کثیر ابوعمر بصری ابن عمر شامی سلین اعمش آئمہ قرات نے اتفاق کیا ہے کہ سواء کے آخر میں تنوین میں ضمہ ہے یعنی جو لوگ زندگی میں گناہوں کا کسب کرتے رہتے ہیں کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ مومنین صالحین کی طرح زندگی اور موت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں یعنی اللہ والوں کی زندگی اور موت برابر ہوتی ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت **وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ** جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں انہیں مردہ ہرگز نہ کہو وہ زندہ ہیں اپنے

رب کے نزدیک۔ دلائل الخیرات جسے چاروں سلسلہ کے بزرگ بطور وظیفہ ہمیشہ پڑھتے رہتے ہیں، دیباچہ میں فضائل درود کے متعلق ایک حدیث نقل فرمائی ہے: **وقیل الرسول** ﷺ **ارائت صلوٰۃ المصلین علیک من غاب عنک و من یاتی بعدک ماحالھما عندک فقال اَسْمَعُ صلوٰۃ اھل محبتی و اعرفھم وتُعرَضُ علی صلوٰۃ غیرھم عرضاً** ...... یعنی پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ جو لوگ آپ سے غائب ہوتے ہیں یا بعد میں آئیں گے، ان کے صلوٰۃ وسلام کا آپ کو علم کس طرح ہوگا؟ فرمایا اہلِ محبت کی صلوٰۃ میں خود سنتا ہوں اور دوسروں کی مجھ پر پیش کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت قبلہ عالم گولڑویؒ سے پوچھا کہ حضرت بعض لوگ دلائل کی اس حدیث پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی سند معتبر نہیں۔ آپؒ نے فرمایا بھئی جس طرح قرآن، قرآن کی تفسیر کرتا ہے، اسی طرح اس حدیث کی تائید حدیث قدسی سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **کنت سمع الذی یسمع بہٖ و بصرہ الذی یبصربہ ویدہ التی یبطش بھا** ...... جو شخص نوافل کی کثرت سے قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ میرے ساتھ دیکھتا ہے اور کان بن جاتا ہوں میرے ساتھ سنتا ہے اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں وہ میرے ہاتھ سے پکڑتا ہے اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی سمع پاک سے کوئی چیز اوجھل نہیں، یہ نزدیک و دور کا جھگڑا ہمارے تمہارے جیسوں کے لیے ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

عبد دیگر عبدہ چیز دیگر
ما سراپا انتظار او منتظر
کس زسر عبدہ اگاہ نیست
عبدہ جز سرالا اللہ نیست

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: **یا اکرم الثقلین یا کنز الوریٰ جُدْلی بجودک وارضنی برضاک** ...... اے دونوں جہانوں کے کریم اے مخلوقِ خدا کی جائے پناہ مجھ پر بھی اپنے جودو کرم کی عنایت کرو اور اپنی رضا پر راضی کرو۔ **انا طامع بالجود منک ولم یکن لابی حنیفة فی الانام سواک** ...... اے بحرِ ذخار میں تیرے جود و عطا کا طامع ہوں، بھلا اس ابوحنیفہ کا تیرے سوا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ کلامِ پاک میں ارشاد فرماتے ہیں: **وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَى وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا** ...... اللہ تعالیٰ نے کفار کے کلمہ کو نیچا کر دیا اور کلمۃ اللہ کو بلند کر دیا۔ اس کلمۃ اللہ سے مراد بعض کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام ہیں لیکن درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے: **مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ فَرْقٌ بيْنَ النَّاسِ** ...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق و باطل کا معیار ہیں۔ رب کو تو ہر کوئی مانتا ہے لیکن جو حضور کو مانتا ہے، وہ مسلمان ہے جو نہیں مانتا وہ کافر۔ ماننا یوں ہے کہ آپؐ عبداللہ کے بیٹے تھے، مکہ کے قریش تھے، آمنہؓ کی گود میں رہے، یہ تو کفار بھی مانتے تھے۔ ایک ذات کا انکار ہے کہ خدا ہی نہیں، یہ بھی کفر اور صفاتِ حق کا انکار یعنی خدا ہے تو سہی لیکن خالق و مالک نہیں، یہ بھی کفر اسی طرح تسلیم نہ کرنا کہ آپؐ اللہ کے آخری رسول خاتم النبین افضل البشر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے بعد صرف آپ ہی آپ ہیں۔

بعد از بزرگ تو ہی قصہ مختصر

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ** ... آپ ان کے اندر مقیم ہیں تو میں ان کافروں کو عذاب نہیں کرتا ...... **اخرج البخاری فی تاریخہٖ قال النبی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **ان لله ملکا اعطاه اسماع الخلائق قائم علی قبری فما من احدیُصلی علی صلوٰة الا بلغنیها** ......

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ میری قبر پر کھڑا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی آواز سننے کی طاقت عطا فرمائی ہے پس جو شخص جہاں بھی ہے جب مجھ پر درود پڑھتا ہے تو وہ مجھ تک اسے پہنچا دیتا ہے۔ اسی قسم کی مفصل حدیث پہلے بھی نقل کی جا چکی ہے۔ باتفاق اہلِ سنت والجماعت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ افضل الصحابہ رضی اللہ عنہم واعلاھم بالکتاب والسنۃ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد ان کا یہ مشہور مرثیہ ہے: **وودعنا الوحی اذولیت عنا، فودعنا من اللّٰہ الکلام یارسول اللّٰہ**...... جب آپ نے ہم سے منہ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارے ساتھ اپنی کلام بند کردی یعنی جب آپ چپ ہوئے تو خدا بھی چپ ہوگیا اور آپ کا جنازہ درِ اقدس پر لایا گیا تو سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے الفاظ عرض کیے: **اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ**...... ھذا ابوبکر دروازہ کھل گیا اور آواز آئی: **اوصِلُّوْا الْحَبِیْبَ الی حبیب**...... اے حبیب تفسیر کبیر ج ۵ ص ۴۵۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **یابی انت وامی لقدکان لک جزع تخطب الناس علیھا فلماکثر الناس اتخذت منبر لتسمعم فحن الجذاع**...... میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ ستون سے پیٹھ لگا کر خطبہ سنایا کرتا تھے جب لوگ زیادہ ہوگئے تو آپ نے خطبہ کے لیے منبر بنوا لیا تو اس ستون نے رونا شروع کردیا۔ یہ خطاب وفات کے بعد ہے۔ حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ مداحِ رسول عرض کرتے ہیں: **فجاھک یارسول اللّٰہ جاہ۔ رفیع مالدفعتہٖ انتھاء۔ رجوتک ابن آمنۃ لانی۔ محب والمحب لہ الرضاء۔ علیک من اللّٰہ السلام تحیۃ ۔ وادخلت جنات من العدن راضا . . .** حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **ایاساکن الغبراء علمتنی البکاء وذکرک انسانی جمیع المصائب**...... اے اس پاک مٹی میں سونے والے تو نے مجھے رونا سکھا دیا اور تیری یاد نے مجھے اپنی تمام مصیبتیں بھلا دیں۔ حضرت زین العابدین صلوات علی رضی اللہ عنہ بیتہٖ وسلم فرماتے ہیں: **یا**

مصطفیٰ ﷺ یا مجتبیٰ ارحم علی عصیاننا۔ حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں : **یا حبیب الاله خذبیدی۔ مالعجزی سواک مستندی** ۔ اے اللہ کے حبیب میرا ہاتھ پکڑ لیجئے میری عاجزی آپ ﷺ کے سوا کون میرا مددگار ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: **یا رسول اللہ** ﷺ **اسمع قالنا۔ یا حبیب اللہ انظر حالنا**۔ ﷺ۔ اے اللہ کے رسول ﷺ ہماری بات سنو۔ اے اللہ کے حبیب ﷺ ہماری حالت پر نظر فرماؤ۔ امام بوصیریؒ فرماتے ہیں: **یا اکرم الخلق مالی من الوذبہٖ سواک عند حلول الحادث العمم** ۔ اے اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے بڑے سخی ! میں آپ کے سوا کسی کی پناہ لوں، ان عام حادثات اور مصائب میں تیرے سوا میرا کون مددگار ہے؟

میں علماء دیوبند کے استغاثوں کا ذکر نہیں کرتا کہ بات بہت طویل ہوجائے گی۔ گویا تمام علماء سلف و خلف میں کسی کو حضور ﷺ کی حیات و سمع میں اختلاف نہیں ہے۔ ہاں جاہلوں کا مرض لاعلاج ہے۔

دانا کے لیے کافی ہے اک لفظِ نصیحت
ناداں کو کافی نہیں دفتر ، نہ رسالہ

آخر میں مولوی غلام قادر بھیرویؒ کا فتویٰ بھی سن لیجئے جو تقریباً نصف صدی سے قبل کا ہے۔ فرماتے ہیں: **سماع من البعید لاولیاء رضی اللہ عنهم و الانبیاء علیهم السلام لا سیما لسید الرسل علیه و آلہٖ الصلوٰة و فخر الاولیاء قدس سرہٗ یعنی غوث الاعظم رضی اللہ عنه حق ثابت بالقرآن و الحدیث و کلام علماء الراسخین وهی عقیدة اهل السنة والجماعت وماذا بعد الحق الاالضلال و المخالف** ......رقم فقیر غلام قادر بھیروی

اس عقیدہ کی تفصیل بالدلائل المختصرۃ القاہرہ فتویٰ مہریہ گولڑویہ میں موجود ہے۔
(اعجب العجائب)

اسی مسئلہ پر جناب شاہ صاحب کے والد ماجد محمد بخش شاہ صاحب سوکڑیؒ کا مناظرہ بمقام پنڈی گھیپ کے، مولوی غلام خاں بھی موجود تھے، بموجودگی حضرت شیخ الجامعہ مولوی غلام محمد صاحب گھوٹوی اور قبلہ غلام محی الدین شاہ عرف بابو جی صاحبؒ کے سامنے ہوا تھا (اخلاص) جو پنڈی گھیپ کے پاس ایک گاؤں ہے، وہاں کے ایک مولوی صاحب ثالث تھے۔ جو اعتراض کرنے والے تھے، لیکن تھے انصاف پسند مولوی غلام خاں صاحب کے ساتھی۔ یارسول اللہ کو ناجائز کہنے کے ثبوت میں علمِ غیب کی نفی کے دلائل پیش کرتے تھے اور شاہ صاحب مرحوم مطالبہ فرماتے تھے کہ کسی تفسیر یا حدیث یا فقہ کی کتاب میں یہ دکھا دو کہ ''یارسول اللہ ﷺ کہنا ناجائز ہے۔'' (جو آج بھی ہمارا مطالبہ ہے) **و دونه خرط القتاد۔** چنانچہ ثالث صاحب نے بالآخر فیصلہ دیا کہ مولوی غلام خاں کے ساتھی اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے کیونکہ علمِ غیب علیحدہ مسئلہ ہے۔ حاضر و ناظر علیحدہ مسئلہ۔ اور یا رسول اللہ ﷺ، یا، السلام علیک یارسول اللہ ﷺ کہنا علیحدہ مسئلہ ہے۔ چنانچہ قبلہ شاہ صاحب نے چلتے چلتے فرمایا ''مولانا پہلے اپنا نام تو درست فرمالو کیونکہ خان مبالغہ کا صیغہ ہے'' ......

اس دن کے بعد سے مولوی صاحب مذکور نے اپنا نام بدل کر غلام اللہ رکھ لیا۔ اس پر بھی بڑی لے دے ہوئی جو بہت طویل ہے۔ دوسرا سوال شاہ صاحب نے فرمایا: ''**حِلْتِیت**'' کا وزن بتلا دو۔ جب مولوی صاحب نہ بتلا سکے تو قبلہ شیخ الجامعہ جو شاہ صاحب مرحوم کے استاد تھے، نے فرمایا: ''شاہ صاحب اس وزن کا ماخذ مولوی صاحب کو بتلا دو کہیں یہ نہ کہتے پھریں کہ خود شاہ صاحب کو بھی نہیں آتا تھا۔'' آپ نے فرمایا کہ اس وزن کی بحث شرح الشرح مائۃ عامل میں موجود ہے، وہاں مطالعہ فرمالیں۔

القصہ بڑی شان وشوکت سے یہ مناظرہ ختم ہوا اور تعجب ہے کہ انہیں شاہ صاحب مرحوم کے لائق فائق صاحبزادے ہم سے دلیل کا مطالبہ فرما رہے ہیں۔

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم

کہ دل آزردہ شوی ور نہ سخن بسیار است

ناچیز

مفتی محمد حسین شوقؔ

(۱۷ جنوری ۱۹۷۹ء)

ضمیمہ

شرح شفا میں ملا علی قاری لکھتے ہیں: **قَالَ عُمَر ابْنِ دِینَارٍ فِیْ قوْلِہٖ فَاِذَادَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اِے اَھْلِیْکمْ قَالَ اِنْ لَّمْ یَکُنْ فِی الْبَیتِ اَحَد فَقُلْ السلام عَلَی النبی السَّلام وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکاتُہٗ لانَّ رُوحَہُ عَلَیْہ السَّلام حاضِرٍ فِیْ بیت اَھْل الاسْلام۔**[1]

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جب اپنے گھروں میں جایا کرو تو گھر والوں کو سلام کہا کرو۔ عرض کیا اگر گھر میں کوئی آدمی موجود نہ ہو تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تم کہو السلام علی النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روح ہر مومن کے گھر میں موجود ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔ علامہ ابن شہاب خفاجی فرماتے ہیں: **والمنقول انھم کانو یقولون فی تحیۃ اصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ**۔ نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض میں ہے۔ یعنی سب سے منقول ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جناب میں تحفہ پیش کرتے وقت الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہا کرتے تھے[2]۔ زرقانی علی المواہب میں ہے۔ بے شک متعدد طرق سے ثابت ہے کہ صحابہؓ کرام کی ایک جماعت صلوٰۃ کے الفاظ یوں کہتے تھے: **یا رسول اللہ صلی اللہ علیک حجۃ الاسلام**۔[3] امام غزالی التحیات کے بیان میں فرماتے ہیں: **واحضر فی قبلک النبی صلی اللہ**

---

[1]۔ (شرح شفا ملا علی قاری ج 2 ص 118۔ مکتبہ نوریہ رضویہ لاہور)

[2]۔ (نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض۔ ج 3 ص 454)

[3]۔ (زرقانی علی المواہب۔ ج 2 ص 331)

علیه وسلم و شخصه الکریم فقل السلام علیک ایها النبی ورحمة اللّٰه و برکاتهٗ۔

اوراس بات کا یقین کرکہ حضورکو یہ سلام پہنچ رہا ہےاوراس کا جواب وہ اپنی شان کے لائق فرمائیں گے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سلاسل اولیاء میں فرماتے ہیں کہ جوشخص صبح کی نماز کے بعد درودفتحیہ پڑھنے میں مشغول ہوتو وہ ایک ہزار چارسواولیاءاللہ کامل کے جمع شدہ دردوشریف ہیں تو اسے ایک ہزار چارصداولیاء کی ولایت سے نصیب ملے گا۔[1]

اس پر ہمیشگی کرنے سے اس کی برکات وفیوض کا مشاہدہ کرے گا۔ان درودوں میں ''**الصلوٰة والسلام علیک یا رسول اللّٰه الصلوٰة والسلام علیک یا رحمة اللعالمین الصلوٰة والسلام علیک یا سید المرسلین**'' ہے۔کیا حضرت شاہ ولی اللہ شرک کی تعلیم دے رہے ہیں؟ فتح الباری،عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری مواہب لانبہ، زرقانی شرح مواہب، زرقانی شرح موطاامام مالک،سعایہ، فتح العلم اوراوجزالمسالک ان سب کتب میں التحیات کے متعلق یہ عبارت موجود ہے:

فاذ الحبیب فی حرم الحبیب حاضر فاقبلوا علیه قائلین السلام علیک ایها النبی ورحمة اللّٰه وبرکاتهٗ۔ اللہ تعالیٰ کا محبوب اپنے محبوب کی بارگاہ میں حاضر ہے اس لیے حضورؐحبیب پاک سے الصلوٰۃ والسلام کی طرف متوجہ ہوکرعرض کرو:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُ۔[2]

---

[1]۔(سلاسل اولیاء۔ص144)

[2]۔(فتح الباری۔ج2ص250/عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری مواہب لانبہ۔ص320/زرقانی شرح مواہب۔ج5ص229/زرقانی شرح موطاامام مالک۔ج1ص170/سعایہ۔ج3ص327/فتح العلم ۔ج2ص143/ اوجزالمسالک۔ج1ص265)

استفتاء

اگر کوئی شخص میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان کہے تو جائز ہے یا نہیں؟

بعض لوگ منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اذان صرف فرائض کے لیے ہوتی ہے اور کسی کے لیے جائز نہیں۔

جواب

دارالمختار باب الآذان میں ہے کہ دس چیزوں کے لیے فرائض کے علاوہ اذان دینی مستحب ہے۔

۱۔فرض الصلوٰۃ

۲۔ بچے کے کان میں

۳۔کسی جگہ آگ لگ جائے

۴۔ جنگ زور پکڑ جائے

۵۔مسافر کو رخصت کر کے اس کے پیچھے

۶۔والغیلان ان ظہرت (سرکش جن ظاہر ہو جائے)

علامہ شامی میں اسی عبارت کے تحت لکھتے ہیں: **قبل عند انزال میت القبر قیاس علی اول خرجه للدنیا لکن رده ابن حجر فی شرح العباب عند تغول الغیلان اے عندتمرد الجن لخبر صحهٔ فیه اقول لا بعد فیه عندنا اهد لان ماصح فیه الخبر فهم مذهب للمجتهدوان بم لیض علیه لماقدمناه فی**

الخطبة عن الحفظ عبدالبر والعارف الشعرانی من کل من الائمة الاربعة انه قال اذا صح الحدیث فهو مذهبی علی انه من فضائل الاعمال العمل بالحدیث الضعیف کما مر ......[1]

حضرت سیدی والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قیاسا کے لفظ پر یہ عبارت تحریر فرمائی ہے: فقیه لانه لاضرورة اے القیاس لان حدیث لقنوا موتاکم نص فی هذا الامر لانه من باب التلقین۔ میں کہتا ہوں غفر اللہ والسائر المسلمین حدیث شریف میں آیا ہے کہ قبر میں اتارنے اور دفن کے بعد ملائکہ کو کہتا ہے دعونی اصلی مجھے چھوڑ دو۔ میں نماز پڑھ لوں کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کا وقت ہے اور نماز موخر ہو رہی ہے لہٰذا اس وقت آذان کہنا اسے بہترین تلقین اور یاددہانی ہوگی۔

صاحب مراقی الفلاح میں لکھتے ہیں: تلقینه بعد وضعه فی القبر مشروع لحقیقه قوله صلی الله علیه وسلم لقنو ا موتا کم لشهادة ان لااله الا الله اخرجه الجماعته الالبخاری ونسب الی السنتة والجماعته وقیل لا یلقین فی القبر ونسب الی المعزلة قیل لایومرو لاینهی عنه۔ اس کی تائید علامہ طحاویؒ نے مراقی الفلاح کی شرح میں فرمائی ہے۔

لکھتے ہیں: قلت ویمکن الجمع فیلقن عندالاختصار (اے قرب الموت) لصریح قوله صلی الله علیه وآله وسلم فانه لیسَ مسلم یقولها عند الموت الا انجته من النار و عمل بحقیقة موناکم تشبیه لسوال فی القبر لماروی عن سعید بن منصور و سمرة بن حبیب و حکیم ابن عمیر قالو اذا سویٰ علی المیت قبره انصرف الناس کانوا یستحبون ان یقال للمیت عند قبره فلان

---

[1]۔(فتاوی شامی۔ج1ص269)

قل لا اله الا اللّٰہ مرات قل ربی اللّٰہ و دینی الاسلام نبی محمد ﷺ۔ اللھم انی اتوسل الیک حبیبک المصطفیٰ ان ترحم فاقتی باالموت علی الاسلام و الایمان دان تشفع فینا بنبیک علیه افضل الصلوٰۃ والسلام۔[1] گویا حدیث صحیح لقنو اموتاکم کا مصداق حقیقی اموات حقیقۃ ہیں اور تلقین۔ بعد الدفن مسنون ہے اور یہی اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ہے اور اسے ممنوع قرار دینا معتزلہ کا مسلک ہے۔

فاعتبرو ایا اولی الابصار اور صحیح حدیث پر عمل کرنا آئمہ اربعہ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔

---

[1]۔(طحاوی شریف۔ص 328 شرح مراقی الفلاح)

باب سوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نُورُ الْھُدیٰ
لِجَوازِ الْجُمُعَۃِ فِی الْقُریٰ

حضرت مولانا مفتی محمد حسین شوقؔ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں مسئلہ کہ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے احاطہ اقتدار کے اندر کئی ہزار مربع میل کی حدود میں سینکڑوں کی تعداد میں نئے شہر اور نئی بستیاں آباد ہو گئی ہیں۔ ان چکوں میں سرکاری طور پر مساجد تیار کر کے دی گئی ہیں یا قطعہء اراضی عنایت کیا گیا ہے تاکہ اہلِ چک خود اپنی کوشش سے وہاں مسجد تیار کر لیں۔ ائمہ مساجد کے گزارہ کے لیے زمین بھی عنایت کی گئی ہے۔ ہمارے چک میں چار سو، پانچ سو کنبے، خاندان آباد ہیں۔ نہایت عمدہ مسجد ہے۔ ہمارے امام مسجد جو دیو بندی کہلاتے ہیں، خود جا کر قریب کی بستی میں، جس کی آبادی ہمارے چک سے چنداں زائد نہیں، ایک اور ہم مشرب کے پیچھے جمعہ پڑھ لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی بڑا شہر نہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں اور بہانہ یہ کرتے ہیں کہ حنفیوں کے نزدیک بستوں میں جمعہ ناجائز ہے اور دن کو نوافل کی جماعت حرام ہے اور شافعیوں کا مذہب ہے وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا ہمیں اس مسئلہ کی حقیقت سے مدلل حوالہ جات سے مستفید فرمایا جائے۔ رحمکم اللہ تعالیٰ۔

جواب

اصل مسئلہ کی گہرائیوں میں جانے اور حوالہء کتب کی پیچیدہ راہوں سے گزرنے سے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے نہایت ضروری معلوم ہوتے ہیں تاکہ حقیقتِ حال اچھی

طرح سمجھ میں آسکے۔

ا۔ ہمارے حضراتِ حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا متفقہ فقہی اصول ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مطلق ہے اور اسے اطلاق پر رکھتے ہوئے اس پر اگر عمل ممکن ہے تو اس پر خبرِ واحد یا قیاس سے زیادتی کرنا نا جائز ہے۔

اصولِ فقہ:

۲۔ جب حدیث کی دو روایتوں میں تعارض پیدا ہو جائے تو ایسا محل تلاش کر لینا چاہیے جس سے دونوں پر عمل ممکن ہو جائے۔ اگر دونوں پر عمل ناممکن ہو تو پھر ایک روایت کو دلائل کی بنا پر ترجیح دینی چاہیے۔

اصولِ فقہ:

۳۔ مجتہد فیہ مسئلہ میں ایک صورت پر **تَعَامُلْ** قائم ہو جائے یا قاضی و حاکم کا حکم متصل ہو جائے تو وہ صورت مجمع علیہ ہو جاتی ہے۔ (شامی)

۴۔ کسی چیز کا عدم وجوب اس کے عدم جواز کو ہرگز **مُسْتَلْزَمْ** نہیں ہوتا (بالکل بدیہی)۔

مندرجہ بالا مقدمات کو سامنے رکھتے ہوئے اب تفصیلی گزارشات پر ایک نظر ڈالیے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ اس بارے میں صرف فقہاءِ احناف کے اقوال عرض کروں گا۔ قطع نظر اس بات سے کہ کون سے حضرات نے اس کے مخالف رائے دی ہے۔ ایک دفعہ آپ ان گزارشات کو آخر تک ملاحظہ فرمالیں، پھر آپ کی مرضی جو رائے قائم کریں۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالہ با خدا کردیم رفتیم

نمازِ جمعہ کی شرائط دو قسم ہیں۔

اول شرائط وجوب جمعہ، وہ چھ ٦ ہیں، اقامت، صحت، حریت، ذکورۃ، بلوغ، سلامۃ العین والرجل......

دوم شرائط صحت ادائی جمعہ، وہ بھی چھ ٦ ہیں۔ مصر یا فناء مصر سلطان یا اس کا کوئی نائب، نائب درنائب وقتِ خطبہ، جماعت، اذن عام......

پھر علماء اصولیین کے نزدیک مطلق شرط دو قسم ہے۔ ایک وہ جس کے فوت ہو جانے سے مشروط فوت ہو جائے جیسا کہ استطاعت نہ ہونے کی حالت میں حج کا واجب نہ ہونا، صحت نہ ہونے کی صورت میں جمعہ کا لازم نہ رہنا وغیرہ۔ دوم وہ شرائط ہیں جو صرف مصحح لدخول الفاء ہوتے ہیں۔ اگر وہ شرائط موجود ہوں تو مشروط کی ادائیگی مکمل اور اعلیٰ طریق پر ہوتی ہے لیکن ان کے موجود نہ ہونے کی صورت میں مشروط فوت نہیں ہوجاتا جیسا کہ مسافر، بیمار، غلام، عورت، قیدی وغیرہ میں شرائط بالا مفقود ہیں لیکن یہ لوگ اگر نماز جمعہ جماعت کے ساتھ ادا کرلیں تو وقت کے فرض ان کے ذمہ سے ساقط ہوجاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جمعہ کے تمام شرائط خواہ وہ وجوبِ جمعہ کے ہوں یا ادائے جمع کے، سب اسی آخری قبیل سے ہیں ورنہ مندرجہ بالا حضرات کا جمعہ ادا کرنا بالکل لغو اور بے سود ہوتا۔

سوال:

مولوی عبدالحیی صاحب لکھنوی عمدۃ الرعایۃ میں لکھتے ہیں کہ شرائط وجوب اور شرائط ادا میں سے اگر کوئی شرط موجود نہ ہو تو وجوب نہ رہے گا لیکن اگر جمعہ ادا کرے تو جمعہ صحیح ہو جائے گا اور اگر شرائط ادا میں سے کوئی شرط مفقود ہو جائے تو مطلقاً جمعہ کا ادا کرنا صحیح نہ ہوگا بلکہ نمازِ ظہر واجب ہوگی اور تم کہتے ہو کہ دونوں شرائط ایک جیسے ہیں۔

جواب:

کاش آپ آخر تک مولانا کا کلام اس باب میں ملاحظہ فرما لیتے تو یہ الجھن نہ رہتی۔

مولانا آگے مصر کی پہلی تفسیر **اَمِیْر ینفذُ الْاَحکَامِ** کے ماتحت فرماتے ہیں: ...... **قال اسمٰعیل النابلسی فی شرح الدرلیس المراد تنفیذ جمیع الاحکام بالفعل اذا الجمعة اقیمت فی عهد اظلم الناس الحجاج الثقفی بل المراد اقتداره علیٰ ذالک** یعنی احکام بالفعل ضروری نہیں کہ اس کی قدرت پائی جاتی ہو یعنی مسلمان حاکم ہو اور اسے اتنی قوت حاصل ہو کہ وہ جب چاہے احکامِ شرعی جاری کرسکتا ہے تو بھی جمعہ پڑھنا جائز ہوجائے گا۔ گویا یہ شرط بھی شرائط وجوب میں سے معدوم ہوگئی۔ اسی لیے شارح وقایہ نے مصر کی اس تفسیر کو چھوڑ کر دوسری تفسیر **مالا یسع اکبر مساجده اهله** کو پسند کیا ہے یعنی اس کے شہر ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس شہر کی بڑی مسجد میں اگر سب لوگ جمع ہو جائیں تو اس میں نہ سما سکیں۔ انہوں نے فرمایا چونکہ لوگ دینی معاملات میں سستی سے کام لیتے ہیں، خاص کر حدود کے معاملہ میں **لظهور التوانی فی احکام الشرع لاسیما فی الحدود**۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں، اگر شارح پہلی تفسیر کو صحیح سمجھیں تو بہت سے شہروں میں جمعہ پڑھنا صحیح نہ رہے گا بلکہ جہاں حکام کافر ہیں، وہاں کیا کیا جائے گا۔ اسی لیے مولانا نے آگے چل کر سلطان کی شرط کو بالکل اڑا دیا ہے۔ فرماتے ہیں: **هذا یرشدک الی ان اشتراطه انماهو علے سبیل الاولویة** ۔ یعنی بادشاہ اسلام کا ہونا افضلیت کی شرط ہے۔ نہ پائی جائے تو جمعہ کی ادائیگی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فرماتے ہیں: **من افتی بسقوط الجمعة لفقد شرط السلطان فقد ضل واضل**۔ سن لیا آپ نے مولانا کا فتویٰ یعنی جو شخص صرف اس شرط کی عدم موجودگی کی وجہ سے عدم جمعہ کا فتویٰ دے، وہ خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی چیز کا عدم وجوب اس کے عدم جواز کو مستلزم نہیں ہے ورنہ معذورینِ بالا کا جمعہ ادا کرنا بالکل صحیح نہ ہوتا اور یہی بات حق ہے جیسا کہ آئندہ حوالہ جات سے بالکل واضح ہوجائے گا کہ جمعہ کے یہ

شرائط فقہاءِ حنفیہ کے نزدیک وجوب اور اولویتہٗ کے شرائط ہیں۔ان شرائط کی عدم موجودگی میں جمعہ واجب اور لازم نہیں رہتا۔یعنی اگر ان صورتوں میں کوئی شخص جمعہ نہ پڑھے اور صرف وقت کے فرض ہی ادا کرے تو اسے مواخذہ نہ ہوگا اور نہ وہ گناہ گار سمجھا جائے گا۔نہ یہ کہ اگر وہ لوگ کثیر تعداد میں جماعت کے ساتھ جمعہ ادا کریں تو ان کا جمعہ جائز بھی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔ستر عورت صحت ادائی نماز کے لیے شرط ہے لیکن جب کپڑا میسر نہ ہو تو کیا نماز فرض نہیں رہتی؟ تندرست کے لیے قیام فرض ہے لیکن کیا بیمار پر جو قیام پر قادر نہ ہو، نماز معاف ہو جاتی ہے؟...... ہرگز نہیں......

بخاری شریف میں ہے: **اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ قال عطاء اذا کنت فی قریۃ جامعۃ فنودی بالصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فحق علیک ان تشھد ھا سمعت النداء اولم تسمعہ وکان انس رضی اللہ عنہ فی قصر احیاناً لایجمع وھو بالزاوتیہ کانت علیٰ فرسخین۔** ترجمہ: حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ جب تم کسی بڑی بستی میں ہو اور جمعہ کے دن کی اذان ہو جائے تو تم پر لازم ہے کہ تم نماز کی ادائیگی کے لیے حاضر ہو جاؤ خواہ اذان تم نے سنی ہے یا نہ اور حضرت انسؓ اپنے مکان پر جو بصرہ سے چھ میل پر واقع تھا کبھی جمعہ کی نماز ادا کر لیتے اور کبھی نہ بلکہ بصرہ شہر میں جا کر نمازِ جمعہ ادا کر لیتے۔[1]

بخاری شریف میں ہے۔ **عن ابن عباس اول جمعہ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ ﷺ فی مسجد عبدالقیس بجواثی من البحرین وھی قریۃ من قری البحرین......**

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ حواثی میں پڑھا گیا

[1]۔(بخاری شریف۔ج1ص123۔باب جمعہ فی القریٰ والمدن)

ہے جو بحرین کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔[1]

(۳) **وزاد اللیث ابن سعد قال یونس کتب الزریق ابن حکیم الی ابن شھاب و انا معہ یومئذ بوادی القری ھو من اعمال المدینۃ ھل تری ان اجمع وزریق عامل علی ارض یعملھا وفیھا جماعۃ من السودان وغیرھم وزریق یومئذ علی اھلہ فکتب ابن شھاب انا اسمعہ یامرہ ان یجمع ۔**

ترجمہ: لیث ابن سعد نے اتنی بات زیادہ کی ہے کہ یونس کہتے ہیں زریق ابنِ حکیم نے ابنِ شہاب کی طرف لکھا اور میں ان دنوں شہاب کے ساتھ وادی القریٰ میں موجود تھا کہ کیا میں اس بستی میں جمعہ پڑھ سکتا ہوں اور ان دنوں زریق اپنے پہلے کھیت میں حبشیوں کی جماعت کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کررہے تھے، ویسے وہ ان دنوں آیلہ ء کے حاکم مقرر تھے تو ابنِ شہاب نے جواباً لکھا جسے میں سن رہا تھا اور اسے حکم دیا کہ تم وہاں جمعہ پڑھو۔ یہ حضراتِ صحابہؓ اور تابعین کے حالات اور واقعات ہیں اور انہیں صرف اس لیے رد کردینا کہ یہ بخاری نے نقل کیے اور وہ شوافع کے طرف دار ہیں، سراسر ظلم ہے کیونکہ بخاری نے ساتھ ہی یہ حدیث بھی نقل کردی ہے: **عن علی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ** ﷺ **لا جمعۃ و لا تشریق الاّ فی مصر جامع** ۔گو **لا جمعۃ** کا معنیٰ لایجب بھی ہوسکتا ہے۔

لیکن تعارض کی صورت میں **کفیٰ بعلی قدوۃ** کہہ کر ترجیح دے دینے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے قطعی اصول کو نہ چھوڑیں یعنی توفیق اور دونوں کا ایسا محمل تلاش کریں جس سے دونوں پر عمل ہوسکے اور وہ یہی ہے کہ **لا جمعۃ** میں وجوب کی نفی ہو اور حدیثِ جواثی اور حضرت انسؓ اور شہاب کے اقوال سے جواز کا حکم ہو جیسا کہ **یامرہ ان یجمع** سے صاف طور پر واضح ہورہا ہے۔ (٦) بدائع میں لکھتے ہیں: **اما کیفیۃ فرضھا فقد اختلف**

---

[1] ۔(بخاری شریف۔ص122)

فیھا قال ابو حنیفه وابو یوسف رحمھما اللّٰہ تعالیٰ ان فرض الوقت ھو الظھر فی حق المعذور و غیر المعذور لکن غیر المعذور وھو الصحیح المقیم الحرما مور با سقاطه باداء الجمعة حتماً والمعذورمامور باسقاط علی سبیل الرخصة حتی لوادی الجمعة یسقط الظھر وتقع الجمعة فرضا . . .
ترجمہ: جمعہ کی فرضیت کے متعلق ہمارے آئمہ کے اقوال مختلف ہیں۔ شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وقت تو ظہر کا ہے خواہ ادا کرنے والا معذور ہو یا غیر معذور۔ غیر معذور وہ ہے جو تندرست، آزاد اور شہر میں مقیم ہے۔ اس پر واجب ہے کہ جمعہ کی نماز ادا کر کے پیشین کے فرض اپنے ذمہ سے ساقط کرے یعنی معذور جس پر جمعہ واجب نہیں، اگر نمازِ جمعہ ادا کرے تو ظہر کی نماز اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گی اور اس کا جمعہ فرض ادا ہو جائے گا۔[1]

وعن محمد قولان فی قول قال فرض ھو الجمعة له ان لیسقطه بالظھر رخصة و فی قول قال الفرض احدھما غیر معین ولا یتعین ذالک بتعینه فعلا فایھما فعل تبین انه ھو الفرض......ترجمہ: امام محمدؒ کے فرضیتِ جمعہ کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وقت کا فرض جمعہ ہے اور رخصت کی صورت میں اسے ظہر کے ساتھ ساقط کر سکتا ہے۔ اور ایک قول میں ہے کہ غیر متعین طور پر ان دونوں میں سے ایک فرض ہے لہٰذا عملی طور پر جسے ادا کرے گا، ظاہر ہو جائے گا کہ یہی فرض ہے۔ **قال زفر رحمة اللّٰہ تعالیٰ فرض الوقت ھو الجمعه ظھر قاصر**......ترجمہ: امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ فرض وقت تو جمعہ ہے لیکن ظہر کی نماز اس کا بدل ہے۔ یہ مندرجہ بالا اقوال ہمارے احنافِ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے ہیں۔ ایک اختلاف تو نفس فرضیت جمعہ میں فرمایا ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ اس دن فرض دراصل جمعہ کی نماز ہے یا ظہر کی۔ دوسرا اختلاف

---

[1]۔(بدائع۔ج1ص154)

شرائط جمعہ میں ہے **کما سیاتی فی تفسیر المصر** آگے چل کر صاحب بدائع تحریر فرماتے ہیں: **(۵) ان ابا حنیفه و ابا یوسف عملا بالاحادیث بطریق التوفیق لهذا العمل بالحدیثین اولیٰ (۶) من نسخ احدهما... روی عن ابی هریرة انه کتب الی عمر رضی الله عنه** ...... یعنی شیخین رحمہا اللہ تعالیٰ نے دونوں حدیثوں میں توفیق پر عمل فرمایا ہے کیونکہ ایسا محمل تلاش کرنا جس سے دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے، ایک کے منسوخ کہنے سے بہتر ہے۔ **یسئاله عن الجمعة بجواثی فکتب الیه ان اجمع بها حیث ماکنت ولان جواز الصلوٰة مما لا یختص بمکان دون مکان کسائر الصلوٰت ولنا ماروی عن النبی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **لا جمعة ولا تشریق الا فی مصر جامع** ...... صاحب بدائع، شوافع کے استدلال میں ایک روایت نقل فرماتے ہیں کہ حضرت ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ کیا ہم جواثی میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ تم جہاں بھی ہو جمعہ پڑھا کرو کیونکہ دوسری نمازوں کی طرح جمعہ بھی کسی ایک مکان کے ساتھ خاص نہیں ہے اور ہم مقابلہ میں **لا جمعة ولا تشریق** والی روایت پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آیت **فاسعوا الی ذکر الله** کے عموم کو مدنظر رکھتے ہوئے بستی والوں اور اہلِ بدو پر جمعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا استدلال حدیث مذکور کے ساتھ ہے لیکن کیا خیال فرما سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ **لا جمعة** کا معنی نہیں سمجھتے تھے؟ یقیناً سمجھتے تھے اور فرمانِ نبویؐ کے مقابلہ میں ذاتی قیاس کو تو وہ لوگ بالکل ہی ناجائز سمجھتے تھے جیسا کہ دیگر احادیث سے ظاہر ہے۔ جواز کی بنا پر شعارِ اسلام سمجھتے ہوئے حتی المقدور اس کے قیام پر زور دیتے تھے۔ (۷) **باب علی من تجب الجمعة** میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے سامنے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے جب یہ حدیث نقل کی گئی کہ **الجمعة علی من آواه اللیل** تو آپ نے احمد ابن حسن کو

تین دفعہ نہایت غصہ کے ساتھ فرمایا **استغفر بک** گویا ان کے خیال مبارک میں وجوبِ جمعہ کے شرائط میں کوئی حدیث صحیح مروی نہ تھی۔ فرمایا کہ توبہ کرو۔ (۸) آگے لکھتے ہیں: **اماالمصر فقد اختلف الاقاویل فی تحدیدہٖ و عن ابی عبداللّٰہ البلخی انه قال احسن ما قیل فیه اذا کانوا بحال لواجتمعوا فی اکبر مساجدھم لم یسعھم ذلک مصر عند ذکر الامصار المطلقه (بدائع)**۔ مصر کی تعریف میں اختلاف ہے۔ عبداللہ البلخیؒ سے منقول ہے کہ سب سے عمدہ تعریف یہ ہے کہ اگر وہ سب لوگ جن پر جمعہ فرض ہے سب سے بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو اس میں نہ سما سکیں (۹) **وقال صاحب الدر المصر وھو مالا یسعه اکبر مساجدہ اھله المکلفین بھا و علیه اکثر الفقھاء (مجتبی) لظھور التوانی فی الاحکام قال الشامی تحته وقال ابو الشجاع ھذا احسن ماقیل فیه و فی الوالجیته وھو صحیح (بحر) وعلیه مشی فی الوقایة ومن المختار**۔ ترجمہ: صاحب درالمختار نے بھی اسی تعریف کو پسند کیا ہے کہ تمام مکلف حضرات اس بستی کی بڑی مسجد میں نہ سما سکیں تو اسے ہم شہر کہیں گے۔ اکثر فقہاء نے اسی پر فتویٰ دیا ہے کیونکہ لوگوں میں مذہبی احکام کی ادائیگی میں سستی بڑھتی جاتی ہے۔ **وشرحه وقدمه فی متن الدرعلیٰ القول الآخر وظاھرہ ترجیح وایدہ صدر الشریقه بقوله لظھور التوانی فی احکام الشرع سیما فی اقامة الحدود فی الاحضار**۔ علامہ شامی درالمختار کی اس عبارت کی تشریح میں لکھتے ہیں، ابوالشجاع کہتے ہیں یہی تفسیر عمدہ ہے اور ولوالحتہ نے بھی اسے صحیح لکھا ہے (بحر الرایق) اور مصنف موصوف نے وقایہ اور مختار کی متن اور شرح دونوں میں مصر کی یہی تفسیر تحریر کی ہے اور درالمختار میں دوسرے قول سے اسے پہلے ذکر کرنا بھی ترجیح کی علامت ہے اور صدرالشریقہ نے بھی عوام کی سستی اور بے پروائی کا ذکر کر کے اسی بات کی تائید کی ہے

۔(۹) ونقال الشامی عن فتاویٰ الدیناری اِذنبی المسجد فی الرستاق (القریه، قاموس) بامر الامام فهو امر بالجمعة اتفاقاً علی ماقال السرخسی علیہ الرحمۃ۔

علامی شامیؒ نے فتاویٰ دیناری سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی بستی میں حاکم کے حکم سے مسجد بنائی جائے تو وہ بالاتفاق اقامتِ جمعہ کی اجازت سمجھی جاتی ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ کے قول کا بھی یہی منشا ہے۔[۱]

مندرجہ بالا حوالہ جاتِ فقہ حنفی سے صاف واضح ہے کہ ان سرکاری چکوک اور مواضعات میں جہاں حکومت نے مسجد بنانے کے لیے مفت جگہ عنایت کی یا خود مسجد بنا کر دی ہے بلکہ امام مسجد کے گزارہ کے لیے زمین بھی مقرر کی ہے، وہاں تو وجوبِ جمعہ میں قطعاً کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں جب بڑے بڑے اعلام فقہاءِ حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے مصر کی اس تفسیر کو ترجیح دی ہے کہ اس کی بڑی مسجد میں مکلف لوگوں کی گنجائش نہ ہو سکے تو اس تفسیر کی بنا پر اکثر بستیوں کو جہاں چند مساجد موجود ہیں، فقہاء شہر سمجھتے ہیں اور شہر میں جمعہ کا وجوب بالکل متفق علیہ ہے۔

اس ضمن میں علامہ شامی نے ایک اصولِ فقہی بھی ذکر فرمایا ہے مجتہد فیہ مسئلہ میں جب حاکم کا حکم ایک صورت کے ساتھ متصل ہو جائے تو وہی صورت مجمع علیہ ہو جاتی ہے۔ میرے خیالِ ناقص میں ہر جگہ عام مسلمانوں کا تعامل فقہی نقطۂ نظر سے حکمِ حاکم سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو: **عمدة الرعاية اذلا شک فی وجوب الجمعه و صحة ادائها فی بلاد الهند التی غلبت علیها النصاریٰ وجعلوا علیها ولاة کفارا وذلک باتفاق المسلمین و تراضیهم** صفحہ ۱۸۹۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی

---

[۱]۔(فتاوی شامی۔ص560)

اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک صحیح حدیث کی تصریح فرمائی ہے۔فرماتے ہیں: **ویشترط فی الجمعة الجماعة ونوع من التمدن وکان النبی ﷺ و خلفاء رضی اللہ عنهم والائمه: المجتهدون رحمهم اللہ تعالیٰ یجمعون فی البلدان ولا یواخذون اهل البدو ویقام فی عهدهم فی البدو (صحرا) ففهموا من ذلک قرناً بعد قرن و عصرا بعد عصرانه یشترط لها الجماعة والتمدن اقول وذلک لانه لما کان حقیقة الجمعة اشاعة الدین فی البلاد وجب ان ینظر لے التمدن و الجماعة والاصح عندی انه یکفی اقل مایقال فیه (قریه) لماروی من طرق یقوی بعضها بعضها خمسة لا جمعة علیهم وعدمنهم اهل البادیه قال رسول اللہ ﷺ الجمعة علیٰ الخمسین رجلا۔**

ترجمہ: جمعہ میں جماعت اور شہریت اس لیے شرط کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ کے خلفاءؓ اور آئمہ مجتہدین صحرا میں بسنے والے (خانہ بدوش) لوگوں کو عدم ادائیگی جمعہ کی صورت میں ملزم نہیں سمجھتے تھے۔اس لیے عام لوگوں نے قرن ہا قرن سے جمعہ کے لیے یہ شرائط ضروری سمجھ لیں۔میرے خیال میں چونکہ جمعہ کا مقصد دین کی اشاعت ہےاوراس کا بہتر انتظام شہروں میں ہی ہوسکتا ہے، اس لیے شہریت اور جماعت کا ہونا مناسب سمجھا گیا ہےاور میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ شہریت اور جماعت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے جسے آج کل لوگ بستی کہتے ہیں، کافی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف طریقوں سے یہ روایت ثابت ہے کہ جمعہ پچاس آدمیوں پر لازم ہے (الحدیث) اور پانچ آدمیوں پر نہیں جن میں سے بادیہ نشینوں کو بھی شمار کیا گیا ہے۔[1]

اقول الخمسین یتقریٰ بهم قریه و قال ﷺ الجمعة واجبة علی کل

---

[1]۔(حجۃ اللہ البالغہ۔ص70)

قرية و اقل مايقال فيه جماعة لحديث الا نفضاض والظاهر انهم لم يرجعوا فاذا حصل ذلك وجبت الجمعة و من تخلف عنها فهوا الا ثم ولا يشترط الاربعون ۔ میں کہتا ہوں کہ پچاس آدمیوں کا ذکر حدیث شریف میں اس لیے ہے کہ پچاس آدمیوں سے بستی بن جاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بستی پر جمعہ لازم ہے۔ کم ازکم بستی وہی ہوسکتی ہے جہاں جماعت حاصل ہوسکے۔ جیسا کہ حدیث انفضاض سے معلوم ہورہا ہے یعنی جب صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جمعہ میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور واپس بھی نہیں آئے تھے، بارہ آدمی باقی رہ گئے تھے، معلوم ہوا دراصل جماعت کا ہونا ہی شرط ہے ورنہ وہاں جمعہ قائم کرنا واجب ہوگا اور اس لیے پیچھے رہنے والا گناہ گار ہوگا۔ چالیس کی قید بھی درست نہیں ہے...... آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: **ولیس وجود الامام شرطاً**۔ اب فرمایئے! یہ لوگ حنفی نہیں ہیں یا جمعہ جائز قرار دینے کے بعد حنفی کہلانے کے مستحق نہیں رہے؟ حضرت شیخ محقق دہلویؒ نے ''فتح المنان'' میں، مولانا بحر العلوم لکھنوی نے ''ارکانِ اربعہ'' میں، شاہ ولی اللہ صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اور علامہ شامیؒ نے ''درالمختار'' میں اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔

سوال: آیت فَاسۡعَوۡا إِلَىٰ ذِكۡرِ اللَّهِ کا عموم جس سے آپ فائدہ اٹھارہے ہیں، حدیث لاجمعة ولاتشریق سے مخصوص ہوجائے گا اور حدیث جواثی کی بعض لوگوں نے تاویل کی ہے کہ قریہ عربی زبان میں شہر پر بھی بولا جاتا ہے۔

جواب: آیتِ قرآنیہ کے عموم کی تخصیص حدیثِ مضطرب سے ناجائز ہے کیونکہ مصر جامع کی تعریف میں خود فقہاء حنفیہ کے اقوال مختلف ہیں۔ کما مر دوم امام بخاری، ابوداؤد اور جملہ متقدمین اسے قریب لکھ رہے ہیں تو بعض متاخرین کی یہ قیاس آرائی کہ ہوسکتا ہے کہ وہ شہر ہو اور شہر پر بھی قریہ کا اطلاق آتا ہے، سخت ناانصافی ہے۔ قریہ کے اطلاق کے جائز

ہونے سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ جواثی شہر تھا۔ حضرت انسؓ کا خود اپنے زاویہ میں جمعہ پڑھ لینا دلیل ہے کہ مصر جامع سے ان کی مراد قصبہ یا ایسی بستی ہے جہاں جماعت میسر آسکے اور نماز جمعہ کی ادائیگی ممکن ہو جیسا کہ شاہ ولی اللہ کی تصریح سے صاف طور پر واضح ہو چکا ہے کہ وہ صرف ایسی بستی کا ہی وجود ضروری سمجھتے ہیں جہاں مقصد قیامِ جمعہ کا شعور یعنی اشاعتِ دین کا جذبہ اور جماعت کا وجود ممکن ہو۔ ثالثاً متقدمین اور متاخرین کے اقوال میں توفیق بھی ممکن ہے کہ جواثی ابتداء میں بستی تھی، لیکن بعد میں آبادی بڑھتی گئی اور متاخرین کے سامنے وہ شہر بن گیا جس کی یہ ہمارے سامنے کے چکوک ایک زندہ مثال ہیں جہاں کل تک خوفناک جنگل تھے، صرف سات آٹھ سال کے عرصہ میں وہاں آراستہ و پیراستہ شہر جگمگا رہے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ کا ساحلِ بحرین پر رہنے والوں کو یہ فرمانا کہ ہر جگہ جمعہ ادا کرو اور کسی صحابی کا اعتراض نہ کرنا جوازِ جمعہ کی قوی دلیل ہے۔

لقول علیه السلام أصحابي كالنُّجومِ بأيِّهِمُ اقتديتُمُ اهتديتُم

سوال: آیت مذکورۃ الصدور میں آگے وَذَرُوا الْبَيْعَ کا لفظ کھڑا ہے جو اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جمعہ وہاں پر واجب ہوگا جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے اور اس کا امکان صرف شہروں میں ہے، بستیوں میں نہیں۔

جواب: یہ وسوسہ بالکل غلط ہے ورنہ پھر تو زمینداروں اور دیگر پیشہ داروں پر ترک کار لازم نہ ہو بلکہ وَذَرُوا الْبَيْعَ سے مطلق کاروبار مراد ہے۔ زاہدی شرح قدوری میں ہے: **المراد بذكر البيع فى الآية البيع و مامعناه من امور الشاغلة عن الجمعة لكن خص البيع لان ذلك من اعظم مقاصد الناس و منافعهم**...... میں کہتا ہوں قرآن نے اصحاب بیع سب کاروباری آدمیوں کو خاص فرما کر ایک نفسیاتی حقیقت کو آشکار فرمایا ہے کہ اصحابِ بیع سب کاروباری آدمیوں سے زیادہ کسبِ منافع اور کثرتِ طمع لالچ

میں مصروف ہوتے ہیں۔ انہیں ترک کار کا حکم بالکل بے معنی ہوتا۔

وَاللّٰہُ اَعلَمُ بِالصَّواب

(۱۰) علامہ شامی نے مقدسی کے حوالہ سے محیط سے نقل فرمایا ہے کہ جس موضع کے مصر ہونے میں شک واقع ہوا ان لوگوں کو چاہیے کہ فرض جمعہ کی ادائیگی کے بعد احتیاطاً چار رکعت ظہر بھی پڑھ لیں تاکہ اگر جمعہ کی ادائیگی وہاں صحیح نہ ہوئی ہو تو فرض وقت کی ذمہ داری سے یقیناً عہدہ برآ ہو جائیں گے۔[1]

اسی طرح کافی اور قنیہ میں ہے کہ مروٗ کے لوگ ایک شہر میں دو جمعہ پڑھنے کے ساتھ مبتلا ہوئے تو انہیں ان کے آئمہ نے جمعہ کے بعد چار رکعت ظہر پڑھنے کا حکم دیا۔ وجوباً احتیاطاً۔ یعنی یہ ہے تو احتیاط مگر لازم اور اس حکم کو اکثر ہدایۃ کے شراح نے نقل کیا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ظہرتیہ میں ہے۔

کہ اکثر مشائخ بخاری کا خیال بھی یہی ہے کہ تاکہ یقینی طور پر کسی قسم کی ذمہ داری مکلف پر نہ رہے پھر آگے اس نے اس احتیاط کے استحباب اور وجوب پر طویل بحث کی ہے اور کہا ہے کہ مقدسی نے ابن شحنہ کے جد سے نقل کیا ہے کہ اس نے استحباب پر تصریح کی ہے لیکن یہ بھی کہا ہے کہ یہ استحباب محض تو ہم کی حالت میں ہے ورنہ شک وشبہ کی صورت میں احتیاط واجب ہوگی اور محقق ابن ہمام صاحب فتح القدیر سے اس کی تائید نقل ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بستیوں میں جب جمعہ واجب نہ ہو تو نفل یا مستحب ہوگا اور نوافل کی جماعت دن کو ناجائز ہے۔

جواب: اس سے آدائے فرض کا لزوم یا عدم لزوم مراد ہے۔ نفل کس طرح ہو جائے گا، جب ادا کرنے والے فرض کہہ کر نیت باندھتے ہیں۔

۱۔ (فتاوی شامی۔ ص565)

(۱۱) شاہ ولی اللہ صاحب مصفا شرح موطا میں تحریر فرماتے ہیں کہ پس نمازِ جمعہ دو رکعت است در وقت ظہر یا جماعت عظیمہ از مسلمین در قریہ یا در شہر اھک بالجملہ باتفاق امت مسلمہ ایسے ملکوں میں جہاں کفار کی حکومت ہے، لیکن مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہیں یا پہلے وہاں کے حاکم رہ چکے ہیں جیسا کہ ہندوستان اور مشرق وسطیٰ وغیرہ میں صدہا سال سے تمام مسلمان جمعہ ادا کرتے آئے ہیں حالانکہ وہاں شرائطِ جمعہ میں سے دوسری شرط یعنی بادشاہ، یا قاضی کا، یا نائب کا وجود قطعاً ندارد ہے اور وہ ایسی شرط ہے جس کے معنوں میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ خود حضراتِ حنفیہ کے نزدیک افضلیت اور اولویت کے شرائط ہیں۔ جو مولانا بحر العلوم لکھنویؒ نے ارکانِ اربعہ میں فرمایا ہے کہ:

لم اطلع علی دلیل یفید اشتراط امر سلطان

اور مولوی عبدالحیی لکھنویؒ اس شرط کی عدم موجودگی کی صورت میں ادائیگی جمعہ سے منع کرنے والے کو ضال اور مضل فرما رہے ہیں اور صاحب درالمختار نے اَمر بیناء مسجد کو بھی جوازِ جمعہ کی دلیل تسلیم کرلیا ہے۔ کما مرء سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلا جمعہ مسجد قبا میں پڑھایا ہے جو نہ اس وقت شہر تھا نہ آج شہر ہے بلکہ چند مسلمانوں کے گھر تھے اور کچھ یہودیوں کے۔

دوم اس وقت خود مدینہ شریف موجودہ تعریف مصر پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ سوم اسلام کی پہلی جنگ میں مدینہ شریف سے مہاجر اور انصار ملا کر کل تین سو تیرہ تھے جن میں نوخیز لڑکے بھی شامل تھے......اور جمعہ ہمیشہ پڑھایا جاتا رہا......

اللہ تعالیٰ ضد کرنے والے ہٹ دھرم جہال کے شر سے بچائے اور ہدایت کی راہ نصیب فرمائے۔ آمین

تھل کے کئی ہزار مربع میل کے وسیع علاقہ میں حکومت نے ہزاروں چک قائم کیے

ہیں جہاں مسجدیں تعمیر کر کے دی ہیں یا قطعہ اراضی مخصوص کر دیا ہے اور بناءِ مسجد کو اہلِ قریہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور ان مساجد کے اماموں کے گزارہ کے لیے زمین بھی مخصوص کر دی ہے......

لہٰذا ایسے شہروں اور بستیوں میں جہاں جماعت اور تمدن بقول شاہ ولی اللہؒ صاحب حاصل ہے، جمعہ بلا شک وشبہ جائز ہے۔ تمام برادرانِ اسلام کو چاہیے کہ کسی شخص کے گمراہ کرنے میں نہ آئیں اور نمازِ جمعہ جو اہم ارکانِ اسلام میں سے ہے اور تمام مسلمانوں میں دینی رغبت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے......

چند بے سروپا جو فروش گندم نما جو درحقیقت حضراتِ حنفیہ کو بدنام کرنے والے ہوتے ہیں، خواہ مخواہ اتنے بڑے شعارِ اسلام کی رکاوٹ کا سبب بن کر **مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ مُعۡتَدٍ مُّرِیۡبٍ** کا مصداق بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے خوف کھایئے اور ایسے لوگوں کی خودرائی اور تلبیس سے بچیے۔

آپ غور فرمایئے کہ اس ناچیز کو یہ چند سطور جس آدمی کو سمجھانے کے لیے تحریر کرنی پڑی ہیں، وہ خود اپنے آپ کو اثناء عشری کہلاتا ہے اور وہابیوں کے پیچھے دوسری بستی میں نمازِ جمعہ ادا کر لیتا ہے اور حنفیت کا واسطہ دے کر چک والوں کو، جس میں پانچ صد کنبے آباد ہیں، جمعہ جاری کرنے سے منع کرتا ہے۔

ع اے وائے پس امروز بود فردائے

وَمَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ

وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ

باب چہارم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

إيضاح الأدلة
لِجَوَازِ مَا اُهِلَّ

حضرت مولانا مفتی محمد حسین شوقؔ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لَاھَلِہٖ والصّلوٰۃ لاھلھا۔ امابعد

دراصل یہ گفتگو جو حضرت قبلہ والد صاحب رحمۃ اللہ اور حضرت مولانا مولوی احمد خان صاحب (آف کھولہ) بانیء خانقاہ سراجیہ کے درمیان ہوئی، اور اس کے اندر مولانا انورشاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ دیوبند اور مولوی فضل کریم بندیالوی کے درمیان ہوئی، سلکِ تحریر میں لائی گئی ہے۔ جو آیت کریمہ **وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ** کی صحیح تفسیر کی وضاحت کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن فقیر نور حسین صاحب قریشی ساکن ڈنگ برد اللہ مضجعہ کے ہاں مہمان تھا۔ ایک آدمی اتفاقاً آ گیا جو حضرت مولانا احمد خان صاحب کا مرید تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ تو اس نے جواباً کہا کہ میں حضرت میاں نور محمد صاحب گھنجیرا کی خانقاہ پر جا رہا ہوں تا کہ وہاں سے بکرا خرید لاؤں۔ کل آپ کے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ میں نے کہا کہ شیخ معاصر جنہیں مولوی حسین علی قیوم زماں کے لفظ سے پکارتا ہے۔

پہلے تو خانقاہوں کے بکرے نہ کھاتے تھے۔ کیا اب کھانے لگے ہیں؟

اس نے جواباً کہا کہ وہاں ریوڑ میں میرے حضرت کا اپنا بکرا موجود ہے، مجھے اس کے لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اپنے حضرت کو میری طرف سے ’’السلام علیکم‘‘ کہنا۔ میں کل ان شاء اللہ وہاں ایک دو مسئلوں کی تحقیق کی لئے حاضر ہوں گا۔

میری اور حضرت مولانا احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بہت بے تکلفی تھی۔ کیونکہ ان کا بڑا لڑکا محمد معصوم صاحب میرا شاگرد تھا اور واقعی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ منصف

مزاج اور بے نفس ہستی تھے۔آپ کتابوں کے عاشق تھے۔کوئی قیمتی کتاب جہاں بھی ملتی، خرید لیتے تھے۔آپ کے پاس بے نظیر کتب خانہ جمع ہو گیا تھا جس کی مثال پنجاب میں تو ملنی مشکل ہے۔اس لیے اکثر علماء مطالعہ اور تحقیقی مسائل کے لیے وہاں جاتے تھے اور مستفید ہوتے تھے۔

چنانچہ میں دوسرے دن وہاں پہنچ گیا۔آپ نمازِ عصر سے فارغ ہوئے تو میں نے التماس کی کہ غروبِ شمس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کی علامات کیا ہیں؟ چونکہ آپ نماز کیلئے پابندیء اوقات کا خاص خیال رکھتے تھے اور میرے خیال میں مغرب کی نماز کی اذان عام لوگوں سے پہلے کہلواتے تھے۔اس مسئلہ پر تھوڑی بحث ہوئی، میں نے عرض کیا کہ آپ نے سر السماء مولانا عبدالعزیز پرہاروی کی ملاحظہ فرمائی ہے جس میں صاحب موصوف نے مغرب کے وقت کے متعلق لکھا ہے کہ حدیث شریف میں تعجیلِ افطار کا حکم ہے نہ کہ تعجیل افساد کا۔یعنی بعض لوگ اس حدیث شریف کو دلیل بنا کر روزہ قبل از وقت فاسد کر لیتے ہیں۔فرمایا کہ کتب خانہ میں موجود تو ہے لیکن یہ تحقیق میری نظر سے نہیں گزری۔پھر حضرت مولانا نے اس مسئلہ کو چھوڑ کر دوسرے مسئلہ جس کی تحقیق و تفتیش کیلئے میں وہاں گیا تھا، کی طرف توجہ فرمائی۔شاید بطور کشف شیخ معاصرؒ نے معلوم کر لیا تھا کہ میرا مقصد یہی ہے۔ بلا پرسش فرمانے لگے کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ جلسہ میانوالی کے بعد میری دعوت پر تشریف لائے۔(میانوالی میں یہ جلسہ مولوی حسین علی سکنہ واں بھچر ان نے اہلِ سنت والجماعت پر کفر کا فتویٰ لگانے کے لیے بلایا تھا۔لیکن ؏ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ......مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ شیخ الحدیث مدرسہ دیوبند نے سنیوں کو فتوئ کفر سے نہ نوازا جس پر مولوی حسین علی صاحب کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ شیخ الحدیث کو واپسی کے کرائے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

حضرت شیخ معاصرؒ نے فرمایا کہ مولوی فضل کریم بندیالوی نے جو سایہ کی طرح شیخ الحدیث پر مسلط تھے، دریافت کیا کہ جو جانور لوگ خانقاہوں پر آ کر چھوڑتے ہیں یا ذبح کرتے ہیں اور وقتِ ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے، وہ حلال ہیں یا حرام؟ جو الفاظ مجھے یاد ہیں، میں نقل کرتا ہوں۔

شیخ الحدیث نے فرمایا کہ تعظیمِ قبورِ انبیاء عظام و اولیاء کرام ثابت ہے۔ یہ الفاظ آپ کے منہ میں تھے کہ مکبر نے عصر کی نماز کے لیے تکبیر شروع کر دی۔

آخر الامر نماز ختم کر لینے کے بعد مولوی فضل کریم نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ (شیخ معاصرؒ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جن چھوڑے بھوت چھوڑے مولوی فضل کریم کہاں چھوڑے) تو شیخ الحدیث نے فرمایا کہ حلال ہیں، حرام نہیں ہیں۔ پہلے پہل یہ فتویٰ یعنی حرمت منذورۂ اولیاء حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے دیا ہے لیکن ان کے ان فتووں کو آپ کے معاصرین نے بھی تسلیم نہیں کیا اور حضرت شاہ صاحب کے خاندان والوں نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ پھر آپ نے شاہ صاحب موصوف کے فتویٰ پر ایک اعتراض ذکر فرمایا جو عقدۂ لاینحل ہے، فرمایا کہ جس وقت اس جانور پر کسی ولی یا پیغمبر کا نام لیا گیا تو وہ جانور حرام ہو گیا۔ **کلحم الخنزیر**۔ اس کا کھانا ناجائز ہو جاتا ہے۔ اور جب وہی ناذر اپنے اس قول سے تائب ہو جائے اور توبہ کے بعد اسی جانور کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرے تو وہ جانور حلال ہو جاتا ہے۔ (بعینہٖ یہی عقیدہ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی کے مترجم قرآن کریم کے حاشیہ پر مذکور ہے، گویا ان کا مذہب بھی شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے موافق تھا)۔

لیکن تعصب، ہٹ دھرمی اور مولویانہ ضد کو ایک منٹ کے لیے آپ ایک طرف رکھ دیں اور اس بات پر غور کریں کہ آیت محولہ کے یہ معنی نظمِ قرآنی کے بالکل خلاف وہ معجز نظام

نہیں رہے گی۔

کیونکہ آیت شریف **إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰه** یۃ میں چار چیزیں مذکور ہیں اور چاروں کی حرمت یکساں ہے، چاروں ابدی حرام ہیں، چاروں چیزیں عندالجمہور ایک ہر سلک میں منسلک ہیں اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے مذہب پر ایک چیز گاہے حلال ہے اور گاہے حرام ہے۔ یعنی تین پہلی چیزوں کے متعلق اگر آپ ہزار بار عقیدہ بدل لیں تو بھی وہ حلال نہیں ہو سکتیں لیکن آخری چیز قرآن کریم نے وہ ذکر فرمائی ہے جو کبھی حرام ہوتی ہے اور کبھی حلال ہو جاتی ہے۔ تو قرآن کریم نے اس کا ذکر علیحدہ فرمانا تھا۔ یا اس کے متعلق تفصیل معہود کا اشارہ کرنا لازم تھا بصورت موجودہ اس غلط عقیدہ سے نظمِ قرآن باقی نہیں رہتی جو جمہور علماء اسلام کے نزدیک لازم اور اجماعی ہے۔ **فتاملوا حق التامل** احکام القرآن میں علامہ جصاص رازی نے اس آیت کی جو تفسیر فرمائی ہے اس کے مطابق بھی ان چاروں چیزوں کا ایک ہی درجہ ہے یعنی یہ سب ابدی حرام ہیں۔ باقی یہ خیال کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔ اُن سے غلطی نہیں ہو سکتی، یہ سب سے بڑی غلطی ہے۔ مولانا مولوی عبدالحی لکھنوی سُبع عرض شعیرہ میں علامہ برجندی استاذ العلومِ ریاضیہ کے متعلق فرماتے ہیں: **ولقد صدق من قال لکل فارس کبوۃ ولکل سیف نبوۃ۔** یہ اہلِ عرب کا مشہور مقولہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کشمیریؒ نے جو مختصر چار جملے فرمائے ہیں، ہزاروں بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب فیض الباری شرح صحیح بخاری میں بھی یہی لکھا ہے کہ بقرات منذورہ حلال ہیں۔ **ھکذا فی مشکلات القرآن وغیرھم۔** جب شیخ معاصرؒ نے کشمیری صاحبؒ کی تقریر کا پہلا جملہ نقل فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ تفسیر احمدی والے ملا جیون صاحب جو غازی عالمگیر اورنگ زیب کے استاذ

ہیں اور نور الانوار کے مصنف بھی جو یقیناً شاہ عبدالعزیز صاحب سے پہلے ہوئے ہیں، انہوں نے بھی منذورۂ اولیاء کو حلال طیب لکھا ہے جب ان پر بوقت ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے۔ مولانا احمد خاں صاحب نے میرے اس خیال کی تائید فرمائی۔

میں کہتا ہوں کہ حرمت کا فتویٰ شاہ عبدالعزیز صاحب سے پہلے کسی صاحبِ علم نے نہیں دیا۔ میں نے عرض کیا شیخ الحدیث کشمیریؒ کا فرمان کہ اس فتویٰ کو شاہ صاحب کے اہلِ خاندان نے بھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ میں حضرت مولوی عبدالحکیم صاحب مصنف شرح الشرح جو محدث دہلوی کے ہم زماں ہوئے ہیں، انہوں نے تو حضرت شاہ صاحب سے اس مسئلہ میں تحریری مناظرے بھی کیے ہیں لیکن اہلِ خاندان سے کون کون حضرات مراد ہیں۔ آپ نے فرمایا میں آپ کے سامنے صرف شیخ الحدیث کے وہ الفاظ نقل کر رہا ہوں جو میں نے اپنے کانوں سے سنے ہیں۔ یہ تفصیل میں نے بھی اس وقت نہیں پوچھی اور نہ مولوی فضل کریم کو اس کے پوچھنے کی جرات ہوئی ہے کہ اہلِ خاندان سے کون مراد ہیں؟

''شاہ عبدالقادر صاحب یا شاہ رفیع الدین صاحب یا شاہ اسحاق صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ صاحب کے فتاویٰ اور تفسیر عزیزی میں جو یہ مسئلہ منقول ہے، یہ دوسوسات میں سے ہے اور غالباً اس کے مجرم شاہ اسماعیل قتیل ہیں جو حضرت رسالت پناہ صلوٰت اللہ علیہ والسلام کی دربار میں سخت جری اور گستاخ ہیں۔'' یہ الفاظ حضرت شیخ معاصرؒ کے ہیں۔ میں نے انہیں بعینہٖ نقل کر دیا ورنہ میں تو اسے کفر بواح کا مرتکب سمجھتا ہوں اگر اس کا خاتمہ انہی عقائد پر ہے جو اس کی کتب میں تحریر ہیں۔ اعاذنا اللہ منہٗ۔ میرے خیال میں ان حضرات کا یہ حسنِ ظن بالکل غلط ہے کیونکہ مولوی عبدالحکیم صاحب ملتانی اور محدث دہلویؒ کے درمیان جو تحریری مناظرہ ہوا تھا، وہ تحریری طور پر موجود ہے جس کا ترجمہ مولوی خرم علی شارح درالمختار نے لکھا ہے، وہ شاہد عدل ہے۔ سچ ہے **لکل**

فارس کبوۃ ولکل سیف نبوۃ یعنی بڑے سے بڑے شاہ سوار سے بھی لغزش ہو جاتی ہے اور اکثر تلواریں اچک بھی جاتی ہیں۔

اس مسئلہ کی سورش ۱۲۳۳ھ میں بکثرت تھی کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے برادر شاہ زادہ اسمٰعیل دہلوی اور علامہ ابن عابدین شامی اور شیخ النجد ابن عبدالوہاب نجدی بانی عقیدہ فاسدہ ہم زمان ہیں۔ اس اتحادِ زمانی کو علامہ شامی نے بھی ذکر فرمایا ہے اور انور شاہ صاحب نے بھی فیض الباری کتاب العلم میں تسلیم کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ عبدالوہاب نجدی علامہ شامی سے افقہ ہے لیکن حدیث شد الرحال کی تفصیل میں اس کی مذمت بھی کی ہے۔

علامہ شامی نے باب البغاۃ میں جن الفاظ میں ابن عبدالوہاب مذکور کے عقائد کا ذکر فرمایا ہے، وہ ہر اہلِ علم پر واضح ہیں۔ مولوی عبدالحکیم صاحب ملتانی نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ وہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں حلال طیب فرما رہے ہیں۔ اگر انہیں اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ باتفاق الفقہا و منصوصاتِ قرآنِ کریم اور منذورات اولیاء کیوں حرام ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **مَا جَعَلَ ٱللَّهُ مِنۢ بَحِيرَةٍ وَلَا سَآئِبَةٍ ، اِلے عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اور ايضاً فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ** بحسبِ اطلاق وہ سب آٹھ قسمیں جو **غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** تک آیتِ کریمہ میں مذکور ہیں، جو شخص منذورۂ اصنام اور منذورۂ اولیاء میں فرق کرتا ہے، اس سے ہم مواخذہ بالنقل من المتقد مین کر سکتے ہیں۔

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ وَهٰذا مِنْ خرط التقاد۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہی گوسفند نذر کرنے سے پہلے اُن آٹھ چیزوں میں سے تھا اور نذر کرنے کے بعد وہ خنزیر ہو گیا اور توبہ ءناذر کے بعد پھر فوراً حلال ہو گیا یا للعجب

ع انقلابات ہیں زمانے کے

میں نے شیخ معاصرؒ سے دورانِ تقریر دریافت کیا کہ گئوشالہ سے خریدی گئی گائے جو یقیناً منذورۂ اصنام ہوتی ہے، قربانی کے لیے خرید کر ذبح کی جائے تو کیا قربانی جائز ہوگی یا نہ؟ تو آپ نے فرمایا کہ جائز ہے۔

ولَقَدْ صَدق۔

فائدہ عظیمہ۔ نذر کا معنی عبادت نہیں اگرچہ شامی اور ابن تیمیہ بھی کہہ دیں کیونکہ حدیث **لَا تَنْذُرُو** اس کے مخالف ہے۔ لہٰذا یہ قولِ مردود ہوگا بلکہ نذر کا معنی صدقہ، خیرات، نیاز وغیرہ ہوگا۔ عوام کو اس کا صحیح تلفظ سکھانا چاہیے جیسا کہ زبان زدِ عام ہے۔ نذر اللہ نیازِ حسین۔ یعنی یہ چیز اللہ تعالیٰ کی نذر رہے اور اس کا ثواب حضرت امام حسینؓ کی روح پر۔ فتوح کے لیے اور یہی تمام عوام کا مقصودِ دلی ہوتا ہے لیکن جہالت کی وجہ سے وہ اس کا تلفظ صحیح ادا نہیں کرتے، ہر شخص اسے صدقہ خدا کے لیے اور ثواب فلاں شخص کے لیے سمجھتا ہے۔

ویسے اگر موحد کہے کہ یہ ''فقیر کی منت'' ہے تو یہ مجاز بالحذف ہوگا اور مجاز کا انکار علمِ معانی کا انکار ہے۔ آپ نے نہیں پڑھا **انبت الربیع البقل** اگر موحد کہے تو ہرگز کفر نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سبزی پیدا تو اللہ تعالیٰ کرتا ہے لیکن اس کا ظاہری سبب موسم ربیع ہے۔ چونکہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور سبب کا انکار مکابرہ ہے (مجموعہ عثمانی)

اگر کوئی شخص کسی بیمار کی تسلی کے لیے کہہ دے کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفا دے گا تو وہابی تڑپ اٹھتا ہے اور وہ **فاغناهم الله و رسوله** آیت قرآنی کا لحاظ نہیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **تُرْبَةُ أَرْضِنَا، بِرِيقَةِ بَعْضِنَا، يُشْفَى بِهِ سَقِيمُنَا، بِإِذْنِ رَبِّنَا** (الحدیث) یعنی ہماری زمین کی مٹی اور ہم میں سے بعض کی تھوک بیماروں کو شفا عطا

کرتی ہے۔ کہا گیا قرآن شفاء ہے، نافع ضار اللہ تعالیٰ ہے، گل بنفشہ نافع ہے، سم الفاء ضار ہے، بادِ صبا نافع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اور دبور نافع ہے، قوم ہود کے لیے اور ضار ہے عاد کے لیے۔ یہ سب مجازی نسبتیں ہیں۔ ہاں بالذات نافع وضاء اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ باقی یہ سب اسباب ہیں۔ مولوی عبدالعزیز پرہاروی ''ایمانِ کامل'' میں لکھتے ہیں: علمِ نجوم کے قواعد کے ماتحت زہرہ نافع اور مریخ ضار ہے۔ **مطرنابنوءکذا** حدیث حدیبیہ کے متعلق علامہ نووی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان منازل کو بالاستقلال مفید سمجھتا ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں۔

فصلِ دوم

شیخ معاصر رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الحدیث کی تقریر ختم کی تو فرمایا کہ ان الفاظ کے سننے کے بعد میرے تمام شکوک واوہام مندفع ہو گئے مگر چند متزلزل اوہام باقی تھے لیکن علامہ جصاص رازی کی تفسیر دیکھنے کے بعد سب اوہام فنا ہو گئے۔

ملاحظہ ہو:

کان امام الحنیفة فی عصرہٖ وکان علی طریق الکرخی فی الورع والزھد قال صاحب القاموس فی طبقاته الیه انتھت ریاسة الاصحاب قال الخطیب ھو امام اصحاب ابی حنیفة فی وقته وکان مشھور ابالزھد وذکر محمد بن عبدالباقی الزرقانی شارح مواھب لدنیه الامام الحافظ النیشاپوری من الائمة الحنیفة قال ابن عقدة کان من حفاظ سنة خمس عشرة وثلث مائة و جعله بعضھم من اصحاب التخریج الذین لایقدرون علی الاجتھاد اصلالٰکنھم لاحاطتھم بالاصول یقدرون علی تفسیر قول المجمل ذی وجھین وتعقبه بعض الفضلاء بانه ظلم فی حقه و تنزیل عن محله و من تتبع تصانیفه واقوال المنقولة من علم ان الذین عدھم من المجتھدین کالشمس الائمة الحلوائی وغیرہ کلھم عیال علیه فھوا حق ان یجعل من المجتھدین فی المذھب۔

شیخ معاصرؒ کے دل میں اوہام باقی رہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ شاید یہ مسئلہ منذورۃ اولیاء مختلف فیھا بین المذاہب ہو اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے امام اعظمؒ کے قول پر

عمل کیا ہواور شیخ الحدیث امام یوسفؒ کا مذہب لے رہے ہوں لیکن جب تفسیر امام جصاص کو ملاحظہ فرمایا تو اس کو لکھا تھا کہ یہ مسئلہ تمام مسلمانوں میں اجماعی ہے۔ کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تو آپ کے تمام اوہام زائل ہو گئے۔ الحمد للہ علیٰ توفیقہ و تدقیقہ

اور فرمایا کہ چلو آپ کو تفسیر دکھلائیں۔ چنانچہ مسجد سے اٹھ کر کتب خانہ میں آ گئے۔ اپنے ہاتھ سے تفسیر احکام القرآن نکالی اور یہ عبارت پڑھی: **إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ ولا خلاف بين المسلمين ان المراد به الذبيحة اذا اهل به لِغَيْرِ اللّٰهَ عند الذبح فمن الناس يزعم ان المراد بذلك ذبائح عبدة الاوثان الذين كانوا يذبحون لا وثانهم كقوله تعالیٰ وما ذبح على النصب** [1] ...... یعنی آیت کریمہ میں جس کی حرمت کا حکم فرمایا گیا ہے، وہ جانور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لینا ہے جیسا کہ وہ لوگ باسم اللات والعزیٰ کہتے تھے۔ میں کہتا ہوں جب آپ کلام الٰہی میں **عطف الميتة والدم** اور **حصر الا ما اهل به** کی طرف دھیان کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہلال سے مراد وقت الذبح ہے باجماع المسلمین اور مفسر کی تقید عند الذبح باجماع المسلمین کا مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ذبیحہ کو تم پر حرام نہیں فرمایا مگر جس وقت اس پر غیر اللہ کا نام لیا جاوے۔ **عند الذبح لا دائما** گویا یہ قید منصوص القرآن ہے۔ یہ ترجمہ ہے جملہ مستثنیٰ منہ منفی کا جو ہر سہ صورت حلال پر مشتمل ہے۔ یعنی

(۱) ذبح سے پہلے غیر اللہ کا نام لینا۔

(۲) یا ذبح کر لینے کے بعد غیر اللہ کا نام لینا۔

(۳) یا ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا۔ یہ تینوں صورتوں میں جانور حلال ہوگا۔

---

[1]۔ (تفسیر احکام القران۔ جلد 1 ص 125)

بالاجماع۔

سوال:

اثباتِ حرمت ذبیحہ مذکورہ کے لیے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے، منطوق القرآن اور عبارت النص ہے لیکن جو دو قسمیں آپ نے بیان کی ہیں، ایک قبل الذبح اس پر غیر اللہ کا نام پکارنا...... دوم، بعد الذبح غیر اللہ کا نام لینا۔ یہ مفہوم مخالف کے طور پر آیت سے سمجھ آتا ہے اور حنفیہ کے نزدیک مفہوم مخالف نصوص میں غیر معتبر ہے۔ جواب **کلا فلا ور بک** یہ مفہوم مخالف نہیں ہے بلکہ مدلول نص ہے۔ یعنی ترجمہ ہے جملی مستثنٰی منہ منفی کا جس طرح حرمتِ ذبیحہ ترجمہ ہے مستثنٰی مثبت صریح کا جو مقصود بالذات ہے کیونکہ **انما** میں دو جزو ہیں۔ ایک حرمت مثبت، دوم منفی اے عدم حرمت جو عبارت ہے حلت سے اور یہ دونوں جزو **مدلول النص منطوق الحصر** ہیں اور حصر اضافی ہے بانسبتہٖ **الیٰ قوله تعالیٰ ماجعل الله من بَحِیْرة ولا سائبة** ۔ ایک اثبات حرمتِ ذبیحہ بالاجماع جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے، دوم نفی حرمت ذبیحہ جو مدلول صریح لفظ **انما حرم** ہے۔ جو عبارت ہے حلت سے اور کلام مین اثبات ہو یا نفی قید اخیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ **لما تقرر فی مقره اے مطول و قانون شیخ عبدالقاهر تکمله** مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی۔ حواشی قل احمد۔ مرید غوث۔ اسداللہ۔ عبدالرحمٰن۔ غلام محمود۔

لہٰذا **حرمت ذبیحه مثبته مقصوده بلفظ حصر بالاجماع راجع طرف وقت الذبح** ہوگی جو جزاء خیر ہے اور جزو اول حصر جو حرمت منفیہ صریحہ متصلہ بلفظ **انما** ہے۔

اے لاما اهل به قبل الذبح ولا ما اهل به بعد الذبح جو مدلول نص صریح ہے اور یہ منظر اچھی طرح منطق کی اس مثال سے ظاہر ہے۔ **انما ینخسف القمر اذا حالت**

الارض بینه و بین الشمس لادائما۔ اے لا ینخسف القمر قبل زمان الحیلولة ولا بعد الزمان الحیلولة۔

پس مفسر کی کلام کا معنی جو درحقیقت جمہور مفسرین کا مسلک ہے، کیونکہ ان سب نے اخیری جزو کا ذکر کیا ہے، جو مقصودی تھی اور پہلی جزو کا ذکر نہیں کیا جو صراحتہً ظاہر تھی۔ بوجہ **انما** کے ساتھ متصل ہونے کے گویا یہ قضیہ وقتیہ ہوا بالا جماع مرکب از منصوص جزو اول اور جزو دوم جو اجماعی ہے۔ **علی ماھو القانون المشھور** ملاحظہ ہو جلالین۔ **وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ** [1]

سابقہ منطقی مثال میں اس طرح کہنا چاہیے۔

ما اظلم اللّٰہ القمر الا اذا حالت الارض بینه و بین الشمس و ما اظلم اللّٰہ القمر بعد زمان الحیلولة بینه و بین الشمس اے وقت الاینجلاء۔ اس وقت حرف استثناء جزو اخیر پر جو قید ہے، داخل ہوگا۔ **بناء علی هذا التحقیق** جب حرمتِ ذبیحہ مذکورہ بالا جماع محصور ہوئی عند الذبح پر تو باقی تمام صورتیں یعنی نفی حرمت جو صریحاً متصل بلفظ **انما** کی پہلی جزو ہے، قطعاً مندرج حلت ہوگی بالنص اور یہی مذہب حضرت شیخ الحدیث کشمیریؒ کا ہے اور محدث دہلوی اور اس کے متبعین کا قول بحرمتِ ذبیحہ مخالف اجماع ہوگا۔ بلکہ جزو اول کے لحاظ سے مخالف نصِ قرآن ہوگا۔ یہی مقصود مفسر احکام القرآن کا ہے اور اسی وجہ سے اسے شیخ معاصر نے پسند فرمایا ہے۔

اور مولوی عبداللہ صاحب خلیفہ اول مولوی احمد خاں صاحب نے بھی میری طرف خط میں یہی لکھا کہ عام تفاسیر میں یہی معنی درج ہیں۔ جس سے اجماع انفرادی بالاستقراء لازم آتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ فرق کوئی نہیں۔

---

[1]۔ (جلالین۔ ج1 ص64)

جب تمام مفسرین تصریح فرما رہے ہیں کہ **وَمَا اُهِلَّ بِهٖ** سے مراد وقت الذبح ہے تو حرمت محصورہ وقت الذبح پر ہو گی اور باقی تین صورتیں حلت کی ہوں گی۔ **کما حقیقة مرارا سابقا**۔ تو یہ حکم اجماع بالاستقراء ہو گا۔ صاحب احکام القرآن کے نزدیک فرماتے ہیں: **لا خلاف بین المسلمین**۔ "لا" نفی جنس کا ہے۔

تو ثابت ہوا کہ چاروں مذاہب اہلِ سنت اس ذبیحہ کی حلت پر متفق ہوں گے بلکہ اس اجماع میں داؤد ظاہری اور علامہ طبری بھی داخل ہوں گے۔ ترجمہ شیخ سعدیؒ و تفسیر حسینی و تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس، جلالین، خان معالم التنزیل، طبری، امام نظام، تفسیر کبیر، کشاف۔[1]

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

---

[1] (معالم التنزیل ج1 ص119 / طبری ج2 ص48 / امام نظام ج2 ص102 / تفسیر کبیر۔ ج2 ص84 / کشاف۔ ج1 ص244)

باب پنجم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ظَهُوْرُ الشَّفُقَة

فِي فسخ النِّكَاح

عِنْدَ العجز عَنِ النَّفُقَة

حضرت مولانا مفتی محمد حسین شوقؔ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمْ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمْ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمْ

انتساب

اس محبوب ہستی کے نام جس کی جدائی نے ہم سے زندگی کی ساری خوشیاں چھین لیں۔ کسی کے یہ دو شعر ہماری حالت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

ع

ع تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان بہت شرمندہ ہیں

ع

وہ بہاریں جو ترے ساتھ مجھے دیکھ گئیں
کیا کہیں گی اگر آ کے مجھے دیکھا تنہا

(غم زدہ تنہا شوقؔ)

اَمَّا بَعْدُ!

مولوی غلام جیلانی شمس آبادی جو علاقہ چھچھ کے اجل علماء میں سے تھے، آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے انہوں نے ایک رسالہ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے لکھا تھا جو فارسی زبان میں تھا اور عربی عبارات کا ترجمہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے کم سواد اور معمولی اردو پڑھے ہوئے حضرات کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ بندہ نے محسوس کیا کہ اگر اسے عام فہم زبان میں منتقل کر دیا جائے تو سب ضرورت مند حضرات اس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ اور مولف اور ہماری محنت رائیگاں نہ جائے گی۔ اس میں کچھ باتیں اپنی طرف سے اضافہ بھی کردی گئی ہیں جو فائدہ سے خالی نہ ہوں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کیونکہ حدیث پاک میں آیا ہے:

خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاس

اچھا شخص وہ ہے جو لوگوں کا نفع چاہتا ہے۔ حضرت مولانا نے اس میں لکھا ہے کہ ہمارے ملک پنجاب، خراسان، ہندوستان میں اکثر لوگ سفر پر چلے جاتے ہیں اور مدت مدید تک بیویوں اور بچوں کے لیے نان ونفقہ کا کوئی انتظام وانصرام کر کے نہیں جاتے۔ اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اور خود آوارہ گردی یا گداگری میں عمرِ عزیز ضائع کرتے رہتے ہیں۔ بعض ناہنجار اپنے علاقہ میں سکونت رکھتے ہوئے بھی اپنی بیویوں کو خرچہ وغیرہ نہیں دیتے اور طلاق بھی نہیں دیتے۔ بعض ظالم دو دو تین تین شادیاں کر لیتے ہیں۔ بعض کے ساتھ عیش و عشرت کرتے رہتے ہیں اور دوسریوں کو معلق چھوڑ دیتے ہیں اور حکمِ خداوندی کے موافق

فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَة کی صحیح تصویر بنا دیتے ہیں اور وہ عورتیں نہ خاوند والی ہوتی ہیں اور نہ بیوہ بلکہ ایسی صورتوں میں اکثر اپنے میکے یا قریبی رشتہ داروں کے رحم وکرم پر عمریں گزار دیتی ہیں۔

بعض محنت مزدوری کر کے تکلیف اور مصیبت کے دن پورے کرتی رہتی ہیں۔ ہزاروں زنا میں مبتلا ہو کر گناہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ سینکڑوں نصرانی یا ہندو آریہ ہو کر مشرک بن جاتی ہیں۔ مدت سے میرا خیال تھا کہ ایسی مظلوم ومقہور عورتوں کی خلاصی کے لیے مذہب حقہ حنفیہ میں سے کچھ حوالے جمع کر کے اس عذاب سے نجات دلانے کی کوئی سبیل کروں لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ہمارے ابنائے زماں کی اکثریت کچھ ایسی ہٹ دھرم اور کج رو واقع ہوئی ہے کہ اگر کوئی غیر معروف آدمی حق بات لکھے تو اسے تسلیم کرنا ان کی موت کے مترادف ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بداہۃً حق اور قابلِ عمل ہو یا دیگر ائمہ اہلِ سنت کا مسلک ہو تو اسے بوقت لاچاری ومجبوری تسلیم کرنا بالکل کفر سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ موت اور کفر دونوں غیر مرغوب ہیں۔ لیکن بقول "لا لامۃ ولومۃ فی الدین" ایسے لوگوں کی مخالفت اور بدگوئی سے بالکل بے فکر ہو کر کتبِ فقہ سے چند مفید عبارتیں احاطہ تحریر میں لاتا ہوں۔ شرح وقایہ میں تحریر ہے:

اما عند الشافعی فالقاضی یفرق بینهما لعجزه عن الامساک بالمعروف ینوب القاضی منابه فی التفریق بالاحسان واصحابنا لما شاهد والضرورة فی التفریق لان رفع الحاجة الدائمة لا یتیسر بالاستدانة والظاهر انها لاتجد من یقرضها و غنی الزوج فی المال امرمتوهم استحسنوا ان یفرق ان ینصب القاضی الشافعی المذهب یفرق بینهما۔ [1]

---

[1]۔ (شرح وقایہ۔ ج1 ص175)

یعنی ایسی صورتوں میں حضرت امام شافعیؒ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ قاضی اس مرد اور عورت میں تفریق کر دے کیونکہ حکم خداوندی ہے:

فَإِمۡسَاكُۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحُۢ بِإِحۡسَٰنٍ

یا جائز طریقہ سے عورت کو اپنے پاس رکھو یا اسے احسان کر کے چھوڑ دو۔ ہمارے حضراتِ حنفیہ کثرھم اللہ تعالیٰ نے جب تفریق کی ضرورت محسوس کی ہے کیونکہ ہمیشہ کی ضروریات کے لیے کوئی دکاندار ایسی عورت کو قرضہ دینے پر راضی نہ ہوگا جس کے خاوند کے پاس کچھ نہیں۔ اور اس کا اچانک دولت مند بن جانا امر موہوم ہے۔ اس سے آگے سب عبارت بندۂ ناچیز نے تحریر کی ہے۔

واضح ہو کہ حضراتِ حنفیہ کا پہلا حکم یہ تھا کہ قاضی کسی دکاندار کو کہے، ''تم اس عورت کو قرضہ دیتے رہو۔ جب اس کے خاوند کے پاس مال آجائے گا تو وہ تمہیں تمام قرضہ ادا کر دے گا۔''

اس لیے حنفیہ حضرات نے بھی اس بات کو مستحسن سمجھا کہ تفریق بہتر ہے لیکن عام کتبِ فقہ میں یہ بات درج تھی کہ قاضی حنفی اپنے مسلک کے خلاف فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے انہوں نے تجویز کیا کہ قاضی حنفی کسی شافعی المذہب کو اس کام کے لیے نائب مقرر کرے اور وہ تفریق کر دے۔ لیکن یہ بھی مشکل تھا کہ ہمارے ملک میں شافعی یا مالکی قاضی موجود نہیں ہیں۔ اس لیے فقہا حنفیہ نے اسی چیز کو پسند کیا کہ یہ قانون ضرورت ہے۔ لہٰذا خود قاضی حنفی بوقت حاجت و مجبوری دوسرے ائمہ اہلِ سنت کے مسلک کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے جیسا کہ آئندہ آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِيُنفِقۡ ذُو سَعَةٖ مِّن سَعَتِهِۦ

ہر شخص اپنی طاقت و وسعت کے مطابق بیوی بچوں پر خرچ کرے۔

دوسری آیت میں ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

خاوند پر بیویوں کا خرچ اور لباس جائز طریقہ سے لازم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا:

عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وقضى ﷺ فی الرجل لا یجد ماینفق علی امراءته بان یفرق بینهما (رواہ الدارقطنی والبیہقی)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایسے شخص کے متعلق جو اپنی بیوی کو خرچہ نہیں دے سکتا، تفریق کا فیصلہ فرمایا۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ایسے شخص کو فرمایا:

انفق والا فرقت بینک و بینها۔ یا خرچ کرو یا میں تم دونوں میں تفریق کر دوں گا۔

فسخ النكاح عند اعسار الزوج بالنفقة وهو مذهب علی و عمر و ابی هريرة وجماعة من التابعين۔

یعنی صحابہؓ اور تابعین میں سے نامبردہ حضرات کا فیصلہ بھی تفریق کے حق میں تھا اور جو شخص متنعت ہے یعنی طاقت رکھنے کے باوجود خرچ کرنے سے انکار کرتا ہے، اس کی تنگدستی ثابت نہیں، اسے کہا جائے کہ یا خرچ کرو یا طلاق دو، ورنہ ہم خود تمہارا نکاح فسخ کر دیں گے۔ **واما التعنت، الممتنع عن الانفاق فان لم یثبت عسره انفق او طلق والا طلق علیه** (شوق) قاضی صاحب موصوف نے بعینہٖ اسی قسم کی ملتی جلتی عبارتیں استروشنی، جامع الرموز، چلپی، ابوالمکارم، قاضی خان، تمرتاشی، علامہ شامی، بحرالرائق، ذخیرہ، عمادیہ، اشباہ والنظائر، تحفہ، شرح المنہج، قاری الہدایہ، دُرالحکام سے نقل فرمائی ہیں۔

غایۃالقصویٰ میں ہے:

ولو غاب الزوج حال کونه قادرا علی اداء النفقة ولکن لایوفی حقها فاظهر الوجهین انه لافسخ فیها ولکن یبعث الی الحاکم الی حاکم بلده لیطالبه ان کان موضعه معلوما والثانی ثبوت الفسخ والیه مال جمع من اصحابنا و افتوا بذلک للمصلحة وقال فی شرح الحاوی وهو اختیار القاضی الطبری وابن الصباغ وعن الرویانی و ابن اخیه صاحب العدة ان المصلحة والفتوی به۔

یعنی جب خاوند خرچہ کرنے پر قادر ہو اور روپوش ہو جائے، یا انکار کرے تو مدعیہ کے شہر کے حاکم مدعا علیہ کے شہر کے حاکم کی طرف لکھے اور اس سے خرچہ کا مطالبہ کرے۔ اگر اس کی رہائش گاہ معلوم ہو۔ دوسری صورت میں تنسیخ وتفریق کا حکم ہے۔ اور اس کو ہمارے حضراتِ حنفیہ نے پسند فرمایا ہے اور اسے قانونِ ضرورت و مصلحت سمجھ کر اس پر فتویٰ دیا ہے۔

اسی طرح مبسوط میں امام شافعی کا مسلک نقل کیا ہے اور حضرت عمرؓ وعلی کرم اللہ وجہہ سے حدیث نقل کی ہے۔

انهما کتبا الی امراء الاجناد ان مروا من قبلکم ان تبعثوا بنفقة اهلیکم او بطلاقهن۔ [1]

یعنی ہر دو حضرات نے اپنے امراء لشکر کو لکھا کہ جو لوگ آپ کے سامنے ہیں، انہیں حکم دو کہ وہ اپنی بیویوں اور عیال کو خرچہ بھیجیں یا طلاق دے دیں۔ میں کہتا ہوں۔

اسی طرح سے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے جنہیں باتفاقِ امت فاروق ثانی کہا

---

[1]۔(مبسوط۔جلد5 ص19)

جاتا ہے، فرمایا:

انفق او طلق او اطلق یا خرچ کرو یا طلاق دو ورنہ میں بطور نیابت اس ظلم کو دفع کرنے کے لیے انہیں طلاق کا حکم دے دوں گا۔

کما مر انفا

حضرت سعیدؓ ابن المسیب سے دریافت کیا گیا کہ کیا عاجز عن النفقہ اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے۔ فرمایا، ''ہاں''...... پوچھا گیا کہ کیا یہ سنت ہے؟......فرمایا ''ہاں''......اور سنت کے لفظ کو جب مطلق ذکر کیا گیا ہو تو صراحتہً اس سے مراد سنت نبوی علیہ التحیۃ والتسلیم ہی ہوتی ہے۔ بعینہٖ فتح القدیر اور خلاصۃ الفتاویٰ میں منقول ہے۔[1]

کہ جو شخص بھی غائب ہو گیا ہو اور بیوی کے نان و نفقے کا انتظام نہ کر گیا ہو تو حاکم و قاضی حنفی کو چاہیے کہ قاضی شافعی یا حنبلی کو نائب مقرر کر کے یا اس کی طرف مدعیہ کو بھیج کر تفریق کا حکم لگوا دے۔ اگر وہ غائب ہے تو خود فیصلہ نہ کرے۔ اور مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں۔ آپ میری اس بات کو ہرگز نہ بھولیں۔ جو میں مختلف کتبِ فقہ سے نقل کر چکا ہوں کہ حاجت اور ضرورت کی بنا پر قاضی حنفی خود تفریق کر سکتا ہے۔

بزازیہ نے فصول سے نقل کیا ہے کہ اولاً ایسے قاضی کے پاس بھیجے جو ان حالات میں تفریق کو جائز سمجھتا ہے ورنہ خود تفریق کر دے۔ یہ صحیح ہے۔

بخاری، مسلم، دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

ابداء بمن تعول فقیل من اعول یا رسول اللہ ﷺ قال امرءتک ممّن تعول تقول اطعمنی او فارقنی وجارتیک تقول اطعمنی و استعملنی

---

[1]۔ (خلاصۃ الفتاویٰ۔ جلد 2 ص 62)

وولدک یقول الی من تترکتی۔ رواہ البخاری والمسلم والدارقطنی عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ فی الرجل لا یجد ماینفق علی امرءۃ یفرق بینھما۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے مال کو اپنے عیال پر خرچ کرو۔ عرض کیا گیا کہ عیال کون کون لوگ ہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟ فرمایا: تمہاری بیوی جو تمہیں کہے گی۔ یا خرچہ دو یا طلاق دو۔ تمہاری باندی جو تم سے مطالبہ کرے گی۔ مجھ پر خرچ کرو اور پھر مجھے استعمال کرو۔ تمہارا لڑکا کہے گا مجھے کس کے بھروسے پر ترک کرتے ہو اور یہی فیصلہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت فرمایا ہے کہ جو شخص بیوی کو خرچہ نہیں دے سکتا، ان میں تفریق کردو۔

مندرجہ بالا احادیث امام شافعی صاحبؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہیں اور آپ مجتہد ہیں اور مجتہد جس حدیث سے استدلال کرے، **کان تصحیحاً لہ** وہ فرماتے جب خاوند خرچہ نہ دے سکے اور امساک بالمعروف کے حکمِ خداوندی کو پورا نہ کرے تو قاضی اس کا نائب مناب ہو کر تسریح باحسان کا فریضہ پورا کرے۔ **ھکذا فی الاختیار والتحریر۔**

فائدہ:

بعض اوقات بیویاں اور خرچہ کے مدعی حضرات بھی چار سو بیس ہوتے ہیں اور مدعا علیہ کو تنگ اور ذلیل کرنے کے لیے خرچہ وصول ہونے کے بعد بھی جھوٹے دعوے دائر کر دیتے ہیں۔ تو شمس الہدایہ، جو قضا بمذاہبِ اربعہ کے متعلق لکھی گئی ہے، فرماتے ہیں: **یومر الطالب باثبات حقہ و یمین القضاء بعد الثبوت و صفتہ** ۔ یعنی مدعی کو اثباتِ حق کا حکم دیا جائے اور اسے حلف دیا جائے کہ تم کہو کہ میں اس رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، کہ میں نے اپنے حق میں سے کوئی چیز وصول نہیں کی اور نہ اس نے مجھے کسی چیز کا ہبہ کیا ہے نہ میں نے اسے معاف کیا ہے اور نہ اس نے مجھے کسی کے

حوالے کیا ہے کہ تم اس سے اپنا حق وصول کر لینا۔ میں نے اس سے کوئی آدمی ضامن بھی نہیں لیا۔ میرا حق اس پر اس وقت باقی ہے۔اس حلف اٹھانے کے بعد اس کے لیے حکم دیا جائے اور اس قسم کو عذر کے قائم مقام تصور کیا جائے۔ اسی طرح معین الحکام کے اٹھارویں باب میں قضا کے متعلق لکھا ہے۔

ان الشرع لم یعتبر مطلق الظن فی غالب المسائل انما یعتبر ظنونا مفیدة مستفادة من امارة مخصوصة وذلک فیما لاسبیل اِے القطع۔ یعنی شریعت مطلق گمان کو اکثر مسائل میں اعتبار نہیں کرتی بلکہ ایسے گمان جو مخصوص علامات سے واضح ہو رہے ہوں، اور ان کی قطعیت کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو۔

جیسا کہ عورت کا خاوند غائب ہو چکا ہے اور اس کے لیے نان ونفقہ کا کوئی بندوبست کر کے نہیں گیا تو ایسی شہادت کی بنیاد بھی صرف گواہ کا علم ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یقینی اور قطعی ذریعہ کیا ہوسکتا ہے۔ جب حاکم کے پاس اس قسم کے گواہ گزر جائیں اور اس کی بیوی مندرجہ بالا حلف بھی اٹھا دے تو پھر **وجب الحکم بذلک** یعنی پھر خرچہ ڈگری کر لینا یا ناممکن ہونے کی صورت میں تفریق وغیرہ کا فیصلہ ضروری ہو جاتا ہے یعنی نفقہ نہ ملنے کی صورت میں عورت کے ظاہر حال اور قسم پر اعتبار کر لینا جائز ہے۔ (شوقؔ)

فائدہ:

بعض صورتوں میں مدعا علیہ حکام کے سامنے غلط بیانی کرتے ہیں کہ ہم غریب آدمی ہیں۔ ہم غریبوں والا خرچہ دیں گے یا ہمارے پاس خرچہ بالکل نہیں ہے تو ایسے امور میں تجربہ کار اور متقی حاکم صدق وکذب کا فیصلہ علامات پر بھی کر سکتا ہے۔

مبسوط سرخسی میں ہے:

وبعض المتاخرین من مشائخنا یقول بحکم ذلک ان الرجل غنی او

مفلس بتزیه فان کان علیه انما الاغنیاء لم یقبل قوله انه معسر لان الزی واللباس دلیل علی غناه قال اللّٰہ تعالیٰ تعرفهم بسیماهم ولواراد والخروج لاعدوله عدة۔ وقال جل و علا ان کان قمیصة قد من قبل الخ ففی هٰذا دلیل علی ان الظاهر من العلامة۔ [1]

یعنی مدعا علیہ کا یہ کہنا کہ میں مفلوک الحال ہوں، اس کے لباس اور ظاہری حالت سے بھی پتہ چل سکتا ہے جبکہ اس نے قیمتی لباس پہن رکھا ہے تو یہ کہنا کہ میں غریب ہوں، غلط ہوگا۔ قرآن کریم کی مندرجہ سابقہ آیات سے یہ ظاہر ہے کہ شہادت اور دعویٰ کی سچائی میں ظاہری علامات کو بھی ثبوت دعویٰ میں داخل ہوتا ہے۔

فائدہ:

اب ایک اور فقہی اشکال باقی ہے کہ کیا ان صورتوں میں جب مدعا علیہ غائب ہے، کسی دوسرے علاقہ میں چلا گیا ہے یا عمداً حاضر عدالت نہیں ہوتا تو کیا اس کے خلاف بغیر اس کی بات سنے، صرف عورت کے دعویٰ اور گواہوں کے بیانات کے ڈگری دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

کفایہ میں ہے: **کذا لا ینبغی علی القاضی ان ینصب وکیلا عن الغائب ولکن لو فعل ینفذ قضاوہ۔** یعنی گو قاضی پر لازم نہیں ہے کہ وہ غائب کی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کر کے قضا علی المسخر کے طور پر مدعا علیہ غائب کے خلاف فیصلہ کر دے لیکن اگر اس نے ایسا کر دیا ہے تو اس کا فیصلہ نافذ اور درست ہوگا۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ قاضی حنفی کے لیے قضا علی الغائب جائز ہے وعلیہ الفتویٰ اور خلاصہ الفتاویٰ میں ہے:

---

[1]۔ (مبسوط سرخسی۔ ج5 ص193)

القاضی هل یقضی علی الغائب وهل ینصب عنه وکیلا علی الغائب وعنه فعندنا لا وهی معروفة امالو فعل وقضی علی الغائب نفذها بالاجمع ۔[1]

یعنی قاضی حنفی بحالت مجبوری جبکہ مدعا علیہ کا حاضر عدالت کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو اور اس کے خلاف فیصلہ کر دے تو یہ فیصلہ بالا جماع نافذ العمل ہو جائے گا۔ اسی طرح زیادات کے باب الدعاوی کے آخر میں موجود ہے۔ **انه ینفذ**۔ ص ۴۳۸ اور آگے ص ۴۳۹ پر بھی لکھا ہے۔ **نفذ بالاجماع**۔ معین الحکام ص ۶۹ پر لکھا ہے کہ قضا علی الغائب کی صورت میں جبکہ اس کی طرف سے کسی کو وکیل بھی مقرر نہ کیا ہو تو اس حکم میں دو روایتیں ہیں۔ فتاویٰ ظہیر الدین میں ہے اور فتاویٰ صغریٰ میں بھی ہے۔ والفتویٰ علی نفاذہ خواہر زادہ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔

صاحب قنیہ نے لکھا ہے کہ قضا علی الغائب میں یہ شرط نہیں ہے کہ قاضی شافعی ہو۔ قاضی حنفی ہو یا شافعی، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

کذا فی الفتح من باب المفقود ولا یجوز القضا علی الغائب الا اذا رای مصلحة فی الحکم له او علیه فحکم فانه ینفذ لانه مجتهد فیه۔

یعنی چونکہ یہ مسئلہ اجتہاد کے دائرے میں ہے، لہٰذا قاضی حنفی مصلحت اور ضرورت کے وقت اس پر فیصلہ دے سکتا ہے اور وہ بلاشک نافذ ہوگا۔

حدیث شریف میں **لاضرر ولاضرار فی الاسلام** کسی کو نقصان پہنچانا اسلام میں جائز نہیں ہے۔

شامی میں ہے: **الضرر البین یزال ولوقد یما کما افتی به المهنداری و مثله فی حاشیة البحر للخیر الرملی من کتاب القضاء۔**

---

[1]۔ (خلاصہ الفتاویٰ۔ ج 3 ص 199)

میرے خیالِ ناقص میں آج کل جو حکام سمن بھیج بھیج کر اور اخبارات میں اشتہار نکال نکال کر مدعا علیہ کو طلب کرتے ہیں اور پھر بھی مدعا علیہ دیدہ و دانستہ پیش نہیں ہوتا، اور حق و انصاف سے پہلو تہی کرتا ہے، یہ قضا علی الفار ہے، قضا علی الغائب نہیں۔ غائب تو فقہی اصطلاح میں اس کو کہا جاتا ہے جس تک عدالت کی اطلاع اور آواز نہیں پہنچ سکتی۔ اس پر بھی اگر مدعی کا حق تلف ہوتا ہے تو فیصلہ کرنا جائز ہے کما ظہر۔ لیکن یہ لوگ تو اس لیے حاضر نہیں ہوتے کہ شاید ہماری غیر حاضری میں عدالت کوئی فیصلہ نہ کرے یا علماء کے سامنے کچھ گڑ بڑ کرنے کا موقع دیا جائے۔ بھلا جو لوگ بااختیار حاکمِ وقت کے بلانے پر حاضر نہیں ہوتے، وہ علاقہ کے مولوی کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اور معمول ہے۔

یعنی کسی شخص سے خواہ مدعی ہو یا مدعا علیہ، واضح ضرر سے بچانا ضروری ہے، خواہ بات پرانی ہو چکی ہو۔

ضروری نوٹ:

حوالہ جات کے جو صفحے درج کیے گئے ہیں، چونکہ کتب کے مطابق مختلف ہوتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کے درپیش نسخہ میں وہ صفحہ نہ ہو، لیکن اس حوالہ کی صحت میں ہرگز شک نہیں ہوسکتا۔

فائدہ:

چونکہ ان مسائل میں تفریق کے لیے یا خرچہ ڈگری کے لیے یا کسی حق دار کی حق رسی کرنے کے لیے قضا اور حاکم کی ضرورت ہوتی ہے، اور قاضی صاحب الاختیار ناپید ہے، اس لیے قاضی صاحب موصوف نے قضاۃ کے اقسام و نوع کی تشریح لازم سمجھی ہے۔ رقم طراز ہیں۔

اول:

مسلمان بادشاہ کسی شخص کو تمام ملک کے لیے قاضی القضاۃ (وزیرِ قانون) مقرر کرے اور دوسرے قاضی اس کے ماتحت ہوں۔

دوم:

قاضی خاص جسے ایک مخصوص علاقہ کے لیے تحصیل وضلع کی حد تک یا خاص ریاست کے لیے مقرر کیا جائے۔

سوم:

ملک کا حاکم مسلمان نہیں ہے، ہندو یا نصرانی یا یہودی ہے، لیکن اس کی طرف سے ایک مسلمان حاکم مقرر ہے، جیسے مسلم والیانِ ریاست یا انگریزی عملداری کے تحصیلدار، ڈپٹی کمشنر، سول جج وغیرہ کسی مسلمان عالمِ دین کو قاضی یا حَکم برضاء فریقین مقرر کر دیتے ہیں۔صرف ایک فیصلہ میں تصفیہ کے لیے یا علاقہ تمام فیصلہ جات کے لیے وہ بھی قاضی شرعی کا درجہ رکھتا ہے۔جیسا کہ علامہ شامی نے لکھا ہے:

ویختص القضاء بزمان و مکان و خصومة عزاه فی الاشباه۔ [1]

چہارم:

چند مواضع کے مالک، خان یا نواب یا چودھری صاحبان وغیرہ جو مسلمان ہیں، اپنے حیطہء اقتدار میں کسی معتمد علیہ عالمِ دین کو شرعی فیصلوں کے لیے قاضی مقرر کر دیتے ہیں، وہ بھی قاضی شرعی ہیں۔

پنجم:

ایک علاقہ، ایک وطن یا ایک شہر کے لوگوں نے خود اتفاق کر کے ایک آدمی کو امیر تسلیم

---

[1]۔(فتاویٰ شامی۔باب التحکیم جلد 4)

کیا ہے اور وہ والی یا امیر ایک عالمِ دین کو قاضی مقرر کر دے۔

ششم:

جبکہ کسی علاقہ یا شہر میں کوئی والی مسلم موجود نہیں ہے اور اس علاقہ اور شہر میں کوئی عالمِ دین متقی شریعت کی کما حقہ سمجھ بوجھ رکھنے والا موجود ہے جس کی طرف اس علاقہ کے عوام اپنے دینی و دنیاوی مسائل میں رجوع کرتے ہیں تو وہ بھی قاضی شرعی کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر اس علاقہ میں علماء بہت ہیں تو جو زیادہ پرہیز گار اور اَعلم ہے، اسے قاضی مقرر کر دیا جائے۔ اگر ان چیزوں میں برابر ہوں تو بطور قرعہ اندازی ایک عالم کو چن لیا جائے۔

فائدہ:

پہلی پانچ صورتیں تو کتبِ فقہ میں موجود ہیں اس لیے کسی حوالہء فقہی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لیکن یہ چھٹی صورت عام کتبِ فقہ میں نظر نہیں آئی، اس لیے حوالہ تلاش کیا گیا ہے۔ حدیقہ ﷺ ہ مذیہ شرح طریقہء محمد مصنفہ علامہ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ جس کا علامہ شامی بڑی تعظیم سے ذکر کرتے ہیں،

فرماتے ہیں: **نوع ثانی باب ثانی فصل ثانی۔**

اذا خلا الزمان من سلطان ذو کفایته فالامور کلها بکلة لے العلاء ویجب علی الامة الرجوع الیهم ویصیرون ولاة واذا عسر جمعهم علی واحد استقل کل قطر باتباع علماءه فان کثروا فالمتبع اعلمهم فان استووا اقرع بینهم۔

یعنی جب زمانہ سلطان صاحب کفایۃً سے خالی ہو جائے تو ہر علاقہ کے علماء خود بخود والی سمجھے جائیں گے۔ اگر ایک اتفاق کرنا عوام کے لیے مشکل ہو جائے تو ہر علاقہ اپنے اپنے عالم کے تابع ہوگا۔ اگر علماء بہت ہوں تو ان میں سے زیادہ علم رکھنے والے کی پیروی کی

جائے۔اگر برابر کا درجہ رکھتے ہوں تو ان میں قرعہ اندازی کر لی جائے۔

ہفتم:

ثالث بین الفریقین جس کو فقہ حنفی میں حکم شرعی کہا جاتا ہے، جسے بالا تفاق فریقین اپنا ثالث چن لیں، وہ بوجہ رضا فریقین قاضی شرعی کا درجہ رکھتا ہے۔

كما قال الشامی لان الحكم فی حق لمتخاصمين كالقاضی۔ فی حق كافة الناس۔

ہشتم:

وہ علماء جو علاقہ میں اکثر مسائل عوام مرجع خلائق سمجھے جاتے ہیں اور عوام دینی معاملات انہی سے دریافت کرتے ہیں اور شہر میں بھی انہی کی رائے کو وقیع سمجھا جاتا ہے، اگرچہ وہ اصطلاحاً قاضی نہیں کہلا سکتے، لیکن بفحوائے حدیث شریف **العلماء ورثة الانبياء** وہ بھی حاکم یا امیر یا قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔مبسوط امام خواہر زادہ میں ہے (جس کا ایک نسخہ ریاست رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے):

ان لم يكن فی بلاد المسلمين عن العرب و العجم الخلفاء عن السلطان فالروساء والعلماء ايضاً نائبون فی احكام الشرع فعليهم اقامة الجمعة كالقاضی۔

یعنی جب خلیفہء وقت کی طرف سے کوئی قاضی مقرر نہیں ہے تو اس علاقہ کے رئیس اور امیر ہی سلطان کے نائب سمجھے جا سکتے ہیں۔ وہ جس شخص کو اقامۃ جمعہ وعیدین کے لیے مقرر کر دیں، اس پر دونوں چیزوں کے احکام بیان کرنے لازم ہو جائیں گے۔ وہ شارع علیہ السلام کی طرف سے قاضی ہے۔جامع الفوائد میں بھی یہی صورت بیان کی گئی ہے۔

نہم:

غیر مسلم والیانِ ریاست وحکام کی طرف سے اگر کسی عالمِ دین کو قاضی یا حَکم مقرر کر دیا جائے تو اس میں اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحیٔ صاحب لکھنوی نے لکھا ہے......"

گرفتن عہد و قضا از جانب سلطان عادل یا جائر مسلم یا کافر جائز است۔"

درالمختار میں **یجوز تقلد القضا من السلطان العادل و الجائر ولو کان کافرا ذکره مسکین وغیره الا اذا کان یمنعه عن القضاء بالحق فیحرم۔**

یعنی ظالم و کافر بادشاہ کی طرف سے بھی قاضی بننا جائز ہے لیکن اگر وہ اسے حق اور انصاف سے منع کرے تو پھر قاضی بننا حرام ہے۔ فتح القدیر میں محقق ابن ہمام نے لکھا ہے کہ کفار کی طرف مقرر کیا ہوا مسلمان حاکم تو احکامِ شرعی مثلاً جمعہ وعیدین تفریق بصورت عدم نفقہ یا مفقود وغیرہ کے متعلق تو کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہر علاقہ کے لوگ خود کسی عالمِ دین کو قاضی شرعی مقرر کر لیں۔ وہ یہ سب باتیں کر سکتا ہے۔

جامع الفصولین میں ہے:

کل مصر فیه وال مسلم من جهة الکفار یجوز فیه اقامة الجمعة والعیدین وتقلید القضاة و تزویج الایامی لاستیلاء المسلم علیهم۔

اسی طرح معارج الدرایۃ، تاتارخانیہ، درالمختار، ملتقط، مثلاً مسکین وغیرہم نے عوام کے اتفاق سے والی مقرر کر کے قاضی شرعی مقرر کرنے کو ترجیح دی ہے۔

دہم:

کسی شہر کے لوگ متفق ہو کر قاضی شرعی تو مقرر نہیں کر سکتے، لیکن والی مقرر کر سکتے ہیں اور وہ قاضی شرعی مقرر کر سکتا ہے۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

اهل بلدة قلدو القضاء الرجل لایجوزو لو جعلوه سلطانا یجوز لان

فی الثانی ضرورۃ بخلاف الاول۔

لیکن سابقہ عباراتِ فقہ سے ظاہر ہے، وہ مل کر ایک شخص کو قاضی شرعی بھی مقرر کر سکتے ہیں، بوجہ ضرورت لیکن بلا وجہ جائز نہیں۔

یازدہم:

نکاح کے رجسٹرار کو بھی عرفِ عام میں قاضی کہا جاتا ہے۔ یا طلاق نامہ لکھنے والے عرضی نویس وغیرہ، تو یہ لوگ صرف نام کے قاضی ہوتے ہیں۔ انہیں فیصلے وغیرہ کرنے والے قاضی نہیں سمجھنا چاہیے۔ مولانا قاضی غلام جیلانی مرحوم نے گزشتہ مندرجات اور خیالات کو آخر میں مختصراً اردو زبان میں بھی ذکر کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

خلاصۃ المرام ان درپیش مسائل میں جن میں قضا شرط ہے، قاضی حنفی بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے مسلک کے قاضی کو نائب مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دوم:

حکومتِ انگریز کی ابتدا سے آج تک جن افسران کے ذمہ یہ کام لگائے جاتے ہیں، ان میں غیر مسلم بھی ہوتے ہیں اور شرعاً ایسے فیصلوں میں حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ اگر اعتراض کیا جاتا تو اس وقت کی حکومت بھی یہی جواب دیتی تھی کہ یہ ہمارے ہندو ججوں کی توہین ہے۔ آج بھی جن افسران کے ذمہ یہ کام لگائے گئے ہیں، بایدو شاید دین دار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مسائل کے فقہی جزئیات کی تحقیق و تدقیق سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ آج بھی جب اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ایک مفتی کی رہنمائی و امداد کی تجویز حکومت کے سامنے رکھی گئی ہے۔ ان ججوں نے وہی انا کا مسئلہ پھر کھڑا کر دیا ہے کہ یہ ہماری توہین ہے کہ ہم شریعت کے مسائل سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ انگریز کے سارے دورِ حکومت میں ڈپٹی کمشنر اور سیشن جج کے پاس علاقہ کے چند سر برآوردہ اشخاص جرگہ کی شکل

میں رہنمائی اور امداد کے لیے اپنی رائے سے حاکم کو مطلع کرتے تھے اور اکثر فیصلے ان کی مشورت کے ماتحت ہو جاتے تھے۔ آج بھی اگر ایسا کر لیا جائے تو کوئی کفر و گناہ تو نہیں ہے۔

--- تمت بالخیر ---